زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان

کتابی سلسلہ

ثـالـث

جلد-۳ شمارہ -۱۱

اشاعت: جولائی ۲۰۱۷

مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد

مدیر ثالث آفاق صالح

نائب مدیر: اعجاز رحمانی

رابطہ: شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر۔۸۱۱۲۰۱
Mob.+91 9430667003
email.eqbalhasan35@yahoo.com
www.salismagazine.in

● پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر ایڈیٹر ثالث آفاق صالح نے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے چھپوا کر شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر ۸۱۱۲۰۱ سے شائع کیا۔

● 'ثالث' کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

قیمت۔فی شمارہ : .....۱۵۰روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے ۱۷۵/روپے)

سالانہ : .....۵۰۰روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے ۶۰۰/روپئے)

خصوصی تعاون : .....پندرہ ہزار روپئے یا ۳۰۰/امریکی ڈالر

'ثالث' غیر ممالک میں

'ثالث' کی خریداری کی سہولت کے لئے ہم مختلف ممالک میں زرتعاون کی ذیل میں صراحت کر رہے ہیں۔

امریکہ	:	ستر (۷۰) امریکی ڈالر
کناڈا	:	اسی (۸۰) کناڈا ڈالر
آسٹریلیا	:	پچاس (۵۰) امریکی ڈالر
برطانیہ	:	پچاس (۵۰) برطانوی پاؤنڈ
یو۔اے۔ای	:	ایک سو ساٹھ (۱۶۰) یو۔اے۔ای درہم
عمان	:	بیس (۲۰) عمانی ریال
سعودی عرب	:	ایک سو پچاس (۱۵۰) ریال
قطر:	:	دوسو (۲۰۰) ریال
کویت	:	تیس (۳۰) کویتی دینار
پاکستان	:	دو ہزار پانچ سو (۲۵۰۰) پاکستانی روپے

جن ممالک میں Western Union یا منی گرام کی سہولت ہے وہاں سے مدیر اعلیٰ کے پتے پر رقم بھیجی جاسکتی ہے۔

TMCN اور دیگر تفصیلات درج ذیل ای۔میل پتہ پر بھیجی جاسکتی ہیں۔

eqbalhasan35@yahoo.com

سالانہ ممبر شپ کے لئے ہندوستان کے کسی بھی نیشنلائزڈ بینک کے کسی بھی برانچ کے ذریعے درج ذیل اکاؤنٹ میں رقم بھیجی جاسکتی ہے۔

Eqbal Hasan Azad
Allahabad Bank Jamalpur
Account No. : 20962191966
IFSC : AllA0210009

◀◀ ● ▶▶

فہرست

	اداریہ	ادارہ	۵
	حمد	اسلم حبیب	۷
	نعت	ڈاکٹر واحد نظیر	۸
غزلیں	عرفان ستار، افتخار حیدر، جمیل الرحمٰن، شفیع الرحمٰن شفیع، رحمان حفیظ، مصداق اعظمی، ڈاکٹر فریاد آذر، امر مہکی، فردوس گیاوی		۹۔۱۷
نظمیں	ڈاکٹر نگہت نسیم		۱۸
کلاسک	جدید اردو غزل کا مستقبل	فراق گورکھپوری	۱۹
مضامین	''شکست کی آواز'' ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر منظر اعجاز	۲۸
اعتراف	انحراف اور احتجاج کے افسانے	پروفیسر علی احمد فاطمی	۳۸
اعتراف	راشد طرازؔ کا کارِ سخن	ڈاکٹر اقبال واجد	۴۳
اعتراف	نہ بستی ہماری، نہ صحرا ہمارا.....ایک مختصر مطالعہ	حنا فردوس	۵۸
	تشدد کی جمالیات اور احمد رشید کے افسانے	محمد غالب نشتر	۶۱
	''کربِ جاں'' صنفِ مثنوی کی تجدید	سلمان عبدالصمد	۶۵
	اقبال مجید کے افسانے	عمر فرحت	۷۳
	افسانوی ادب کا ایک گمشدہ فنکار بلونت سنگھ	غلام نبی کمار	۷۷
افسانے	ساز زندگی	قیصر نذیر خاور	۸۹
	ان ٹیوشن	سبین علی	۹۴
	وہ ایک لمحہ	شمسہ نجم	۱۰۲
	فصیلِ ذات	اسماء حسن	۱۰۷
	وجود کا سایہ	انجم قدوائی	۱۱۳
	نصیب کی بات	خالد قیوم تنولی	۱۱۸

	فیتا	خاقان ساجد	۱۲۰
	محبت بھی بدلتی ہے.....	عشرت ظہیر	۱۲۷
	بدن میں ڈھلا چاند	جواد حسنین بشر	۱۳۷
	جواز	شاہین کاظمی	۱۴۰
	ایک الجھی ہوئی کہانی	محمد جمیل اختر	۱۴۳
امکانات	قلی گاڑی	ڈاکٹر اویناش امن	۱۴۶
	دوسری موت	حمیرہ فضا	۱۵۱
	مکافات	گل ارباب	۱۵۵
	ماں	قیصر دلاور جدون	۱۶۴
انتخاب	افتادہ اراضی	ڈاکٹر افشاں ملک	۱۶۹
تجزیہ	ڈاکٹر افشاں ملک کا فسانہ.....افتادہ اراضی	نوشابہ خاتون	۱۷۵
ناول کا ایک باب	راج سنگھ لاہوریا	اقبال حسن خان	۱۷۸
تبصرے	پتی پتی خواب کھلے/سید صابر حسن رئیس	اقبال حسن آزاد	۱۹۶
	مجلّہ ''تحقیق''، سرسچ جرنل/منصور خوشتر	اقبال حسن آزاد	۱۹۸
	سہ ماہی تفہیم کتابی سلسلہ ۱۱۔۱۰/عمر فرحت	اقبال حسن آزاد	۲۰۰
	بہار میں اردو صحافت سمت و رفتار/منصور خوشتر	اقبال حسن آزاد	۲۰۱
	شہنشاہ کونین کے دربار میں/محمد ولی رحمانی	فضلِ رحمٰن رحمانی	۲۰۳
	آبشارِ نور/شفیع الرحمٰن شفیع	ڈاکٹر مسعود عالم	۲۰۷
ثالث پر تبصرے	سلمان عبدالصمد، رحمان حفیظ، منظوم تبصرہ شفیع الرحمٰن شفیع		۲۰۹۔۲۱۳
مکتوبات	پروفیسر حسین الحق، محمد عبدالمالک، عبدالصمد، غضنفر، محمد حامد سراج، ممتاز رفیق، وصیہ عرفانہ، مصداق اعظمی، شرجیل احمد خان، عشرت ظہیر		۲۱۴۔۲۲۴

◂◂ ● ▸▸

اداریہ

ثالث کا تازہ شمارہ حاضر خدمت ہے۔اس شمارے سے ہم ایک نیا سلسلہ ''کلاسک'' کے عنوان سے شروع کر رہے ہیں۔رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری اردو ادب میں ایک لیجینڈ کی حیثیت رکھتے ہیں۔وہ جتنے اچھے شاعر تھے اتنے ہی عمدہ تنقید نگار بھی تھے۔ان کا ایک معرکتہ الآرا مضمون ''جدید اردو غزل کا مستقبل'' شامل اشاعت ہے۔اردو غزل کے تعلق سے یہ ایک اہم مضمون ہے۔ہمارے نئے لکھنے والے اس کی روشنی میں بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔اس مضمون کی فراہمی کے لئے ادارہ ڈاکٹر ارشد رضا (مدیر، اندیشہ، بھاگلپور) کا شکر گزار ہے۔دیگر شعری ونثری تخلیقات بھی خوب چھان پھٹک کر شامل کئے گئے ہیں۔

ہم نے ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہے اور ''امکانات'' کے عنوان سے ایک مستقل کالم بنا رکھا ہے۔اس شمارے میں چار بالکل نئے لیکن عمدہ افسانہ نگاروں کی تخلیقات شامل ہیں۔علاوہ ازیں کئی اُبھرتے ہوئے نقاد بھی ثالث میں لگاتار شایع کئے جا رہے ہیں۔ہمیں امید ہے کہ آئندہ یہ قلم کار اردو ادب کا سرمایہ ثابت ہوں گے۔

خطوط نگاری کی ابتدا روم میں ہوئی۔ممکن ہے قدیم تہذیب کے دوسرے مراکز میں بھی اس نے فروغ پایا ہو لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔یونان میں خطوط نگاری نہ عوام میں فروغ پا سکی نہ خواص میں۔اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ وہاں کی شہری زندگی سیاسی اور جغرافیائی حالات کی بنا پر جزیروں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ہر ریاست ایک الگ دنیا تھی۔معاشرت محدود تھی۔بتکدوں میں، ورزش کے میدانوں میں، دوستوں کی محفلوں میں لوگ ایک دوسرے سے مل سکتے تھے اور اپنے دل کی باتیں دوسروں کو بالمشافہ سنا سکتے تھے۔اپنے جزیروں کے علاوہ دوسروں کا عدم وجود ان کے لیے برابر تھا۔بہر حال اس روایت کی نشو نما کے لیے شرط ہے وسیع معاشرت، باقاعدہ حکومت، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جاننے کے مواقع، علمی زندگی سے واقفیت اور ایک ایسی زبان جو بولی اور سمجھی جاتی ہو اور جس میں ادبی صلاحتیں ہوں۔یہ شرائط پہلی بار رومی معاشرے میں پوری ہوئیں۔

سسرو کے مکاتیب میں زندگی کی جھلکیاں اور معاشرت کی پرچھائیاں دیکھنے کو ملتی ہیں مگر ان میں خطوط کی فطری سادگی نہیں ملتی۔رومیوں کے خطوط کی زبان خطابت اور روزمرہ کی بول چال کے درمیان کی زبان ہے۔اس دور میں فن خطابت کے اصول اور بلاغت کے قواعد تربیت کی پہلی شرط تھی۔زندگی بندھے ٹکے اصولوں کی پابند تھی۔اس لیے خطوط نگاری کے فن کو بھی اس لہجے پر مرتب کیا گیا۔خطوط کی مختلف قسمیں تھیں۔مبارک باد کے خطوط، تہنیتی خطوط، تعزیت کے خطوط اور وہ خط جن میں کسی پر ملامت کی جائے یا کسی کو تشفی دی

جائے۔ان کے علاوہ سرکاری رقعات تھے اور ان سب کے جدا جدا آداب والقاب اور مضامین تھے۔القاب و آداب کے بعد اصل موضوع پر قلم اُٹھایا جاتا تھا جس میں بلاغت کی ساری خوبیاں سمو دی جاتی تھیں۔

خطوط نگاری چونکہ ادب کی سب سے آسان صنف ہے اس لیے خوب پڑوان چڑھی لیکن ایک اچھا خط لکھنے کے لیے چند شرائط کا ہونا بہت ضروری ہے۔پروفیسر خورشید الاسلام کہتے ہیں:

> ''خط لکھنا ایک فن ہے۔اچھی زندگی بسر کرنا بھی ایک فن ہے لیکن ان میں کمال حاصل کرنے کے لیے کسی فن کی ضرورت نہیں۔فنون لطیفہ میں کمال حاصل کرنے کے لیے کچھ اصول ہیں۔کچھ ضابطے ہیں۔لیکن محبت کرنے کے لیے نہ علم کا سینہ درکار ہے نہ علم کا سفینہ۔اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ خط لکھنے کے لیے صرف قلم اور کاغذ کی ضرورت ہے تو نہ خط لکھنے پر حرف آتا ہے اور نہ خط لکھنے والے پر۔''
>
> (تنقیدیں۔خورشید الاسلام)

زیادہ تر اردو رسائل میں مکتوبات کا ایک گوشہ ہوتا ہے جس میں مکتوبات نگار گزشتہ رسالے پر اپنی رائے دیتے ہیں۔بعض خطوط صرف رسیدی ٹکٹ کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن چند ایسے خطوط بھی ہوتے ہیں جن میں علمی وادبی گفتگو ہوتی ہے اور مکالمے کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔اس شمارے میں مشہور ومعروف ادیب پروفیسر حسین الحق کا ایک ایسا ہی خط شامل کیا جا رہا ہے جس سے ذہن ودل کے دریچے وا ہوتے ہیں اور ہمارے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ہماری یہ خواہش ہے کہ ثالث کے قارئین اسی قسم کے سیر حاصل خطوط سے ہمیں نوازیں۔

آج کل یہ خیال ہمارے ذہنوں میں جڑ پکڑتا جا رہا ہے کہ سوشل میڈیا کے پھیلاؤ کے باعث کتب ورسائل پڑھنے کا رجحان کم ہوتا جا رہا ہے لیکن ''ثالث، فکشن نمبر'' کی بے پناہ مقبولیت نے اس مفروضے کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ہم ان تمام باذوق قارئین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے اس نمبر کی دل کھول کر پذیرائی کی اور ہمارے حوصلے کو مہمیز کیا۔

اس رسالے کی ویب سائٹ کو تا دم تحریر اکتالیس ہزار سات سو گیارہ (۴۱۷۱۱) سے زیادہ بار وزٹ کیا جا چکا ہے۔آپ بھی درج ذیل لنک پر جا کر اس کے گذشتہ شمارے بالکل مفت پڑھ سکتے ہیں:

www.salismagazine.in

www.facebook.com/salismag

یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں آپ کی گرانقدر رائے کا انتظار رہے گا۔(ادارہ)

◂◂ ● ▸▸

● اسلم حبیب

حمد باری تعالیٰ

قریب آ مرے خدا، میرے خدا قریب آ
یگوں یگوں سے دے رہا ہوں میں تجھے یہی صدا

قریب اس قدر کہ میں نظر نظر میں جھوم لوں
ترے حسین نور کی کرن کرن کو چوم لوں

قریب اس قدر کہ میری دھڑکنوں میں تو رہے
قریب اس قدر لہو کی لرزشوں میں تو رہے

قریب اس قدر تجھے میں سانس سانس جی سکوں
میں تیری قربتوں کا نشہ بوند بوند پی سکوں

قریب اس قدر کہ میری روح کو سکوں ملے
نیاز عشق ہی رہے نہ ناز حسن ہی رہے

قریب اس قدر کہ میں نہ پھر کہوں قریب آ
جو فاصلے ہیں درمیاں تو خود کہے کہ بھول جا

◂◂ ● ▸▸

Habib Nursing Home
Maler Kotla-148023
Mob:9915174579

● ڈاکٹر واحد نظیر

نعت

توحید، عشقِ سیدِ ابرار کے بغیر؟
جھت کا گماں بھی جہل ہے دیوار کے بغیر

ہوش وخرد پہ اپنا بھروسہ فضول تھا
منزل ملی نہ مستیء کردار کے بغیر

پیشِ نظر ہو آیتِ لاترفعوا مدام
گویا نہ ہو سلیقۂ اظہار کے بغیر

چہرے پہ صبح وشام کے ہوتی نہ تازگی
آقا کے عکسِ گیسو و رخسار کے بغیر

آباد اس زمیں پہ رہے کس طرح کوئی
دربار صدقۂ درِ دربار کے بغیر

سورج ہر ایک شام کو دیتا ہے حاضری
بے نور ہے وہ منبعِ انوار کے بغیر

واحد نظیرؔ مشقِ سخن ،شعروشاعری
کارِ عبث ہے مدحتِ سرکار کے بغیر

◂◂ ● ▸▸

APDUMT,
Noam Chomsky Complex
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025
Mob. 9990386833

عرفان ستار

بے رونقی سے کوچہ و بازار بھر گئے
آوارگانِ شہر کہاں جا کے مر گئے

آشوبِ آگہی میں گماں کی بساط کیا
وہ آندھیاں چلیں کہ یقیں تک بکھر گئے

میں خود ہی بدنُما تھا کہ مٹی میں کھوٹ تھا
کِھل ہی نہیں سکا، مرے موسم گذر گئے

اب آئے جب میں حال سے بے حال ہو چکا
سب چاک میرے سِل گئے، سب زخم بھر گئے

جشنِ بہارِ نو کا ہُوا اہتمام جب
ہم ایسے چند لوگ بہ مژگانِ تر گئے

دل سا مکان چھوڑ کے دنیا کی سمت ہم
اچھا تو تھا یہی کہ نہ جاتے، مگر گئے

تنہا ہی کر گئی یہ بدلتی ہوئی سرشت
سب دل میں رہنے والے ہی دل سے اتر گئے

اب کچھ نہیں کریں گے خلافِ مزاج ہم
اکثر یہ خود سے وعدہ کیا، پھر مُکر گئے

اچھے دنوں کے میرے رفیقانِ خوش دلی
اس بے دلی کے دور میں جانے کدھر گئے

اس عہدِ بدلحاظ میں ہم سے گداز قلب
زندہ ہی رہ گئے تو بڑا کام کر گئے

عرفانؔ اب سناؤ گے جا کر کسے غزل
وہ صاحبانِ ذوق، وہ اہلِ نظر گئے

◂◂ ● ▸▸

1114- Jack Monkman Cres.
Markham, Ontario, L3S 4T5,
Canada

افتخار حیدر

اس واسطے لوگوں کو سنائی نہیں دیتے
ہم آہ تو بھرتے ہیں دہائی نہیں دیتے

کچھ درد ہیں ایسے کہ جو چہرے سے عیاں ہیں
کچھ زخم ہیں ایسے جو دکھائی نہیں دیتے

وہ راستے جچتے ہی نہیں اہلِ دِلاں کو
وہ راستے جو آبلہ پائی نہیں دیتے

یادوں کی ہے اک بزم سجی خانۂ دل میں
اس بزم میں غیروں کو رسائی نہیں دیتے

ہم لوگ تعلق میں بہت صاف ہیں لیکن
ہم لوگ تعلق کی صفائی نہیں دیتے

◂◂ ● ▸▸

بہرِ ترسیلِ ہوا رہنے دو
اک دریچہ تو کھلا رہنے دو
اس سے آتی ہے سخن میں تیزی
دل میں کہرام مچا رہنے دو
کوئی شکوہ ، نہ شکایت ، نہ گلہ
میرے ہونٹوں پہ دعا رہنے دو
چھوڑو اب رات گئی ، بات گئی
ذکرِ انجامِ وفا رہنے دو
میں نے سو بار کہا ، ملتے ہیں
اس نے ہر بار کہا ، رہنے دو
کردیا بزم سے بے دخل اگر
راستے میں تو پڑا رہنے دو
ذائقہ ہجر کا بتلاوں تمھیں
تلخ ہوتا ہے بڑا رہنے دو

◂◂ ● ▸▸

A-157 Abbas Town, Abul Hasan
Asfahani Road, Gulshan -e-Iqbal
Karachi, Pakistan

جمیل الرحمن

میں راہ بدلوں تو وہ منزلیں بدلتی ہے
یہ کس نگر کی ہوا میرے ساتھ چلتی ہے

کسی سفینے سے ہر شام شور اٹھتا ہے
کسی جزیرے پہ ہر رات آگ جلتی ہے

دہکتی برف پہ کیوں دھوپ اوڑھ لیتی ہے
وہ آ کے جب مری آغوش میں مچلتی ہے

نہیں رہا کوئی موسم بھی اب تو پہلا سا
اداس ہو کے ہر اک شاخ ہاتھ ملتی ہے

میں کیا کروں کہ میں جس رہگزر میں بھی اتروں
وہ رہگزر ترے کوچے میں جا نکلتی ہے

یہاں زمین کو انساں اماں نہیں دیتے
مہ و نجوم وہاں اک بلا نگلتی ہے

جمیلؔ ہو بہو اس کو تراش لوں لیکن
مجسموں میں کہیں زندگی بھی ڈھلتی ہے

◀◀ ● ▶▶

نیلگوں ساحل سے آگے اک ستارہ لے گیا
بے نشاں منزل کی جانب استعارہ لے گیا

رہ گئی بچپن کی آنکھوں میں کسی دکھ کی لکیر
رنگ اپنے ساتھ اک اُڑتا غبارہ لے گیا

دیر تک مژگانِ غم پر وہ گُلِ آبی کھلے
جذب کر کے جن کی خوشبو ابر پارہ لے گیا

تھے اُسی سے تو ہماری گرمئ جاں کے ہنر
چھین کر ہم سے عبث تو وہ شرارہ لے گیا

عمر بھر رکھا مسافت میں تحیر نے ہمیں
اور عدم کی سمت بھی شوقِ نظارہ لے گیا

اپنی تنہائی سمیٹی پھر سوادِ شہر سے
رات ہوتے ہی اُسے میں گھر دوبارہ لے گیا

کٹ گیا رستہ اسی دریا سے باتوں میں جمیلؔ
تھام کر انگلی مجھے جس کا کنارہ لے گیا

◀◀ ● ▶▶

67- Northcola Road Croydon
CRO 2HY Surrey UK
0044 7404366525

محمد شفیع الرحمن شفیعؔ

نظر اپنی تلاشِ حسن میں کب سے بھٹکتی ہے
لپکتی ہے ، جھجک جاتی ، جھپکتی ہے ، ٹپکتی ہے
نہ جانے کون سی بجلی بہر جانب چمکتی ہے
کہ جس کے خوف سے شاخِ شجر پیہم لچکتی ہے
کسی دن موت آنی ہے، بدن سے جان جانی ہے
زباں حق گو نہیں، کیوں قہرِ باطل سے دبکتی ہے؟
جلا کر خاک کر دے گی کسی دن پوری بستی کو
لہکتی آگ چاروں سمت سے ، دیکھو، لپکتی ہے
قدم جب ڈگمگائے تو یہ دنیا دیکھتی ، ہنستی
خبر کس کو ہے، کس جانب نظر کس کی بہکتی ہے
خدائی ہر طرف ، ہر چیز میں ، انساں مگر غافل
سویرے کس قدر تسبیح میں چڑیا چہکتی ہے!
کہاں گلشن، کہاں گل ہے، مشامِ جاں میں سرشاری
شعورِ حس میں خوش بو آج تک کس کی مہکتی ہے
نظامِ پیکرِ انساں عجب منظر کشی کرتا
کسی کی یاد بن کر چاندنی رخ پر دمکتی ہے
شفیعؔ اس تن کی زینت سے نہیں ملتا سکوں، دیکھا
توجہ روح پر اب ، جو تڑپتی ہے، سسکتی ہے

◀◀ ● ▶▶

حسن کو ماہتاب لکھتے ہیں
دل کی خاطر کتاب لکھتے ہیں
زندگی تو سمجھ میں آ نہ سکی
پھر بھی روز ایک باب لکھتے ہیں
جب قلم اپنی انگلیوں میں ہو
جو بھی دکھتا، صواب لکھتے ہیں
بیچ کر لوگ بیشتر خامہ
ہر حقیقت کو خواب لکھتے ہیں
غاصب و خائن و ستم گر کو
لوگ عزت مآب لکھتے ہیں
اپنے ہاتھوں سے اپنی قسمت میں
بے تحاشا عذاب لکھتے ہیں
ہم تقاضائے وقت کیا جانیں
صرف اٹکل جواب لکھتے ہیں
روشنی خود نظر کی ناکافی
ہم دھوئیں کو سحاب لکھتے ہیں
دونوں دوشوں پہ دو دبیر شفیعؔ
خیر و شر کے حساب لکھتے ہیں

◀◀ ● ▶▶

Chand Manzil, Nawab Bahadur
Road Patna City 800008
Mob: +91 9304856774

رحمان حفیظ

ڈرتا رہتا ہوں اُگل دوں نہ کسی لمحے میں
جان بیٹھا ہوں کئی بھید جو انجانے میں

سرِ بازارِ طلب قہقہے تو گونجیں گے
بِک گئے کتنے خریدار بھی اس میلے میں!

ایسے تقسیم ہُوا ترکۂ اجداد کہ بس!
آسکی فقر کی دولت نہ مِرے حصّے میں

ڈُوب جاؤں نہ کسی صبح ستاروں کی طرح
نُور بھرتے ہوئے آفاق کے اس خاکے میں

شانت ہو جاؤں اسے جی کے ہمیشہ کے لئے
آن بیٹھے جو مِری عمر اسی لمحے میں

میں قسم دے نہیں سکتا ہوں زباں بندی کی
آدمی بول بھی پڑتا ہے کبھی سوتے میں

جب بھی ٹُوٹے کوئی تارا سرِ افلاک حفیظؔ
چیخ اُٹھتا ہوں سیہ رات کے سنّاٹے میں

◂◂ ● ▸▸

خشک، بے اُمید آنکھوں کو بھی نم اس نے کیا
ہاتھ اٹھائے میں نے بھی لیکن کرم اس نے کیا

اضطراب وخواب وخواہش کے مقدّر جاگ اٹھے
میری مٹّی میں ملا کر سب کو نم اس نے کیا

یاد کی ہرنی نکلتی ہی نہ تھی اس باغ سے
ایک مدّت تک مِری سوچوں میں رَم اس نے کیا

زندگی کے گیت گانا صاحبو! آساں نہیں
یہ تو مجھ کو آشنائے زیر و بم اس نے کیا

اس پہ یوں وا کر دیئے اک اور ہی دنیا کے در
خُشک ہوتا شاخچہ جونہی قلم اس نے کیا

درد انگیزی کب اس کی ذات پر موقوف تھی!
میری پلکوں کو بھی آخر کارنم اس نے کیا

اک خوشی وہ بانٹ بھی سکتا تھا کس کس میں حفیظؔ
یہ بھی کیا کم ہے کہ تیرے غم کو غم اس نے کیا!

◂◂ ● ▸▸

C/o Masood Hashmi
Paskistan Academy of Letters
Sector H-8/1 Islamabad Pakistan

مصداق اعظمی

یہی اب سوچتا ہوں در بدر والوں کا کیا ہوگا
مجھے کچھ ہو گیا تو میرے گھر والوں کا کیا ہوگا

بلندی بانٹنے میں محو تھے زاغ و زغن اتنے
یہ سوچا ہی نہیں شاہیں سے پر والوں کا کیا ہوگا

ترنم ہی اگر معیار ٹھہرا دورِ حاضر کا
سخن کے ذکر میں جوشؔ وجگرؔ والوں کا کیا ہوگا

مری خانہ بدوشی تو مجھے محفوظ کردے گی
زمیں ہلتے ہی ان دیوار و در والوں کا کیا ہوگا

اگر یہ معرکے ہی اب سرے سے ختم ہو جائیں
ہتھیلی پر لئے جاں باز سر والوں کا کیا ہوگا

ہمیں معلوم ہے اس بھیس میں تم کون ہو آخر
تمہاری رہنمائی میں سفر والوں کا کیا ہوگا

بلا کا حسن لے کر حسن والے بے نیازی سے
یوں ہی آئے نظر تو ہم نظر والوں کا کیا ہوگا

تمہاری قیمتی یادیں انہیں انمول کرتی ہیں
میرے اشکوں کو یہ غم ہے گہر والوں کا کیا ہوگا

◂◂ ● ▸▸

پرانے ڈھنگ سے ٹکرا رہی ہے
محبت سنگ سے ٹکرا رہی ہے
غزل کے شعر کی آساں بیانی
کٹھن فرہنگ سے ٹکرا رہی ہے
نظر والوں کی خوشبو چپکے چپکے
ترے ہر رنگ سے ٹکرا رہی ہے
تمہارے بات کی جادو گری تو
مرے آہنگ سے ٹکرا رہی ہے
مری دہقانیت اے شہر والو!
مرے ہی رنگ سے ٹکرا رہی ہے
میرے جیسے مسافر کی تھکن بھی
تو راہِ تنگ سے ٹکرا رہی ہے
ابھی تو امن کی کوشش سراسر
سنا ہے جنگ سے ٹکرا رہی ہے
یقیناً خدمت اردو ہماری
ابھی پاسنگ سے ٹکرا رہی ہے
بچھڑ کر پھر تری تصویر مجھ سے
درِ ارژنگ سے ٹکرا رہی ہے

◂◂ ● ▸▸

Vill: Jawma Po. Mejwan
Phulpur Dist Azamgadh (UP)
Mob: 9451431700

ڈاکٹر فریاد آذر

سازشِ وقت سے انجان رہا ہے وہ بھی
میرے ہونے کا برا مان رہا ہے وہ بھی

اس نے چڑھتے ہوئے سورج کی عبادت کی ہے
یعنی طاقت کو خدا مان رہا ہے وہ بھی

عالمِ دل کو کیا فتح اسی نے لیکن
اور اس فتح سے انجان رہا ہے وہ بھی

آج سب لوگ سمجھتے ہیں فرشتہ اس کو
کس کو معلوم ہے شیطان رہا ہے وہ بھی

مدتوں خود کو پریشان کیا تھا اس نے
مدتوں خود سے پریشان رہا ہے وہ بھی

اس کے ہی عہد نے اس کو نظرانداز کیا
اور اسی عہد کی پہچان رہا ہے وہ بھی

اس کی تخلیق سے حیران رہی ہے دنیا
بس اسی بات پہ حیران رہا ہے وہ بھی

◀◀ ● ▶▶

حسین خوابوں کی دنیا نہیں تو کچھ بھی نہیں
اور اس پہ خواب ادھورا نہیں تو کچھ بھی نہیں

ضمیر کہتا ہے کہ ایمان ہے تو سب کچھ ہے
ضرورتیں کہیں پیسہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

وصالِ یار ہی سب کچھ نہیں محبت میں
جو دشتِ ہجر سے گزرا نہیں تو کچھ بھی نہیں

تمام عمر جہاں کو پرکھتے بیت گئی
پر اپنے آپ کو پرکھا نہیں تو کچھ بھی نہیں

جہاں میں رہ کے کسی کو جہاں ملے نہ ملے
مگر وہ طالبِ عقبیٰ نہیں تو کچھ بھی نہیں

◀◀ ● ▶▶

E12/60A, Hauz Rani, Malviya
Nagar,New Delhi-110017

امر مہکی

ساون کی ہواؤں نے ، دکھ درد جگایا ہے
برسات کی بوندوں نے ،سکھ چین بہایا ہے

پت جھڑ میں درختوں سے،گرتے ہوئے پتّوں نے
جیون کی کہانی کا انجام دکھایا ہے

تنہائی کے موسم میں ،یادوں کے جزیروں پر
بچھڑے ہوئے لوگوں نے، میلہ سا لگایا ہے

اظہارِ تمنّا سے ، رہتی نہ کسک دل میں
خاموش محبت نے ، پاگل سا بنایا ہے

بے طرح پھنسے ہیں ہم ، حالات کے چنگل میں
لگتا ہے مقدر نے ، جال اپنا بچھایا ہے

ہم دل میں امرؔ اپنے ، رنجش نہیں رکھتے ہیں
روٹھا ہے کوئی جب بھی ، گھر جا کے منایا ہے

◀◀ ● ▶▶

دھرتی سوکھے خاروں کی
دنیا ، دنیا داروں کی

کتنی دلکش ہوتی ہیں
جھوٹی باتیں یاروں کی

لمبا دور خزاؤں کا
تھوڑی عمر بہاروں کی

جلتے بلتے لمحوں میں
ٹھنڈک یاد پیا روں کی

رات گئے ہم کرتے ہیں
محفل چاند ستاروں کی

دل کا میٹھا درد امرؔ
جاں ہے ہم بیماروں کی

◀◀ ● ▶▶

H. No. B-IV-34-A-26
Mohalla Masjid Makbara
Shabaz Gargh Road
Hizru, Attok, Pakistan

فردوس گیاوی

کسی کے واسطے تو بے قرار تھوڑی ہے
تمہارے دل کو میرا انتظار تھوڑی ہے
کہا یہ کس نے کہ پیسے سے پیار ملتا ہے
دلوں کا سودا ہے یہ کاروبار تھوڑی ہے
ہماری جان ہو بے حد عزیز ہو ہم کو
تمہارے واسطے دل میں غبار تھوڑی ہے
انا کو بیچ کے اس کا غلام ہو جاؤں
وہ شاہِ وقت ہے، پروردگار تھوڑی ہے
یہ اور بات کہ میں اس سے بول لیتا ہوں
غلط نہ سمجھو مجھے، اُس سے پیار تھوڑی ہے
سمٹ کے غیر کی بانہوں میں مسکراتے رہو
تمہارے دل پہ میرا اختیار تھوڑی ہے
ہر ایک حال میں فردوسؔ مسکرائے گا
کسی کے واسطے وہ اشکبار تھوڑی ہے

◀◀ ● ▶▶

پختگی اور اگر آپ کے فن میں آئے
نرم لہجے کی بلندی بھی سخن میں آئے
موسمِ برف میں لازم ہے کہ شعلے کھائیں
کچھ تو گرمی اے میرے یار بدن میں آئے
ایک ہی بار سہی ہم سے ملاقات کو آ
مدّتوں بعد تو ہم تیرے وطن میں آئے
ایک مدّت سے ہم آنکھیں بچھائے بیٹھے
کہہ دو اس سے کہ کبھی صحنِ چمن میں آئے
جسدِ خاکی کو ذرا دھیرے لحد میں رکھنا
داغ دیکھو نہ کوئی اس کے کفن میں آئے
بات کرنا تو میرے یار سنبھل کر کرنا
بات ایسی نہ کوئی تیرے دہن میں آئے
پاس آنے سے جو اس کو ہے قباحت یارو
تارا بن کے وہ کبھی نیل گگن میں آئے
بے جھجھک مجھ سے بھی فردوسؔ کبھی مل لینا
جب کوئی بات بہک کر تیرے من میں آئے

◀◀ ● ▶▶

Arif Nagar Gewal Bigha
Gaya (Bihar) 823001
Mob: 9546037777

● ڈاکٹر نگہت نسیم

تنہائی کو رشتہ مطلوب ہے

میں ۸۰ سال کا آدمی ہوں
گھر میں تنہا رہتا ہوں
مجھے تلاش ہے
ایک ۷۰+ ساتھی کی
جو
سرد راتوں کو
اپنی باتوں سے چھوٹا کر دے

☆

عشق

اے خدا
تیری کائنات ساکت ہی رہتی
جو ایک لمحہ متحرک نا ہوتا
وہ لمحہ
جو سوتا بھی نہیں جاگتا بھی نہیں
وہ لمحہ
پھیلے تو ذات ہو جائے
سکڑے تو کائنات ہو جائے
اے خدا
وہ لمحہ ''عشق'' ہے
جس نے
تیری کائنات کو متحرک رکھا ہوا ہے

☆

21 Juction Road Moorebank,
NSW- 2170 Australia

● کلاسک

● فراق گورکھپوری

جدید اردو غزل کا مستقبل

شاعر کا مذہب کیا ہے۔ نہ وہ ہندو ہوتا ہے نہ مسلمان نہ عیسائی نہ یہودی نہ پارسی نہ بودھ آپ کہیں گے یہ غلط ہے۔ تلسی داس اور سورداس ہندو تھے، ایک رام کا پوجنے والا، دوسرا کرشن کا، ہاں کبیر البتہ اپنا پتہ نہیں دیتے۔ ملٹن اور ڈانٹے عیسائی تھے، ہومر اور ورجل کے بارے میں جو کچھ کہہ لیجئے لیکن شیلی منکر تھا۔ ایک ورڈ سورتھ تو انگریزی چرچ سے صلح کر کے مرا فردوسی، سعدی، حافظ پر بھی کفر کا فتویٰ نہ لگائیے۔ رہے عمر خیام تو کون جانے اس شخص کا کیا مذہب تھا۔ انیس و دبیر تو اپنے بارے میں کہہ ہی گئے کہ ''پانچوں پشت ہے شبیر کی مداحی میں'' یہ صحیح ہے لیکن اردو کے غزل گو شعرا ان کا مذہب جو کچھ بھی رہا ہو اپنے کو وہ کافر ہی بتاتے ہیں۔

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو تم ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

سب جانتے ہوئے بھی کہوں گا کہ شاعر کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ ہاں مذہب اور لا مذہبیت دونوں کا شاعرانہ احساس مس کر سکتا ہے، دونوں کو شاعرانہ وجدان اپنے حریم راز میں باریاب کر سکتا ہے۔

شاعری کائنات کو یا یوں کہئے کہ کائنات کے ان حصوں کو جن سے شاعر کے وجدان کو لگاؤ ہوتا ہے، حسین پاتی ہے اور حسین بناتی ہے۔ پس اگر شاعر کا کوئی مذہب ہے، اگر شاعر کو کسی چیز کی تلاش ہے تو وہ حسن ہے، ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کیا خوب حسن سے تو ہم لگاؤ ہے لیکن ہم شاعر نہیں ہیں آپ سچ کہتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ شاعری حسن کی تلاش میں یا حسن کا سامنا کرنے میں کچھ آپ کی مدد کرتی ہے یا نہیں۔ یوں تو دنیا میں کیا نہیں، کیسی کیسی صورتیں موجود ہیں لیکن ہم آپ پھر بھی شاعر کے دست نگر رہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ دنیا اور دنیا کے حسین افراد مناظر ہر وقت ہمارے سامنے تو رہتے نہیں ہے اور یوں بھی عملی طور پر دنیا کا ترجمہ محض ایک بے حس احساس ہوتا ہے اور اس بے حس احساس کا بھی زندہ احساس نہیں ہوتا۔ بہر حال یہ نفسیات کے راز ہیں اور انہیں راز ہی رہنے دیجئے۔ ہاں فنون لطیفہ یا شاعری ہمارے وجدان کو جمود کی حالت

سے چونکا دیتے ہیں۔ حسن کا ایک نیا احساس ہونے لگتا ہے جسے ہم تخیلی احساس کہہ سکتے ہیں۔ یوں تو روزانہ زندگی میں بھی ہم کو نیکی بدی، خوبصورتی بدصورتی، لطافت اور کثافت کا احساس ہوتا ہے لیکن یہ احساس ملا جلا ہوا سا ہوتا ہے۔ زندگی کے عملی رجحانات اس حساس کو مخلوط، کمزور اور دھندلا بنا دیتے ہیں۔ پھر بھی اسی ملے جلے ہوئے احساس میں تخیل اور وجدان کے سامان موجود ہوتے ہیں جب ہمارے احساس سے زندگی کا ملی رجحان اور اضطراب نما جمود دور ہو جاتا ہے اس وقت ہمارے معمولی احساس نئی زندگی پاتے ہیں اور شاعرانہ احساس بن جاتے ہیں اور اس شاعرانہ احساس کے بھی منازل اور مقامات ہیں اور آخری مقام اس احساس کا کیف واثر سے گذر کر احساس محض یا احساس کل تک پہنچ جاتا ہے۔ صرف نسبتی حیثیت سے عام انسانوں کے احساس پریشاں پر شاعر کا احساس، فوقیت رکھتا ہے، کہا جاتا ہے کہ شاعری کائنات کو اس نظر سے دیکھتی ہے، جس نظر سے کائنات کو خدا دیکھتا ہے۔ لیکن کسی شاعر کا بھی ذوق شعور مکمل شاعرانہ نہیں ہوتا۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت — جب پا نہ سکے اس کو تو آپ اپنے کو کھو آئے
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

آخری شعر میں اس نے استغراق و مراقبہ کو بھی طشت از بام کر دیا ہے۔ تاہم شاعانہ احساس بہت کچھ معمولی زندگی کی آلودگیوں سے پاک ہوتا ہے شاعرانہ احساس حقیقت نہ سہی لیکن حقیقت نما ضرور ہے۔

گرد و غبار ہستیِ فانی اڑا دیا — اے کیمیائے عشق مجھ کیا بنا دیا
اہلِ دل آ کے کریں مملکتِ عشق کی سیر — کہ ہر ایک ذرہ یہاں رونما ہوتا ہے
اک جلوۂ حق نما کو دیکھا — تم کو دیکھا خدا کو دیکھا

کیا یہ اشعار شاعری و تصوف کے لطیف ربط کا پتہ نہیں دے رہے ہیں، چسٹرٹن کا قول ہے کہ ہر فن لطیب میں تصوف کا عنصر و انداز ہوتا ہے۔ یوں کنجوس کی دولت پرستی میں، دنیا دار کی دنیا پرستی میں اور عام انسانوں کی بوالہوس میں جو کشش کام کر رہی ہے یہ سب حسن کے کرشمے ہیں اور حسن کی جہاں اور صفات ہیں ان میں ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ لامحدود معلوم ہو۔ سوامی رام تیرتھ نے گناہ کی تعریف کی ہے کہ سورج کی روشنی کو براہ راست دیکھنے کے بجائے اس کی چمک گندے پانی یا کیچڑ میں دیکھنا اور خوش ہونا گناہ اور لذتِ گناہ ہے، مگر ہے بہر حال وہ سورج ہی کی روشنی۔

شاعری، زندگی کے ہر منظر میں ایک موارئی یا روحانی لامحدود ماہیت کا احساس کرتی ہے اور اسی کو جمالیات کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہر شئے بیک وقت لطیف بھی ہے اور کثیف بھی۔ محدود بھی ہے اور غیر محدود بھی، مادی بھی ہے، اور روحانی بھی، اصل بھی اور خواب بھی، موجود بھی ہے اور معدوم بھی، کثرت کی بھی

مثال ہے اور وحدت کی بھی، درس نیاز بھی ہے اور درس بے نیازی بھی، الغرض فضائے عالم میں ایک ماوراء عالم کی حقیقت ضرور پائی جاتی ہے اور شاعر کا مذہب اسی عالمگیر حقیقت کا احساس ہے کبھی وہ اسے حسن کہتا ہے اور کبھی عشق اور کبھی کہہ دیتا ہے۔ ''کافر عشقم مسلمانی مرادر کار نیست''

جس طرح طبیعات میں مابعد الطبیعات کے جراثیم موجود ہوتے ہیں۔ اور جس طرح اخلاقیات میں فقر اور الوہیت کے عناصر موجود ہوتے ہیں اسی طرح شاعرانہ کیفیت یا حسن کے تخلیقی احساس میں وہ نواہوائے سرمدی پنہا ہوتے ہیں جو تصوف کے رمز و کنایات کے حامل ہیں اور شاعری و تصوف میں وہی تعلق ہے جو اضطراب موسیٰ اور برق طور میں ہے۔

میں نے تصوف کے مرکزی اصول پر غور کیا ہے اور ان اصول اور حقائق کا مجمل ذکر بھی بہت وقت چاہتا ہے۔ فی الحال صرف چند اصول کو لے لیجئے۔ وحدتِ وجود یا ہر ہستی کا لامحدود ہونا یا حقیقت زبان و مکان سبب و علت سے معرا ہونا، اس کا شریعت و ملت بلکہ نیکی و بدی سے بے نیاز ہونا اور باوجود اس بے نیازی کے بھی ہستی مطلق کا خیر محض ہونا ان سب کو جو نسبت شاعری سے ہے اس پر غور کیجئے۔ حسن کا تصور آپ محدود طریقہ پر کر ہی نہیں سکتے، کیوں کہ یہاں مقداری تصور کا گذر نہیں، کتنا اور کس قدر کا مفہوم ہم حسن سے متعلق نہیں کر سکتے، حسن کا تیز احساس ہمیں لامحدود کی طرف لے جاتا ہے۔ جتنا ہی یہ احساس تیز ہوتا جائے گا۔ حسن اتنا ہی ہمہ گیر نظر آئے گا۔ یہاں تک کہ تمام کائنات میں ایک ہی حسن جلوہ گر نظر جائے گا۔ یہاں تک کہ تمام کائنات میں ایک ہی حسن لطیف اور شدید احساس اسے زبان و مکان، سبب و علت اور تمام تعینات سے معرا کر کے خیر محض یا عینِ رحمت کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ میر کا یہ شعر سنئے ؎

جفائیں دیکھ لیا کج ادائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

یوں بظاہر اول سے آخر تک اس شعر میں حسن کی جفاؤں، کج ادائیوں اور برائیوں کا ذکر ہے لیکن اگر شعر کا مفہوم اس کا نغمہ ہے (The Music is tha Meaning) اگر میر ترنم، احساس تک آپ پہنچ سکتے ہیں، تو اس شعر سے دھڑکن آپ کے دل میں پیدا ہوتا ہے وہ خود بتا دے گی کہ ان جفاؤں، کج ادائیوں اور برائیوں کا مفہوم خیر محض ہے اور اس لب و لہجہ میں کسی کو کوسا نہیں جاتا۔

یوں تو اردو غزل میں جب تصوف کا نام آتا ہے تو ہم کو اور آپ کو غالب یاد آتے ہیں۔ مگر اس بات پر دھیان بھی نہیں جاتا کہ غالب کا تخیل بہت خود غرض تخیل ہے اور غالب کا وجدان خود پرست وجدان ہے۔ غالب نے کسی ماورائی حقیقت سے کبھی بحث نہیں کی۔ غیب و شہود، قطرہ، دجلہ، جزو کل، ہستی و نیستی، حق و باطل، نوہائے راز، پردۂ ساز وغیرہ کی جو کچھ اور جیسی کچھ ترجمانی کی ہو لیکن یہ تعینات کی حدود سے آگے نہیں

بڑھتی۔ غالب کے وجدان و تخیل میں نہ سپردگی تھی اور نہ وہ گداز جس کی بدولت مجاز میں حقیقت کا چٹیلا احساس ممکن ہوتا ہے۔ غالب کا شعر ہے ؎

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اس شعر کا کیا کہنا لیکن اس میں وہ والہانہ سپردگی کہاں، وہ مانوس و معصوم احساس کہاں، جو تصوف اور تغزل کو ایک کر دیں۔ غالب نے کیا نہیں کہا۔ لیکن ایسے شعر کبھی کہے ؎

پرستش کی اے بت یہاں تک تری نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے
(میر)

داغ دیکھے تھا کھڑا لالۂ صحرائی کا زور عالم نظر آیا تری سودائی کا
(غالباً مصحفی)

غالب نے صرف ایک غزل اس رنگ میں لکھی ہے جس کا مطلع ہے ؎

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اس غزل کے آخری چند اشعار جو قطعہ بند ہو گئے ہیں۔ البتہ اس معصوم تخیل کا پتہ دیتے ہیں، جہاں تصوف و تغزل ایک ہو گئے ہیں۔ غالب بڑا کامیاب شاعر ہے لیکن غالب کو اس کامیابی کی بڑی مہنگی قیمت ادا کرنی پڑی ہے جبھی تو وہ میر کے اشعار پر اپنا مغرور سر دھنتا تھا۔ میں بچپن ہی سے اس بدعت کے خلاف بغاوت کرتا ہو، جو عاشقانہ اشعار کو کھینچ تان کر معرفت اور عشق حقیقی بتا دیا کرتی ہے۔ لیکن شروع ہی سے مجھ کو وجدانیات و جمالیات میں وہ معنویت ملتی رہی ہے کہاں مجاز اور حقیقت ایک ہو جاتے ہیں۔ ناسخ کو تصوف سے کیا غرض لیکن اس کے اس شعر کی کیفیات کو اپنی روح میں ڈوبنے دیجئے اور پھر سوچئے کہ آپ کہاں ہیں۔ ؎

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

بغیر معرفت و حقیقت، اور ازل و ابد وغیرہ کے ذکر کے، ایک خاص محویت اور روحانی کیفیت اس شعر سے پیدا ہوتی ہے۔ حافظ میں مجاز کا رنگ کتنا تیز ہے۔ پھر بھی وہ لسان الغیب کہلاتا ہے۔

اب چند اشعار سنئے جن میں بے واسطہ اور بالواسطہ دونوں طرح تصوف پایا جاتا ہے ؎

برسوں لگی تھیں آنکھیں دروازۂ حرم سے پردہ اٹھا تو لڑیاں آنکھیں ہماری ہم
کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں
بے نمود اور نمودار کہیں دیکھا ہے اس قدر سادہ پرکار کہیں ہم
ظاہر میں تو ہیں مگر نہیں ہم دریائے رواں نہ ہو کہیں ہم
دکھلا دئے لے جا کے تجھے مصر کا بازار گاہک نہیں واں کوئی مگر جنس گراں کا

تم مرے پاس ہوتے ہو گیا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
بشر جو اس تیرہ خاکدان میں پرِ یہ اس کی فروتنی ہے — وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اس کے جلوہ کی روشنی ہے
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی
بت کو بت اور خدا کو جو خدا کہتے ہیں — ہم دیکھیں کہ تجھے دیکھ کے کیا کہتے ہیں
وہی ہے اک شعلۂ تجلی رہا جو ایمن میں سنگ ہو کر — جب اسنے اپنی نمود چاہی کھلا حسینوں پہ رنگ ہو کر
میں ترا عکس تھا اس آئینہ ہستی میں — تو نے کیا پھیر لیا منہ کہ کیا گم مجھ کو
کتنے کعبے ملے رستے میں کئی طور ملے — ان مقامات سے ہم کو وہ بہت دور ملے

اگر وہ غزل کبیرؔ سے منسوب کی جاتی ہے اور جس کا پہلا مصرع یہ ہے۔

ہمیں ہے عشق متانہ ہمن دنیا سے یاری کیا

اردو کی پہلی غزل ہے تو ماننا پڑے گا کہ اردو غزل کا آغاز تصوف سے ہوا۔ دکن کے شعرا نے بھی تصوف ہی سے غزل کا آغاز کیا۔ جب شاعرانہ احساس اور قوتِ اظہار میں خود اعتمادی پیدا ہو چلی تو اس کی ضرورت نہ رہی کہ بالا رادہ معرفت کے مضامین لکھے جائیں بلکہ کفریات اور خرابات و، ساقی اور شراب، زلف ورخ، یہاں تک کہ غزل کی تمام اصلاحات میں اکثر روحانیت و معنویت کا پہلو نظر آنے لگا اور عاشقانہ اور عارفانہ شاعری کی آوازیں مل گئیں۔

اردو کے جن غزل گو شعرا میں تصوف کا عنصر تیز رہا ہے یا جنہوں نے تصوف کے قابل توجہ اشعار کہے ہیں۔ ہو میرؔ اور درد، غالبؔ، آتشؔ، آسیؔ، غازی پوری اور اصغرؔ ہیں۔ تصوف سے اردو غزل کو جو کچھ نقصان ہوا یا وہ تصوف جو غزل میں محض برائے بیت رہا ہے، اس سے بحث نہیں لیکن انسان کی عظمت کا احساس، عرفانِ نفس اور کائنات کے روحانی پہلو کا احساس، یہ تمام باتیں غزل میں تصوف ہی کے لگاؤ سے آئی ہیں۔ اقبالؔ سے پہلے ہمارے غزل گو شعرا کے تصوف میں ایک چیز کی کمی تھی وہ یہ کہ اجتماعی زندگی، فلسفۂ تاریخ اور خلقت کے ارتقا پر تصوف کی روشنی نہیں ڈالی گئی تھی۔ اقبال نے اس کا آغاز کیا کہتے ہیں۔

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

اقبالؔ کے متعدد اشعار واقعیت اور روحانیت کے اس امتزاج کا پیش خیمہ ہیں جس کے لئے انسانیت آج گوش برآواز ہے۔

کسی کا قول ہے کہ رائے دماغ کے لئے افیون ہے۔ (Opinion is tha opium of mind) اردو غزل پر جب رائے زنی کی جاتی ہے تو اکثر اس قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس افیون کا اثر اس

قت اور بھی تیز ہو جاتا ہے جب کسی رائے میں سچائی سے بھی لوگ یہ کہہ کر اپنے دل و دماغ کی تشفی کر لیا کرتے ہیں کہ غزل میں ایک ہی قسم کی دقیانوسی باتیں شروع سے اب تک دہرائی جا رہی ہیں۔ وہی حسن و عشق، گل و بلبل، ساقی و صہبا، رقیب و قاصد، ہوش و جنوں، دیر و حرم اور تصوف وغیرہ کی باتیں وہی مصرع طرح اور وہی ردیف و قافیہ، مطلع و مقطع وغیرہ غرض کہ فرسودہ و پامال جھوٹے مبالغہ آمیز خیالات ان کے سوا ہوتا ہی کیا ہے۔

جو لوگ غزل کے متعلق رائے دینے میں اپنے دل و دماغ کی خلش ایسی آسانی سے دور کرتے ہیں۔ ان سے اگر اس بات کا مطالبہ کیا جائے کہ وہ غزل پر رائے زنی کرنے میں ذرا احتیاط سے کام لیں تو بگڑ جائیں گے۔ ایسے حضرات سے پوچھنا چاہئے کہ مثلاً دیوانِ غالبؔ عام موضوع کے لحاظ سے حسن و عشق، قاتل و بسمل، گل و بلبل، وصل و ہجر، صحرا و زنداں اور خمریات و کفریات کے علاوہ کیا ہے، لیکن پھر بھی دیوانِ غالب پر جان دیتے ہیں اس کے اشعار پر سر دھنتے ہیں، اس کے علاوہ میرؔ، سوداؔ، دردؔ، جرأتؔ، مصحفیؔ، آتشؔ، داغؔ، اور اقبالؔ وغیرہ کے اشعار پر بے اختیار ہو جاتے ہیں ذیل کے اشعار بہت بڑے شعرا کے اشعار نہیں ہیں لیکن ان کو سن کر کیا ہم بغیر متاثر ہوئے رہ سکتے ہیں۔

محبت میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر — ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر
یہ گمراہی یہ خود ناآگہی اچھی نہیں غافل — کسی وادی میں کھو جا اور جستجو کر لے
رنج و غم ہجر کے گذر بھی گئے — اب تو وہ دھیان سے اتر بھی گئے
بہاریں ہم کو بھولیں یاد اتنا ہے کہ گلشن میں — گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا
چھٹپٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا — صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا
حسن کا زور طلب ہے کہ بھری محفل میں — ہم سے چھینے لئے جاتا ہے ہمیں کو کوئی

یہ سب اشعار غزلوں سے لئے گئے ہیں اور میرؔ و غالبؔ کے ایسے اساتذہ کے نہیں ہیں، لیکن کیا ان میں حقیقی شاعری نہیں ہے ناگزیر تاثرات سے انکار اور اپنے وجدان سے لڑنا نادانِ سخن ہے نہ سخن فہمی۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ جن لوگوں نے یہ بات ثابت کرنے یا محض دہرانے میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دیئے ہیں کہ غزل میں محض جھوٹ اور نقالی ہے، جب غزل کے کچھ اشعار سنتے ہیں تو تلملا اٹھتے ہیں۔ ایک قابل غور امر یہ ہے کہ غزل کو محض نقالی بتانے والے سب سے کم اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ وہ کسی اچھے غزل گو کے کلام کا سرچشمہ یا اس کا ماخذ بتا سکیں۔ مثلاً میں کہتا ہوں کہ حالیؔ کی غزل گوئی جرأت سے ماخوذ ہے اور حالی کے کچھ خاص اشعار جرأت کے اشعار کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں تو بہت سے لوگ چونک پڑیں گے اور کیا عجب کہ حالیؔ خود چونک پڑتے، لیکن ذرا ٹھہریئے حالیؔ، شیفتہؔ کی تقلید بھی کرتے تھے اور شیفتہؔ کے شاگرد بھی تھے اور

شیفتہ، مومن کے شاگرد رشید تھے اور مومن نے جرأت کے رنگ کی تقلید کرتے ہوئے اسے اور لطیف اور پر معنی بنا دیا ہے۔ ان تاریخی واقعات کو نہ بھولئے۔ اب دیکھئے کہ جرأت کی معاملہ بندی لطیف سے لطیف تر ہو کر حالی کے اُن اشعار میں دوسرا جنم لیتی ہے یا نہیں۔

جس کو غصے میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے — آج دل لے گا کل نہ لیا یاد رہے
یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر — تھا ان کو مجھ سے ربط مگر اس قدر کہاں
بے قراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ — اب وہ گلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں
کر دیا خوگرِ جفا تو نے — خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے
مجھ کو کس سے خفا کیا اے رشک — ایک عالم کو خوش کیا تو نے
بات کیا ہے کہ تو نے حالی آج — بخشوایا کہا سنا تو نے
عشق کہتے ہیں جسے وہ یہی ہے شاید — خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا
اب وہ اگلا سا التفات نہیں — جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں
اس کے جاتے ہی ہوئی کیا مرے گھر کی صورت — اب وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

لسان الغیب کا یہ مصرع تو سکیڑوں برس سے ہم آپ سنتے آ رہے ہیں کہ ''بہیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا'' میں کہوں گا تفاوت رہ کے ساتھ ساتھ تسلسل رہ کو بھی دیکھئے۔ لٹریچر آواز ہائے بازگشت کے سلسلوں کا نام ہے۔ (Literature is a series of echoes) اردو غزل میں الفاظ اور معنی کی تکرار جسے نقالی کہتے ہیں، تکرار اخلاقانہ کا تسلسل ہے اور اسی تکرار تجدید کا راز پنہا ہے۔

غرض کہ اردو غزل گوئی پر جو مختلف دور گذرے ہیں وہ ایک معنوی حقیقت اور ایک معنوی ارتقا کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ولی دکنی کا دور۔ میر اور سودا سے پہلے کا دور، میر اور سودا، درد اور سوز کا دور، جرأت، انشاء اور مصحفی کا دور، غالب، مومن اور ذوق کا دور، ناسخ اور آتش کا دور، امیر اور داغ کا دور، ریاض اور جلیل کا دور، حالی اور شاد عظیم آبادی کا دور..... صفی، محشر کا دور اور حسرت، اصغر، جگر، فانی اور اقبال کا دور محض زبان اور محاورہ کی چیزیں نہیں ہیں۔ روح تغزل کا انقلاب اس سے بھی زیادہ گہرا رہا ہے اور متاخرین یا دورِ حاضر کے شعرا کے کچھ اشعار پچھلی صدیوں کی آواز بازگشت معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک قدیم شاعر کا یہ شعر لیجئے۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی — جو چاہیں ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

لیکن کیا فانی کے یہ اشعار بیسویں صدی کے پہلے ممکن تھے۔

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی — سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں
جسم آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح — خیر جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں

حالی کی سلامت روی صرف اس لطیف سوخ اور سنجیدہ معنویت تک رہتی ہے کہ۔

کاش اک جام بھی سالک کو پلایا جاتا — اک چراغ اور سرِ راہ جلایا جاتا

اقبال کہتے ہیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
کارواں تھک کر فضا کے پیچ وخم میں رہ گیا — مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

پہلے کا شاعر کہہ گیا ہے۔

زمانہ کے ہاتھوں سے چارہ نہیں ہے — زمانہ ہمارا تمہارا نہیں ہے

اقبال کہتے ہیں۔

''زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز''

بہر حال اس مجمل بحث میں زیادہ مثالوں کی گنجائش نہیں۔

دور حاضر کی غزل گوئی پر جب نظر پڑتی ہے۔ تو پہلے مجمل طور پر یہ خیال ہوتا ہے کہ اب سے پہلے اردو غزل میں عام طور پر جو رونا دھونا رہا ہے اس کی جگہ ہمت افزا اور نشاط افزا جذبات لیتے جا رہے ہیں اور غزل ''نوا سنج فغاں'' ہونے کے بدلے اب خوشی کا ترانہ بن گئی ہے مگر میں یہ کہوں گا کہ پچھلی غزل گوئی اور اب کی غزل گوئی میں بھی غم و خوشی۔ افسردگی و شگفتگی، نشاط و یاس دونوں کے عناصر کافی موجود ہی۔ مثلاً بحیثیت مجموعی دہلی کی غزل گوئی غم انگیز اور لکھنؤ کی نشاط انگیز ہے خود دہلی میں میر و سودا، غالب و ذوق، ظفر و داغ کے رنگِ کلام اور رنگِ طبیعت میں فرق ہے اور لکھنؤ میں جرأت، آتش، انشاء ایک طرف تو مصحفی اور جذباتی اسکول کے شعرا مثلاً غریز اور محشر دوسری طرف ہیں۔ اگر یہ ہے تو آج کی غزل گوئی اور پچھلی غزل گوئی میں فرق کیا ہے یہ فرق صرف غم و خوش کا فرق نہیں ہے۔ بلکہ ایک جدید معنویت، نفسیاتی اور فلسفیانہ رقتِ نظر اور ایک نئی ذہنیت کا سوال ہے۔ غم و خوشی، یاس و نشاط، عاشقانہ احساسات، تصوف اور حیات کے عالمگیر مسئلے پہلے بھی غزل کے عناصر تھے اور اب بھی ہیں لیکن ان سب کا ایک نیا شعور دور خاص کی غزل میں پایا جا رہا ہے۔

غزل کیا ایک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغر
یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

شاعر کا مطلب یہ نہیں کہ فریاد و ماتم غزل میں نہ ہو بلکہ محض رسمی سینہ کوبی اور رونے دھونے کی گنجائش نہیں اسی طرح تصوف اور فلسفہ میں، عشق و حسن کی شاعری میں اور ٹھیٹھ زندگی کی شاعری میں پرانی انفرادیت کی جگہ ایک نئی انفرادیت اور اجتماعی زندگی کے پرانے احساس کی جگہ ایک نیا احساس آج کل کے غزل گو شعرا کو ہو رہا ہے، بہر حال واقعیت ہو یا حقیقت ظاہری زندگی ہو یا معنوی، مجہولیت ہو یا عملیت اردو

غزل میں ان میں سے ہر ایک کا نیا جنم ہو رہا ہے اور نئے رنگ و روپ سے نشو نما ہو رہا ہے۔ رسمیت مٹ رہی ہے۔ سچی کاوش و تلاش اور زندگی کے نئے احساس اور وجدان اور جمالیات کی ایک نئی غرض و غایت کا پتہ موجودہ اردو غزل سے مل رہا ہے سماجی اور سیاسی زندگی میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں، عقلیت اور وجدانیت میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں، نئی انسانیت کی جو اسپرٹ رونما ہو رہی ہے۔ کائنات اور حیات کے پرانے احساس جن عنوانوں سے نئے احساس بنتے جا رہے ہیں۔ سائنسیں، جدید سوشیالوجی، جدید فلسفہ، جدید فضا اور ماحول مغرب و مشرق کا تصادم اور ان کا امتزاج جس طرح غزل میں رونما ہوا ہے اس کی نمایاں مثال اقبال کی غزلیں ہیں اور یہ اثر بال جبریل اور ضرب کلیم میں اتنا تیز نمایاں ہے کہ اقبال کی غزلیں اردو شاعری میں انقلاب کا حکم رکھتی ہیں اور یوں تو دور حاضر کی غزلوں میں یہ ضروری نہیں کہ اقبال یا کیس اور بڑے شاعر کی اندھی تقلید ہو لیکن اثر ان کا ضرور رہے گا اور قوتِ ارادی کے ساتھ جذبات کا ایک ایسا حیرت انگیز اتحاد ہوگا کہ آج ہم اس کا پورا اندازہ نہیں کر سکتے، یہ کہنا کافی نہیں کہ آئندہ کی غزل میں ہولناک جذبات نہ ہوں گے یا معاملہ بندی نہ ہوگی یا غزل مجلسی چیز ہونے کے بجائے عملی چیز بن جائے گی، میرا خیال ہے کہ ایک طرف تو آئندہ کی غزل میں سیکڑوں نئے عنوانوں سے حیات اور کائنات پر تبصرہ ہوگا اور دوسری طرف صوفیانہ، عاشقانہ اور عارفانہ غزل کے پرانے موضوعات آئندہ کی ذہنیت سے ہم آہنگ ہو کر نئے انداز سے غزل میں آئیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ مسلسل نظمیں مختلف اصولوں سے اردو شاعری میں داخل ہو جائیں گی۔ اردو شاعری محض غزل پرستی تک محدود نہ رہے گی لیکن غزل جب قدیم لفظ پرستی اور سہل پسندی سے آگے بڑھ کر ایک نئی جذباتی اور داخلی زندگی کی ترجمانی کرے گی تو اردو غزل ان نواہائے سرمدی سے حیاتِ انسانی کو مرتعش کر دے گی جو ابھی پردۂ ساز میں ہے، غزل کی چاہت اس کا اختصار اس کی نغمگی اس کی مرکزیت غزل کے روشن مستقبل کی خبر دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اب تک عالمگیر شہرت مسلسل نظموں کی ہوئی ہے مثلاً ہومر، ورجل، ڈانٹے، والمیک، ویاس، اور فردوسی کی نظموں کو لیکن ہم یہ کیوں بھول جائیں کہ وید مقدس انجیل اور قرآن پاک کا اسلوب نظموں کی بہ نسبت غزلوں سے زیادہ قریب ہے۔ مستقبل میں جس مقام پر نظموں کی آواز ختم ہوگی اسی مقام سے غزل کی سرمدی نغمے شروع ہوں گے۔ بڑی بات ہمیشہ طویل اور مسلسل نہیں ہوتی۔ اور جس طرح غزل بدل جائے گی اسی طرح سننے والوں اور سمجھنے والوں کا مذاق بھی لطیف اور بلند ہو جائے گا، غزل کا مستقبل اس سے زیادہ واضح طور پر اگر ہم جاننے کی کوشش کریں گے تو ہماری حالت اس مؤذن کی سی ہوگی جو اذان دیتا ہوا ایک طرف کو بھاگا جا رہا تھا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ اس کی آواز کتنی دور پہنچی ہے۔

◂◂ ● ▸▸

● ڈاکٹر منظر اعجاز

''شکست کی آواز'': ایک تجزیاتی مطالعہ

اردو فکشن کے موجودہ منظر نامے میں عبدالصمد کے شناس نامے کی دو جہتیں ہیں۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار بھی ہیں اور ناول نگار بھی۔ میں انہیں بیس برسوں سے زیادہ سے پڑھتا آ رہا ہوں۔ اس اثنا میں مطالعے اور تجزیے کے تاثرات بھی رقم کرتا رہا ہوں۔ جہاں تک ناولوں کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ''بکھرے اوراق'' سے ان کی ناول نگاری کے سفر میں ایک نیا موڑ آیا ہے، اور اس موڑ پر پہنچ کر انہوں نے پھر ایک نیا راستہ اختیار کیا ہے۔ ''شکست کی آواز'' اس نئی راہ کا پتہ دیتی ہے۔ البتہ اس منظر نامے میں کچھ نہ کچھ پرانے بلکہ عہد پارینہ کے آیات و آثار بھی نظر آتے ہیں، جن میں ایک کھنڈر نما حویلی بھی ہے اور یہ عبدالصمد کا ناسٹلجیا ہے۔ اور غالباً یہی ان کی تخلیقی سرگرمیوں کا اصل محرک ہے۔ حویلی اور ڈیوڑھی ان سے بھولی نہیں جاتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس تہذیب اور تہذیبی پس منظر سے ان کا تخلیقی وجدان وابستہ رہا ہے، اس کی شکست و ریخت اور اس کی آواز ہی اس ناول میں سمونی گئی ہے۔

حویلی کے ٹھاٹ باٹ کب کے ختم ہو چکے ہیں، اس کی رونق کب کی معدوم ہو چکی ہے لیکن کم سن ندیم کے لئے ایک اتالیق کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور حویلی کے ایک پرانے مرحوم ملازم کے گریجویٹ بیٹے کو حویلی کے ایک کمرے میں رکھ لیا جاتا ہے۔ اس طرح بے روزگار و گریجویٹ نوجوان جو ماسٹر صاحب کہہ کر پکارے اور بلائے جاتے ہیں، حویلی ان کی کفیل بن جاتی ہے۔

ماسٹر صاحب تو خیر جوان ہیں۔ حویلی میں پناہ مل جانے سے قیام و طعام کے مسائل حل ہو چکے ہیں اور ایک طرح سے بے فکری کی زندگی گزر رہی ہے۔ اپنے کمرے میں ہوتے ہیں تو فلمی ہیروئنوں کی نیم عریاں تصویروں سے دل بہلاتے رہتے ہیں۔ ندیم بھی کم سنی کے باوجود ماسٹر صاحب سے دوستی گانٹھ لیتا ہے۔ وہ بھی ان تصویروں میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ ماسٹر صاحب کی ناموجودگی میں بھی ان کے البم کی تصویریں دیکھا کرتا ہے۔ ماسٹر صاحب کی دوستی اسے کم سنی میں ہی جوانی کی دہلیز پر لا کھڑا کرتی ہے لیکن قبل از وقت یہ جوانی لائق اعتنا نہیں ہو سکتی۔ قصے کے اس پہلو سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ استاد یا اتالیق تعلیم و تربیت کا ذمہ دار ہوتا ہے، لیکن ماسٹر صاحب اس ذمہ داری کو نہیں سمجھتے۔ ندیم کی یہ حرکت کہ وہ ماسٹر صاحب کے کمرے میں گھسا رہتا ہے اور اہل خانہ کی توجہ مبذول کر لیتا ہے یعنی وہ کیوں گھسا رہتا ہے؟ یہ بات بطور سوال ابھرتی ہے لیکن اس سلسلے میں سنجیدگی اختیار

نہیں کی جاتی۔رفتہ رفتہ اس میں اخلاقی کمزوریاں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ایک جنسیت زدہ کردار بن جاتا ہے۔ یہاں غالباً ناول نگار یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ کم سنی میں بچوں کی نگرانی اور تربیت پر والدین کو خود خاطر خواہ توجہ دینی چاہئے ورنہ اس کا انجام برا ہوسکتا ہے۔ندیم کے والدین کی لاپروائی اور ماسٹر صاحب کی صحبت کی وجہ سے ہی ندیم کے دل و دماغ میں ایسے ایسے خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں اور ایسی ایسی حرکات سرزد ہونے لگتی ہیں جو معاشرتی اور تہذیبی و اخلاقی معیار سے گری ہوئی ہیں۔ قصے کا یہ حصہ نفسیاتی پہلو سے اہمیت کا حامل نظر آتا ہے۔

عبدالصمد نے حیرت انگیز طور پر اس ناول میں جنسی لذتوں کو ابھارا ہے اور بعض چٹخارے دار واقعات بیان کئے ہیں۔حالانکہ اسلوب بیان میں فحاشی نہیں ہے لیکن ایمائیت، اشاریت اور علامتوں کے ذریعہ سنسنی خیزی پیدا کردی ہے۔ یہ عبارت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے:

"نوری کے جوان ہوتے ہوئے جسم سے کیا نشر ہوتا کہ اس کے جسم میں ایک سنسنی سی پھیل جاتی، کانوں کی دونوں لویں گرم ہوجاتیں، آنکھوں سے بھاپ نکلنے لگتی۔وہ اپنی اس کیمیائی تبدیلی کو سمجھنے سے قاصر تھا۔" (ص ۷)

بارہویں تیرہویں سال کی عمر میں ندیم کی یہ کیفیت ماسٹر صاحب کے البم کی عریاں اور نیم عریاں تصویروں کی دید و بازدید کی رہین منت ہے۔اس کیفیت کو شدید تر کرنے کے لئے عبدالصمد نے نوری کے جسمانی خدوخال کا منظر نامہ کئی جگہ اور کئی طرح سے تراشا ہے۔ایک جگہ تو نوری کو لباس عریانی پہنانے کے لئے عبدالصمد کے تخلیقی وجدان نے چھاجوں برستے پانی کا اہتمام کیا ہے، اور پھر پانی میں آگ لگا دینے والی جوانی کا جو منظر تراشا ہے وہ بھی سنسنی خیزی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔

انسان کو کسی چیز کی لت لگ جاتی ہے تو لگ جاتی ہے لیکن کمسنی یا نوجوانی کی لت چھڑائے نہیں چھوٹتی۔نوری کے بعد حویلی کی دوسری جوان کنیز اختری کے ساتھ بھی ندیم کا رویہ ویسا ہی رہتا ہے جب کہ وہ ایک بچے کی ماں بھی ہے اور اس میں نوری جیسی جنسی کشش بھی نہیں۔نوری کو ایک دفعہ اس نے ماسٹر صاحب کے کمرے سے جس حالت میں نکلتے دیکھا تھا اور غم و غصہ میں مبتلا ہوا تھا اس سے یہ ممکن تھا کہ نوری کی ساری کشش گم ہوجاتی۔لیکن اس کشش میں کہیں نہ کہیں دل ایسا الجھا تھا کہ وہ اس کی یاد کو فراموش نہیں کر سکتا تھا۔اس عمر میں غالباً مخالف صنف کا تصور ہی لذت گیر ہوتا ہے۔ یہاں عبدالصمد کے علم و ادراک کا نفسیاتی لمس محسوس کیا جاسکتا ہے اور اسے تحلیل نفسی کا موضوع بنایا جاسکتا ہے۔

اس ناول میں ایک شق اردو کے حال واحوال سے بھی متعلق ہے جو کسی ادب پارے میں اتنی تفصیل سے پہلے کہیں نظر نہیں آتی۔عبدالصمد اردو کے استاد نہیں لیکن اردو کے ادیب ہیں۔اس سلسلے میں ان کا مطالعہ اور مشاہدہ ہر چند کہ تحیر آمیز نہیں لیکن بڑی جرأت و بیباکی سے غلاظت کے ڈھیروں کو انہوں نے کریدا ہے۔

ندیم کے والد ندیم کا داخلہ کالج میں کرانے کے لئے کسی طرح رضامند ہوجاتے ہیں تو مضامین کے

انتخاب کا مسئلہ زیر غور آتا ہے۔ندیم اردو لینا چاہتا ہے لیکن اس کے والد کا انداز نظر اردو کے سلسلے میں حقارت آمیز دکھائی دیتا ہے۔یعنی اردو پڑھ کر کیا ہوگا۔لیکن ندیم میں افسانے وغیرہ لکھنے کا شوق ابھر آتا ہے، اس لئے وہ اردو سے دستبردار ہونا نہیں چاہتا۔بالآخر اس کی بات رکھ لی جاتی ہے لیکن کالج میں جس اردو ٹیچر سے واسطہ پڑتا ہے اس کا شین قاف درست نہیں جس سے ندیم کو وحشت ہوتی ہے۔یونیورسٹی میں داخلے کے بعد کچھ اور قلعی کھلتی ہے۔

یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے ایک پروفیسر صاحب شاعر بھی ہیں وسیع تعلقات کے حامل ہیں۔اپنی شاعری کا بھی انہیں غرا ہے۔ ندیم افسانہ نگار ہے گریجوئیشن کی ایک ہم جماعت لڑکی ناظمہ کے کریٹیکل ریمارکس پر ندیم نے اپنے تخلیقی رویے میں تبدیلی لائی ہے اور اب اس کا جدید افسانہ نگاروں میں شمار بھی ہونے لگا ہے۔اس کے باوجود وہ منکسر المزاج ہے، لیکن پروفیسر صاحب کا رویہ اس کے ساتھ حسد و رقابت کا سا ہے۔بعض اوقات وہ یہ بھی ظاہر کردیتے ہیں کہ ان کے اقتدار و اختیار اور دوسری یونیورسٹیوں کے پروفیسروں سے وسیع تر تعلقات و مراسم کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔گویا وہ آفتاب کو ذرہ اور ذرے کو آفتاب بنا سکتے ہیں۔ندیم کے ساتھ ان کا رویہ معاندانہ اور مخاصمانہ رہتا ہے، اور بظاہر اس کی وجہ یہی دکھائی دیتی ہے کہ ندیم کا مزاج خوشامد پسندانہ نہیں۔اسے اپنی قابلیت اور صلاحیت پر بھروسا ہے لیکن اس میں غرور کا شائبہ تک نہیں۔

عبدالصمد نے غالباً پہلی بار یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور پروفیسروں کے مزاج و میلان کو قصے میں اس طرح ڈھالا ہے اور منصف کے کچے چٹھے کے طور پر عدالت کا بھرم کھول کر رکھ دیا ہے کہ اس طرح کی واردات خلاف واقعہ نہیں معلوم ہوتیں۔یونیورسٹی کے نظام اور خاص طور سے شعبہ اردو کا جو حال رہا ہے عبدالصمد نے اس کی ہو بہو تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔لیکن یہاں صدر شعبہ کا رویہ اس نظام میں منفرد اور ممتاز نظر آتا ہے۔وہ ندیم کی ذہانت اور قابلیت کو سراہتے ہیں۔ وہ ندیم کی سادہ لوحی کو بھی غالباً اچھی طرح سمجھتے ہیں۔اس لئے نویں پرچے کی تکنیکی اصطلاح کا مفہوم بھی سمجھاتے ہیں۔ظاہر ہے کہ آج یہ اصطلاح رائج نہیں اور آج کا نصاب آٹھ پرچوں کی بجائے سولہ پرچوں کا ہوتا ہے۔اس سے واقعاتی پس منظر کی قدامت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

صدر شعبہ جہاں دیدہ اور زمانہ شناس ہیں، لیکن ان کا رویہ استحصال پسندانہ نہیں وہ ندیم کو اکثر مفید مشورے دیتے ہیں۔ہوسٹل کے انتخاب اور رہائش سے لے کر کتاب کی اشاعت تک بلکہ وہ نویں پرچے کے لئے سفارشی خط بھی دیتے ہیں تو اس خط کو فروخت نہیں کرتے۔گویا وہ حقدار کے حق کی حفاظت کرنے کی مخلصانہ کاوش کرتے ہیں۔وہ ندیم کو مستقبل کا اردو پروفیسر دیکھنا چاہتے ہیں۔وہ اسے اس قابل سمجھتے ہیں اور وہ اسی نہج پر اسے استوار کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ان کی جوہر شناس نظریں لائق تحسین دکھائی دیتی ہیں۔

ہوسٹل میں جس طرز فکر کی جماعت سے وابستہ طلبہ سے ندیم کا سابقہ پڑتا ہے اور جس میں شامل ہونے کی اسے تحریک دی جاتی ہے، اس سے وہ متفق نہیں ہوتا۔ہوسٹل ہی کے قیام کے دوران کسی صوبہ میں

رائٹ ہونے کی خبر سن کر جس قسم کی سرگرمیاں وہاں دیکھنے کو ملتی ہیں، وہ بھی اسے ناگوار گزرتی ہیں۔ وہ اپنے طور پر انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہے:

''ہم ناانصافی اور ظلم کو ظلم ہی کی لاٹھی سے نہیں لڑ سکتے۔ (؟نہیں مٹا سکتے) چاہے اس کے لئے جو بھی نقصان اٹھانا پڑے، ہمیں برداشت کرنا پڑے گا، ہمیں برداشت کرنا ہوگا۔ اور یہی قوت برداشت ایک دن ہماری زبردست طاقت بن جائے گی۔'' (ص ۱۴۲)

اس اقتباس سے ناول نگار کے طرز فکر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اس میں دانشوری کا عنصر تلاش کیا جاسکتا ہے۔

ندیم کو ہوسٹل میں جس قسم وقماش کے ساتھیوں سے واسطہ پڑتا ہے، وہ ایک مخصوص طرز فکر کے حامل ہیں۔ وہ نماز باجماعت کا اہتمام کرتے ہیں بھیس بھوسے سے اپنی مسلمانی پر حرف نہیں آنے دیتے۔ لیکن طرز فکر اور طرز عمل سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے ماتھے کا کلنک ہیں اور وہ ندیم کو اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب کہ ندیم انہیں اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ندیم کی بات سن بھی لیتے ہیں لیکن اثرات قبول نہیں کرتے۔ اسی دوران ایسا موقع بھی آتا ہے جب انہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ یہاں جو واقعات وواردات اور مکالمات نظر آتے ہیں وہ ناول نگار کی سنجیدگی فکر کا نتیجہ ہیں۔ ناول نگار کا نقطہ نظر بھی بالکل واضح ہے۔

یہ ایک عام خیال ہے کہ ادب میں وہ تاریخی صداقتیں جلوہ افروز ہوتی ہیں جو تاریخ کے اوراق میں بھی نہیں ہوتیں۔ البتہ تاریخ کا امتیاز و اختصاص واقعات و واردات کے سن سے ظاہر ہوتا ہے۔ ''شکست کی آواز'' میں غالباً پہلی بار ایسی ایسی عصری صداقتیں رونما ہوئی ہیں جو پہلے یا تو بالکل ہی نہیں یا بہت کم ادب کا حصہ بنی ہیں۔ اردو کلچر اور اعلیٰ تعلیم اور فروغ اردو کے اداروں کی بدعنوانیاں اور بدکرداریاں جس انداز واسلوب میں یہاں دیکھنے کو ملتی ہیں وہ توجہ طلب ہیں۔ خود ندیم کا کردار بھی متاثر کن نہیں۔ دراصل ناول نگار نے اسے کوئی مثالی کردار بنا کر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ باوجود اس کے تمام تر کوتاہیوں اور کمزوریوں کے ساتھ اس کی سمت ورفتار روبہ ارتقا رہتی ہے۔

ندیم اردو کے افسانہ نگار اور پھر اردو کے لکچرار کی حیثیت سے منظر نامے پر ابھرتا ہے۔ وہ طالب علمی کے زمانے سے ہی افسانہ نگاری سے گہرا شغف رکھتا ہے۔ اسی لئے نصابی کتابوں سے اس کی دلچسپی کم ہی نظر آتی ہے۔ اس کی افسانہ نگاری بھی روایتی قسم کی ہوتی ہے جو جدیدیت کے رجحان سے میل نہیں کھاتی۔ اس کی گریجویشن کی ہم جماعت ناظمہ ہر چند کہ افسانہ نگار نہیں لیکن قاری کی حیثیت سے افسانے کا ستھرا مذاق رکھتی ہے اور ناقدانہ شعور سے بھی مملو نظر آتی ہے۔ وہ ذہین بھی ہے۔ وہ ندیم کی ذہانت اور اس کی افسانہ نگاری کی صلاحیت کو بھی اچھی طرح سمجھتی ہے اور ندیم کو جدید رنگ وآہنگ کی افسانہ نگاری کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی ندیم سے دوستی اور ہمدردی اظہر من الشمس ہے۔ اس کی بے لوثی غیر مشتبہ دکھائی دیتی ہے۔ اسے ندیم کے مقابلے میں مرکزی نسوانی کردار کے طور پر

پیش کیا جاسکتا تھا۔ اس میں اس حیثیت کی ساری خوبیاں موجود نظر آتی ہیں۔ وہ گریجویشن میں اول پوزیشن حاصل کرتی ہے لیکن وہ مغرور نہیں ہوتی، نہ وہ ندیم کو اپنے سے کم تر سمجھتی ہے۔ نصابی مطالعہ سے ندیم کی بے توجہی کو اپنی اس پوزیشن کا ذمہ دار سمجھتی ہے اور ندیم پر اپنے موقف کا اظہار بھی کر دیتی ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ ایم اے میں داخلہ نہیں لیتی۔

یہاں عبدالصمد نے ناظمہ کو تعلیمی سلسلے سے کاٹ کر روایتی معاشرے کے چہرے کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ معاشرتی جبر کی وجہ سے ہی اس کی تعلیم جاری نہیں رہ سکی ہے۔ اس کے والدین کو اس کی مزید تعلیم سے زیادہ شادی بیاہ کی فکر ہوتی ہے۔ یعنی روایت کی زنجیروں میں وہ بھی جکڑی ہوتی ہے لیکن روایتی قدروں سے نالاں اور برگشتہ بھی نہیں۔ ورنہ وہ بھی ایم اے کرنے کے بعد لکچرار ہو سکتی تھی اور خواتین لکچراروں میں نمایاں مقام بنا سکتی تھی۔ وہ ندیم کی منگیتر بھی بن سکتی تھی۔ گریجویشن کرنے کے بعد وہ منظر نامے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے وجود یا عدم سے ندیم کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ وہ ناظمہ کی قرب کی لذت سے کبھی محظوظ ہوا ہی نہیں، اور ان دنوں بھی اس کے دل ودماغ پر کبھی نوری اور کبھی اختری چھائی رہتی ہے۔

ندیم کا پس منظر ہر چند کہ زمین دارانہ اور جاگیردارانہ ہے لیکن ہے وہ گاؤں دیہات کا زائیدہ اور پروردہ۔ وہ تعلیم کے سلسلے میں شہر میں آکر ہونق تو نہیں لگتا لیکن گاؤں کی معصومیت اکثر اس کے کردار سے جھلک پڑتی ہے۔ شہری کلچر اور اس کے مزاج سے وہ اکثر ناآشنا دکھائی دیتا ہے۔ خود اعتمادی، خوددار یا وروضعداری کی صفات سے وہ متصف نظر آتا ہے۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران ایک پروفیسر صاحب جو اتفاق سے شاعر بھی ہیں اور شہرت بھی رکھتے ہیں، ندیم سے صرف اس وجہ سے برگشتہ وبرہم ہوتے ہیں کہ وہ خوشامد میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتا۔

پروفیسر صاحب کو معلوم ہے کہ ندیم افسانہ نگار ہے اور وہ خود شاعر ہیں۔ دونوں کے تخلیقی میلان میں اور دائرہ کار میں فرق ہے، اس کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب کے نزدیک ندیم کی حیثیت حریف کی سی ہے۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے اثر ورسوخ اور دائرہ اختیار کی دھونس بھی جما دیتے ہیں اور وہ بھی اس طرح جیسے وہی راقم تقدیر ہوں۔ ان کے رحم وکرم پر طلبہ کی پوزیشن کا فیصلہ منحصر ہو۔ وہ عملاً بھی ایسا کر گزرنے سے دریغ نہیں کرتے مگر ندیم اس لحاظ سے خوش نصیب ہے کہ صدر شعبہ اس گوہر یک دانہ کے قدردان ہیں۔ وہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ اگر انہوں نے ندیم کے حق میں دفاعی اقدام نہیں کیا تو اس بھولے بھالے طالب العلم کا حق مارا جاسکتا ہے۔ چنانچہ وہ ایم اے کے امتحان کے بعد نویں پرچے کی طرف ندیم کی توجہ مبذول کراتے ہیں جس کے مفہوم سے وہ قطعی ناواقف وناآشنا ہے، وہ ندیم کو اس کی باریکیوں اور پیچیدگیوں سے آشنا کراتے ہیں۔

عبدالصمد کے واقعیت شعارانہ شعور نے صدر شعبہ کا جو کردار پیش کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ دور میں بھی گنے چنے ایسے اساتذہ باقی ہیں جن سے شعبہ اردو کی آبرو اور وقار قائم ہے۔ ندیم کے کیریر میکنگ (Career Making) میں صدر شعبہ کا کردار نہایت ہی اہم دکھائی دیتا ہے۔ انہیں کے

سفارشی خط سے نویں پرچے میں ندیم اپنی پوزیشن محفوظ کر پاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے حریف پروفیسر اس کی پوزیشن الٹ دینے میں کامیاب ہو جاتے۔

صدر شعبہ کی ہی رہنمائی میں ندیم آگے کی منزلیں طے کرتا ہے۔ وہ افسانوں کا مجموعہ شائع کرانے کی ترغیب وتحریک دیتے ہیں تو ندیم صرفے کے سلسلے میں معذوری ظاہر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں بھی صدر شعبہ مفید مشورے دیتے ہیں اور اردو اکادمی سے اشاعتی امداد حاصل کرنے کا طریقہ بتاتے ہیں۔ کتاب کی اشاعت کا فائدہ بھی بتاتے ہیں کہ اس کی بدولت لکچراری ملنے میں آسانی ہوگی۔ ندیم ان کے ہر مشورے پر عمل کرتا ہے اور بعض اوقات تلخ تجربات سے بھی دوچار ہوتا ہے لیکن حوصلہ شکن نہیں ہوتا۔ اسے کامیابیاں بھی ملتی جاتی ہیں لیکن اس کی سب سے بڑی کامیابی اس کا لکچرار ہونا ہے۔ یہاں بھی صدر شعبہ کی معاونت کام آتی ہے۔ ایسی معاونتوں کے پس پشت صدر شعبہ کے مقصد کی کارفرمائی بس اس قدر دکھائی دیتی ہے کہ اردو کا ایک اچھا استاد یونیورسٹی سروس میں آجائے۔ ندیم کے حق کے ساتھ ساتھ اردو کے حق میں صدر شعبہ کا خیال اور عمل یہاں ناقابل فراموش دکھائی دیتا ہے۔ ان کے مقصد کی تکمیل ہوتی ہے اور ندیم مانگی مراد پاتا ہے۔ ندیم کے والد کا تو خیال تھا کہ دور حاضر میں اردو پڑھنے کا فائدہ کیا ہے، اردو پڑھنے والے احساس کمتری کے شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن افسانہ نویسی کے تخلیقی رجحان کی وجہ سے اردو ندیم کے ذوق سے ہم آہنگ تھی اس لئے اس نے اردو ہی میں کیریر بنانا مناسب سمجھا تھا لیکن وہ تعلیمی دور میں بحیثیت ایک افسانہ نگار ہی اپنا شناس نامہ مرتب کرنے کی طرف مائل رہا۔ اس نے لکچرار بننے کا خواب اپنی سوئی یا جاگتی آنکھوں میں نہیں پالا تھا۔ یہ خواب درحقیقت صدر شعبہ کی آنکھوں میں پلتا رہا تھا جس کی تعبیر، خواب سے حسین تر نکلی۔ ندیم لکچرار ہو گیا۔

عبدالصمد نے قصہ کے اس پیرائے میں اردو کے عام قارئین کو بالعموم اور اردو کے طلبہ کو بالخصوص متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اردو کی زبوں حالی میں ندیم کے حریف پروفیسر صاحب جیسے پروفیسران کو بھی آئینہ دکھایا ہے۔

ندیم لکچرار ہونے کے بعد شہر ہی میں فلیٹ لے کر رہائش اختیار کر لیتا ہے۔ پہلے اس کے والد پھر اس کی والدہ کا بھی انتقال ہو جاتا ہے۔ اپنی پشتینی حویلی سے وہ لاتعلق ہو جاتا ہے۔ اس کی دو وجہیں قیاس میں آسکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اب نوری اور اختری کا وجود وہاں مفقود ہے جبکہ ان کی یادیں اس کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ دوسری وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ نظر آنے والی جائداد مقروض ہے۔ وضع دار والد قرض پر گزارا کیا کرتے تھے اور بھاری قرض چھوڑ کر راہی اجل ہوئے تھے۔ والدین کے انتقال کے بعد ماسٹر صاحب حویلی کے مختار اور نگراں بن گئے تھے۔ اسی اثنا میں وہ ملازمت سے بھی وابستہ ہو گئے تھے۔ حویلی اور حویلی کی خادماؤں پر بھی ان کی حکمرانی قائم ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ انہوں نے ندیم کی لاپروائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حویلی کی جگہ اپنے طور پر مکانات بھی تعمیر کر لئے تھے اور بلاشرکت غیرے دولت خداداد کے مالک بن بیٹھے تھے۔ ندیم نے

یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لیکن احتجاج کرنا تو دور کی بات، اس نے چون وچرا تک نہ کی تھی۔ گاؤں سے سیدھے سادے واپس آ گیا تھا۔ اس کے رویہ سے یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ پشتینی حویلی کے جدید طرز کے فلیٹس میں گم ہو جانے کا اسے ملال ہوا۔ البتہ نوری اور اختری کے مفقود الوجود اور مفقود الخبر ہونے کا اسے بے حد ملال تھا اور اسی ملال کے ساتھ وہ شہر واپس آ گیا تھا۔ معزز خاندان سے تعلق رکھنے اور لکچرار بن جانے کے بعد بھی اس کا چھچھورا پن نہیں جاتا، دوسری طرف اس کی وضع داری بھی ساتھ لگی رہتی ہے۔

ندیم نے شادی نہیں کی تھی۔ اس نے کبھی ماں کی تمناؤں اور آرزوؤں کو ٹھکرا دیا تھا۔ اب ماں بھی اس دنیا میں نہیں رہی تھیں۔ اسے اس کا ملال بھی تھا۔ وہ کبھی کبھار اس احساس گناہ سے دوچار بھی ہوتا۔ لیکن ماں کے مرجانے کے بعد بھی ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کو پورا کرنے کی اس نے کبھی کوشش نہیں کی اور نہ اپنی نفسانی اور جنسی خواہشوں پر قابو پانے میں کامیاب رہا۔ ہوسٹل کے روم میٹ شہزادہ کی شادی اس نے دیکھی، دعوت ولیمہ میں بھی شریک ہوا اور اس کا دل مچل کر رہ گیا۔ عبدالصمد نے ندیم کی خواہش نفسانی اور جنسی خلش کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ نوجوان ملازمہ جولی کے ذکر سے وہ آتشہ ہو گئی ہے:

''دعوت ولیمہ کے بعد وہ واپس آیا۔ اس درمیان اس نے جولی کو آنے سے منع کر دیا تھا۔ مگر دو چار دنوں کی دوری اور شہزادہ کی شادی نے اس پر ایک عجیب اثر ڈالا۔ اس کے اندر ایک شدید قسم کا احساس محرومی عود کر آیا۔ وہ بھی شادی کر سکتا تھا، ایک خوبصورت، جوان عورت اسے بھی جیون ساتھی کی شکل میں مل سکتی تھی، پر اس نے تو اپنے چاروں طرف ایسی ان دیکھی دیواریں کھڑی کر رکھی تھیں جنہیں نہ تو وہ توڑ سکتا تھا، نہ پھلانگ سکتا تھا، اور عورت کا تصور اس کے ذہن وشعور کی ساری خالی جگہوں کو پُر کئے ہوئے تھا۔ اسے جو عورت بھی دکھائی دیتی، اپنی طرف کھینچتی ہوئی محسوس ہوتی۔ پہلی بار ایک جوان لڑکی اس کے خالی گھر میں آئی تھی جہاں صرف وہ تھا اور کوئی نہیں۔ وہ جیسے خلاؤں میں اڑنے لگا تھا۔ جذبات کی کوئی واضح شکل سامنے نہیں آئی تھی، مگر کچھ انجانے جذبات شدت سے اس کے اندر مچلنے لگتے تھے۔ وہ جولی سے کیا چاہتا تھا، اسے پتہ نہیں تھا۔ وہ نوری اور اختری سے بھی کیا چاہتا تھا۔''

ندیم کو شہزادہ کے علاوہ صدر شعبہ بھی سمجھاتے بجھاتے آرہے تھے کہ وہ شادی کر لے لیکن شاید اسے خواب وخیال میں گم رہنے سے کسی خاص قسم کی لذت محسوس ہوتی تھی۔ البتہ وہ جولی سے کبھی کبھار لگاوٹ کی باتیں کر لیا کرتا تھا۔ لیکن ایک دن جب یونیورسٹی میں چھٹی تھی اور وہ گھر ہی پر تھا۔ جولی کو غسل خانے میں نہاتے ہوئے غسل خانے کے باہری حصہ میں لگے ہوئے شیشے سے دیکھ لیا تھا اور غور سے دیکھنے لگا تھا:

''جولی کے جسم کے حصے شیشے پر ابھر رہے تھے، وہ دیکھ کر وہیں پر تھم گیا اور جلدی سے اس پوزیشن

میں کھڑا ہو گیا کہ اندر کے فرد کو پتہ نہ چلے کہ باہر کوئی موجود ہے۔

جولی کی صراحی دار گردن.....

سینے کی بڑی بڑی، سڈول گولائیاں.....

پرکشش کمر.....

سینے کی گولائیوں سے تھوڑا ہٹ کے، نہایت خوبصورت کولہے.....

لمبی سڈول رانیں.....

وہ شاید کچھ گنگنا بھی رہی تھی، جس سے اس کے جسم کی خوبصورتی ہم آہنگ ہو رہی تھی، شیشے کی دیواروں پر اس کا نسوانی حسن ایک چلتے پھرتے مجسمے کی طرح متحرک تھا..... مجسمہ ہل رہا تھا، گا رہا تھا اور دیکھنے والے کے ہوش و حواس گم کر رہا تھا۔''

عبدالصمد نے اس ناول کے بیشتر صفحات پر جنسی لذت اندوزی کے لئے ایسے برہنہ اور نیم برہنہ جلوے بکھیرے ہیں کہ دیکھنے والی آنکھ کی دھار کند ہو جائے۔ محولہ بالا اقتباس میں تو جولی کا جسم اور اس کے خدوخال دور کا جلوہ معلوم ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی کے ایک اکنامکس کے ریڈر ڈاکٹر سریش کے ساتھ تو وہ دور حاضر کے ماڈرن چکلے تک پہنچ جاتا ہے جہاں جسم فروشی کا کاروبار کارپوریٹ سیکٹر کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ نسوانی جسموں کے ایک سے ایک دل آویز خطوط دیکھنے کو ملتے ہیں، نفاست سے چلنے والا غلاظت کا کاروبار اس قدر حیرت میں نہیں ڈالتا جس قدر عبدالصمد کے قلم کی سمت و رفتار حیران کرتی ہے۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ایسے ایسے منظر تراشتے وقت خود عبدالصمد کن کیفیتوں سے دوچار ہوئے ہوں گے۔

اکنامکس کے ریڈر ڈاکٹر سریش کی دوستی ندیم کو خواب و خیال کی دنیا سے حقیقت کے جہان رنگ و بو میں پہنچا دیتی ہے تو وہ زندگی کی ایک نئی لذت سے سرشاری کی حد تک آشنا ہوتا ہے۔

سریش اپنے ساتھ ندیم کو لئے ایک شاندار کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں پہنچتا ہے دونوں کا استقبال گیسٹ کے طور پر کیا جاتا ہے۔ پھر رسمی آداب و تکلفات کے بعد دو نوجوان لڑکیاں سامنے لائی جاتی ہیں۔ ان میں ایک روزی ندیم کے حصے میں آتی ہے اور وہ ندیم کو لے کر اپنے کمرے کی طرف چل پڑتی ہے۔ ضیافت و تواضع کے بعد خاص مرحلہ آتا ہے۔ لیکن اس مرحلے سے پہلے ہی ندیم روزی کے جسم کا جائزہ لیتا رہتا ہے:

''روزی کا جسم بہت متناسب اور پرکشش تھا، تنگ کُرتے اور لاپروائی سے ڈالے ہوئے دوپٹے نے اسے بہت نمایاں کر دیا تھا، ہاتھوں کی نقل و حرکت سے سینے کی گولائیاں مچل رہی تھیں، کمر بل کھا رہی تھی۔ ندیم کوشش کر رہا تھا کہ اس کی نگاہیں اس پر یوں نہیں پڑیں کہ روزی کو محسوس ہو جائے۔ اس کی

نگاہیں ترچھی نہیں تھیں، روزی کے جسم کی رعنائیوں میں کھو رہی تھیں۔'' (۲۸۶)

''کسے کسے کولہے اور ان میں پڑنے والی جنبش نے اس کی ساری سوچ اور سارے اندیشہ ہائے دور و دراز کو درکنار کر دیا، آنکھوں میں بس ایک ہی خواہش جاگ اٹھی۔

روزی کو چھونے کی خواہش.....

روزی کو دبوچنے کی خواہش.....

تمام خواہشوں کی جمع بس ایک خواہش.....روزی۔

روزی غسل خانے سے واپس آ کر بستر پر لیٹ گئی اور اس کی طرف شوخ، سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ ندیم کی نگاہیں جھک گئیں، اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔'' (ص: ۲۸۷)

لیکن تھوڑی ہی دیر میں روزی کے مخمور لہجے نے اسے سب کچھ سمجھا دیا تھا:

''روزی کا لہجہ شوخی سے کھنک رہا تھا، وہ بری طرح شرما گیا۔

اچانک روزی چھلانگ مار کر بے دھڑک اس کی گود میں جا بیٹھی۔ اس نے اپنے دہکتے ہوئے ہونٹ اس کے جلتے ہونٹوں پر رکھ دئے، ہاتھ ندیم کے جسم پر عجیب انداز میں رینگنے لگے۔ وہ جیسے اس میں پیوست ہوئی جاتی تھی۔ ندیم پوری طرح اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

سارے حواس پر بس ایک ہی چیز طاری ہو گئی.....روزی۔

ہڑبڑا کر وہ اٹھ بیٹھا۔ وہ مکمل برہنہ تھا۔ جسم پر ایک کپڑا بھی نہیں تھا۔ وہ بوکھلا گیا، بستر ہی پر روزی بھی بالکل عریاں، بدحواس سوئی ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے پائنتی رکھی چادر کھینچ کر اپنے عریاں جسم کو ڈھک لیا۔ دوسری چادر نہیں تھی، اس نے اسی چادر میں روزی کی عریانیت کو بھی چھپانے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں روزی کا ننگا جسم اس کے جسم سے مس ہو گیا تو اسے اپنے اندر بجلی سے دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ زندگی میں پہلی بار ایک جوان جسم اس کے اتنا قریب تھا، وہ بھی بالکل برہنہ.....وہ دیر تک اس جسم کو نہارتا رہا، اس کے ایک ایک انگ کو دیکھتا رہا، جی نہیں بھر رہا تھا بلکہ تشنگی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔'' (ص ۲۸۸-۲۸۷)

اور جب یہ تشنگی حد سے گزر جاتی ہے تو یہ کیفیت دکھائی دیتی ہے:

''اس نے روزی کی کمر پر ہاتھ رکھا۔ عجیب لذت کا احساس ہوا۔ اس کی انگلیاں کانپنے لگیں۔ ان کانپتی ہوئی انگلیوں کو اس نے اس کے سینے کے ابھاروں پر رکھا۔ سرور و لذت کا ایک پہاڑ (حصار) اسے اپنی آغوش میں لینے کو بے تاب تھا۔ اس کی نگاہیں روزی کے سنترہ کی قاشوں جیسے ہونٹوں پر پڑیں، اس نے انہیں بھی چھوا، یہاں ایک علیحدہ لذت اس کی منتظر تھی۔ پھر اس کے ہاتھ روزی کے جسم پر بیتابانہ دوڑنے لگے۔ وقت اپنی چال

بھول چکا تھا، زمان ومکان کا فرق مٹ چکا تھا۔ اسے بالکل یاد نہیں تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہے اور کیوں ہے؟

روزی نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اپنے آپ کو برہنہ پا کر اور ندیم کی انگلیوں کی سرسراہٹ کو محسوس کر کے وہ کسمسائی، پھر نہایت ہی شوخ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

'ایک دم پھاڑ ہی کھانے کا ارادہ ہے کیا؟'

اس کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکلا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔'' (ص:۲۸۸)

محولہ بالا اقتباسات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مقام خاص کی سیر کے مراحل عبدالصمد نے بڑے ہی فنکارانہ سلیقے سے طے کئے ہیں۔ اشاریت اور ایمائیت اور علامتوں کے سہارے رمزیت اور سریت یا اسرار نہانی پر پردے کھینچے ہیں۔ لیکن یہ طے ہے کہ جنسی لذت اندوزی میں کوئی کمی نہیں آنے دی ہے۔ اس ناول میں ایسے ایسے نہ جانے کتنے مناظر اور مراحل سے قاری کو گزرنا پڑتا ہے اور اس دوران اس کے احساسات وجذبات مشتعل ہوتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر سریش کی دعوت کام ودہن اور ضیافت بدن سے سرشار ہونے کے بعد ندیم کو چسکا سا لگ جاتا ہے اور وہ جنسی پیاس لئے ادھر ادھر مارا مارا پھرتا ہے۔ وہ اونچی سطح سے نچلے معیار تک اتر آتا ہے کیونکہ وہ صرف تنخواہ پر بسر کرتا ہے۔ اردو کا لکچرار ہے۔ ڈاکٹر سریش جیسی اس کی فاضل آمدنی نہیں۔ اس لئے روایتی چکلے تک سے گریز نہیں کرتا اور پھر نہ جانے اسے کون سا روگ لگ جاتا ہے کہ ایک دن اچانک مر جاتا ہے۔ اس طرح گمشدہ حویلی کے ناشناس وارث کا حسرتناک انجام سامنے آتا ہے۔

عبدالصمد کے کئی ناولوں میں زمیندارانہ، جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کے ساتھ ساتھ حویلی کی بد حالی کا بھی ذکر آتا رہا ہے اور خستہ حالی بھی دکھائی دیتی رہی ہے۔ یہ غالباً عبدالصمد کا ناسٹلجیا ہے اور یہی غالباً ان کا تخلیقی محرک بھی۔ اس ناول میں بھی وہ غالباً ایک زمیندار وجاگیردار گھرانے اور حویلی کے بے نام ونشان ہو جانے کا قصہ پیش کرتے ہیں۔ اصل وارث کی نااہلی یا بدعملی کی وجہ سے مورث کا ترکہ محفوظ نہیں رہ پاتا اور اکثر دولت جائداد اور حویلی پر خانہ زادوں کا قبضہ ہو جاتا ہے اور وہ خانہ زاد یا ان کے وارث رئیسانہ شان سے زندگی گزارتے ہیں۔ اس ناول میں ماسٹر صاحب کے عیش کے دن اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

عبدالصمد ''شکست کی آواز'' میں واقعات وواردات کے محض ناظر ہی نہیں بلکہ منظر نگار بھی دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے ایسے ایسے منظر تراشے ہیں، جو نوجوان دلوں کی دھڑکنیں تیز کر دیں۔ یہی اس ناول کا غالباً سب سے نمایاں وصف اور خوبی ہے۔

◂◂ ● ▸▸

P.G. Head, Deptt, of Urdu & Persian
A.N. College Patna Mob: 9431840245

● **اعتراف**

● **پروفیسر علی احمد فاطمی**

انحراف اور احتجاج کے افسانے

زندگی کے پیچ وخم اور کیف وکم کو سمجھانے یا سمجھنے کی کوشش کرنا یا اس کی اصل حقیقت وماہیت تک کی رسائی کا عمل ایک تجسس وتلاش کا عمل ہے اور تجسس وتجزیے سے پُر تلاش حقیقت کا عمل دراصل ایک جمالیاتی عمل ہے جس میں عرفان وشعور، ادراک وآگہی کے ایسے عناصر کام کرتے رہتے ہیں جو باطنی اور خارجی مظاہر میں مُدغم ہو کر علم وفکر، خیال اور جمال کی ایک نئی دنیا آباد کرتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ تلاشِ حقیقت خود ایک عمران و جمالیاتی عمل ہے۔ یہاں میں یہ عرض بھی کرتا چلوں کہ جمال یا احساسِ جمال کو میں محض داخلی تجربہ یا باطنی احساس نہیں مانتا۔ داخلیت ایک نقطۂ آغاز تو ہو سکتی ہے لیکن خارجی مظاہر اور سماجی آزار وآثار کے بغیر اس کی تکمیل وتشکیل ممکن نہیں۔ سماجی آزار وآثار کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ خارجی بھی اور داخلی بھی۔ یہ الفاظ دیگر حقیقتوں کے ایک روپ ہوا کرتے ہیں جن میں ایک حقیقت دلت کا بھی ہے۔ یوں تو دلت اور غیر دلت کے مسائل ہمیشہ سے رہے ہیں لیکن ان کے کچھ دائرے تھے اور زاویے بھی۔ ان دائروں کو غیر دائروی انداز سے سمجھا بھی گیا اور خوب خوب لکھا گیا لیکن اب جب کہ دلت سماج کا کچھ حصہ پڑھ لکھ چکا ہے اور ادب کی تشکیل وتخلیق میں بے باکانہ طور پر مصروف ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اصلی اور سچا دلت ادب وہی ہے جو دلت ادیب خلق کرے اور اپنے خون جگر سے رقم کرے۔ جس نے اس دردوکرب کو براہ راست برداشت کیا ہے۔ غیر دلت ادیب دردوکرب کی اس تڑپ اور حقیقت کو سمجھ ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ دور کا تماشائی ہے اور اس کی ہمدردی خارجی اور ظاہری ہے۔ بظاہر یہ بات منطقی سی لگتی ہے لیکن ادب کی تخلیق کے لیے غیر منطقی سی بھی لگتی ہے۔ اس لیے کہ تخلیقِ ادب کے لیے آج تک سائنس اور تکنیکی فارمولے ایجاد نہیں ہوئے ہیں۔ وہ کبھی بلکہ اکثر غیر سائنسی اور غیر منطقی ماحول میں پیدا ہوتا ہے۔ ناہموار و ناموافق ماحول میں بڑے تخلیق ہو جایا کرتی ہے۔ ۱۸۰۷ کا انقلاب ہو یا ۱۹۴۷ کی تقسیم وفسادات۔ اس انتشاری و بحرانی ماحول میں جو ادب خلق ہوا اس کی تاریخی حیثیت وعظمت سے کون انکار کر سکتا ہے۔

دلت مسائل سے متعلق دلت ادب کو لے کر بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے۔ اصل دلت وہی ہے جو صرف دلت لکھے دوسرے ادیب دلت مسائل پر نہ لکھیں اور لکھیں تو وہ غیر حقیقی ہوں گے۔ یہ بات نا قابل قبول سی لگتی

ہے.....اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ماحول اور سماجی قوتیں تبدیلی کے ساتھ نئے انسانی رشتوں اور نئی قدروں کی نشاندہی کرتے ہیں اور نئے سماجی شعور سے ذہنی غذا حاصل کرتے ہیں کہ اس شعور اور وژن کے بغیر تخلیق تھوڑی دیر کے لیے خوبصورت تو ہو سکتی ہے لیکن بڑی نہیں۔ بڑا ہونے کے لیے اسے پریم چند کی راہ سے گذرنا ہوگا بلکہ پریم چند بننا ہوگا۔ تھوڑی دیر کے لیے دلت ادیبوں و دانشوروں کی اس منطق کو مان بھی لیا جائے اور تخلیق کی غیر منطقی شرط کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو سوال اُٹھ سکتا ہے کہ دلت ادب میں اب تک پریم چند کے قد کا ادیب کیوں نہیں پیدا ہو سکا۔ اچھے اور بڑے ادب کے لیے صرف درد و کرب کا فن نہیں صرف سوزِ دروں بھی کافی نہیں۔ ذہن اور وژن بھی درکار ہوتے ہیں۔ اس کی سب سے اچھی مثال میر اور غالب کے مابین کی ہے۔ میر تقی میر کے سوزِ دروں سے ایک مخصوص سوز و گداز ضرور پیدا ہوا اور جس کے بطن سے عمدہ شاعری بھی ہوئی لیکن وہ غالبؔ کی طرح عظیم نہ بن سکے۔ اس لیے کہ حیات و کائنات کے تئیں ان کا سماجی و معروضی وژن غالب کے مقابلے کمزور تھا۔ آخر کوئی تو بات ہے کہ جب پریم چند نے لکھنا شروع کیا اور رومانی افسانہ نگاروں کی ایک جماعت ان کی مخالفت اور قدیم رومانی روایت کے تحفظ میں صف آراء ہوئی لیکن پریم چند کی سی شہرت و عظمت کسی کو حاصل نہ ہو سکی۔ قصہ مختصر یہ کہ ادب کے معاملات سماجیات اور سیاسیات کے شعبوں سے قدرے الگ ہوا کرتے ہیں اور اس کا کوئی ٹھوس فارمولہ یا پہاڑا نہیں ہوا کرتا۔

یہ بظاہر غیر ضروری اور غیر منطقی سی گفتگو میں نے اس لیے کی ہے کہ پیش نظر مسودہ میرے عزیز دوست اور ممتاز ترقی پسند افسانہ نگار و ناول نگار احمد صغیر کا دلت افسانوں سے متعلق ہے اور اردو میں باقاعدہ دلت کہانیوں کے دو ایک انتخابات تو ہوئے ہیں لیکن کوئی مکمل کتاب جو محض دلت افسانوں سے متعلق ہو میری نظر سے نہیں گزری۔ اس لیے بطور تمہید دلت ادیب و ادب سے متعلق یہ سرسری گفتگو ضروری سی تھی۔ اب میں براہ راست ان کی کہانیوں پر گفتگو کروں گا۔

اس مجموعہ کی پہلی کہانی ''تعفن'' ہے۔ عنوان سے ظاہر ہے۔ دلت اور تعفن۔ ساتھ ہی بوسیدہ اور گندی بوتلیں۔ ٹین کے ڈبے۔ شیشے کے ٹکڑے اور لالٹین کی مدھم روشنی۔ آدھا کچا اور آدھا پکا کھانا اور بورے پر سو جانا۔ دلت زندگی کے معنی خیز اشارے ہیں۔ ظاہر ہے کہ زندگی میں دکھ درد تو ہوگا خواہ منوا ہو یا دھنوا لیکن خواب تو بوریے پر بھی دیکھے جا سکتے ہیں لیکن خواب اور حقیقت میں ایک بے رحم و سفاک رشتہ بھی ہوتا ہے کہ خواب دیکھنا ایک فطری عمل ہے اور خوابوں کا ٹوٹنا سماجی عمل اور دلت معاشرہ تو اور بھی بکھرا اور شکستہ لیکن اس کہانی میں پرانا دلت ایک نو آبادیاتی سماج سے بھی دوچار ہے۔ منوا پر مسز ملکانی کی مہربانی اور اٹھتا ہوا سوال ——— ''اس عورت سے کیا رشتہ ہے میرا؟ یہ عورت مجھ پر اس قدر مہربان کیوں ہے؟'' یہ سوال یا یہ تجسس کہانی کا اصل حال ہے۔ مرکزی خیال ہے اور دوسری طرف مسز ملکانی کی صورت حال۔ ممتا کا جال یا کچھ اور..... کہانی کی ساخت اگرچہ سادہ سی ہے لیکن رفتہ رفتہ منوا کے کردار سے زیادہ اہم ہو جاتا ہے مسز ملکانی کا کردار جو تجسس، تحیر کے رنگ میں ابھرتا ہے اچھی بات یہ ہے کہ اسی تجسس پر کہانی ختم ہوتی ہے۔ ممتا اور محبت کا ایک انوکھا عکس ابھرتا ہے اور جو منوا کو مدہوش کر جاتا ہے۔

مصنف نے اس بے ہوشی کو بھی ایک معنی دیے ہیں کہ ایک دلت کردار کچرے میں جینے والا بچہ خوشبو کا عادی نہ تھا۔ اسے خوشبو میں گھٹن محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ سڑانڈ کی طرف بھاگنا چاہتا ہے۔ انسانی رشتوں میں بندھا ہوا طبقاتی تفریق کا یہ بلیغ اشارہ کہانی میں بڑے سلیقہ سے ابھرتا ہے اور اسے کئی جہات والعباد سے دوچار کرتا ہے۔ مختصر سی کہانی میں مختصر سایہ تاثر روایتی کہانی سے الگ کر جاتا ہے۔

''انا کو آنے دو'' میں پھلمتیا ہے۔ کردار تو اور بھی ہیں لیکن فسادات میں مارے گئے بچی ہے صرف پھلمتیا۔ اکیلی۔ دلت بیداری کی مہم۔ انا کا کردار۔ کہانی فلیش بیک میں چلتی ہے۔ مزاحمت و احتجاج۔ آسمان کی سرخی۔ سرمئی اندھیرا۔ ان سب کے فنکارانہ آمیزشوں سے دلت سماج کی بے بسی و بیداری کے عکس ابھرتے ہیں لیکن انا امید کی کرن ہے لیکن اس کو بھی لمبے اور گہرے اندھیروں کا سامنا ہے اور سوال ''کیا اکیلا انا اس نظام کو بدل دے گا؟'' سوال اہم ہے لیکن کہانی کے بطن سے پھوٹتا تو تخلیقیت متاثر نہ ہوتی اور تاثیر میں کمی نہ آتی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ برہنہ مسائل اکثر راست گوئی پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ کہانی کار کا کم موضوع کا زیادہ ہوا کرتا ہے۔ پھلمتیا تمام مظالم سہتی رہی لیکن یہی کہتی رہی کہ ''انا کو آنے دو.....آنا کو آنے دو.....'' انا ایک کردار نہیں ایک احتجاج ہے۔ انقلاب ہے جسے کہانی کار کی مثالیت کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

''ڈوبتا ابھرتا ساحل'' میں سگنی ہے ایک کم عمر لڑکی جو اسکول جانے کے بجائے داتون بیچتی ہے۔ غریب اور کمزور سگنی جس کی زبان بند رہتی ہے اور آنسو بولتے رہتے ہیں لیکن انہیں آنسوؤں نے اسے سخت جان بھی بنایا تھا کہ آنسو زندگی کی بیڑی نہ بننے پائیں۔ زندگی میں زنجیروں کا بھی الگ رول ہے۔ یہ جملے دیکھئے:

''وقت کی زنجیروں میں ہر شخص گرفتار ہے۔ کوئی زنجیر توڑ کر نکل جاتا ہے۔ کوئی زندگی بھر اسی میں گرفتار رہتا ہے۔ کوئی زنجیر خود پہن لیتا ہے اور کسی کو وقت پہنا دیتا ہے۔ وقت ہر لمحہ ایک زنجیر جوڑتا رہتا ہے۔ ایک سرا کبھی دوسرے سے نہیں ملتا۔ حالانکہ اس سرے کا پتہ لگاتے لگاتے انسان موت کی زنجیر اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے۔''

جھونپڑی میں آگ۔ ماں باپ کی موت اور پھر یہ جملے:

''دکھ کا کوئی نام نہیں ہوتا دکھ تو بس دکھ ہے۔ دل سے آنکھوں تک ہی دکھ ہے۔ دکھ کی وجہ سے ہی آنکھیں ساون بھادو بن جاتی ہیں۔ دل رونے لگتا ہے مگر دکھ نہیں پگھلتا۔

لیکن بے رحم سے بے رحم انسان کبھی کبھی پگھل بھی جاتا ہے۔ جیسے اس کہانی میں بے رحم سپاہی پگھلتا ہے اور وہ سگنی سے سنگیتا بن جاتی ہے۔ اسے ایک نام مل جاتا ہے۔ لیکن انسان کا کام آسانی سے نہیں مرتا لیکن کہانی کا کلائمکس کہانی کو بے حد اہم اور معنی خیز بنا دیتا ہے اور جگا، بابو گوپی ناتھ جیسی بڑی کہانیوں کی یاد دلا جاتا ہے۔

''پیاسی ہے زمیں پیاسا آسماں'' میں منکی ہے جس کا تعارف یہ ہے:

''منکی کے وقت کا سورج بوڑھا ہو چلا تھا۔ وہ وقت کے سورج کی تیز دھوپ میں برسوں سے تپ رہی تھی۔''

منکی کا بچہ دودھ سے تڑپتا رہتا ہے اور عقیدت مند ان گنیش جی کی مورتی کو دودھ سے نہلاتے رہے۔ زندگی کا' اعتقاد کا ایک معنی خیز تضاد۔ ایک انوکھا رنگ۔

''فصیل شب میں جاگتا ہے کوئی'' میں کارومانجھی ہے۔ فضا میں اداسی ہے لیکن اس اداس وتاریک ماحول میں یہ تخلیقی جملہ ملاحظہ کیجئے..... ''لالٹین کی مدھم روشنی صحن میں اس طرح پھیل گئی جیسے بھوکے آدمی کے پیٹ میں روٹی کے چند نوالے چلے گئے ہوں.....'' لیکن کہانی مزاحمت واحتجاج کے نئے راستوں پر چلی جاتی ہے۔

''پناہ گاہ'' میں لکھمنیا ہے جہاں یہ جملہ ہے..... ''ہمرا مقدر ہی خراب ہے بیٹی۔ ہم بدنصیب ہیں۔ اور یہ سوال بھی..... ''سارے دکھ ہم غریبوں کے ہی قسمت میں کیوں لکھ دیا گیا ہے؟''

سوالات اور بھی ہیں خیالات بھی اور کہیں کہیں جوابات بھی۔ جوابات کی شکل آج کی بدلتی ہوئی صورت حال ہے۔ دلتوں کا جلال ہے جواب کئی شکلوں میں دکھائی دیتا ہے۔

کہانیاں اور بھی ہیں مسائل کے اردگرد..... سادہ لیکن بامقصد اور پراثر دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی اثر انگیزی اس کی روایت پرستی میں ہے۔ کوئی چاہے تو اعتراض کرسکتا ہے کہ اب دلتوں کے بھی وہ مسائل نہیں رہے جو آج سے سو پچاس برس قبل تھے۔ یہ سچ ہوسکتا ہے لیکن ہندوستان جیسے ملک میں جہاں آج بھی اندھیرا ہے' اندھ وشواس ہے اور جبر وجہل کا کھیل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب اس کھیل کی نوعیت بدل گئی ہے۔ طریقۂ استحصال بھی بدل گیا ہے لیکن انسان اور انسان کے درمیان تفریق اور تعصب کا کھیل آج بھی جاری وساری ہے۔ اس لیے کہ طاقت اور ناطاقت کا کھیل ہمیشہ چلتا رہتا ہے۔ اچھی بات یہی ہے کہ مصنف نے بعض کہانیوں کو دلت مسائل کے ساتھ ساتھ نکسلائٹ کے مسائل سے بھی جوڑ دیا ہے۔ بلکہ بعض کہانیوں میں نکسلائٹ کا ہی مسئلہ ابھرتا ہے۔ دلت غائب ہوجاتا ہے۔ مثلاً ''بے پناہ جنگل اور وجود'' اس کہانی میں مسلم کردار ہیں۔ مولوی لیاقت علی۔ آمنہ اور علی عباس۔ رات کا اندھیرا اور نکسلائٹ کا گھیرا لیکن ساتھ میں یہ جملہ بھی ہے..... ''سوچ کی روشنی بلند ہوتی ہے اور دور دور تک ایک لمبی لکیر بناتی ہوئی گزر جاتی ہے اور کہانی اس کشمکش پر ختم ہوتی ہے۔

''قانون کے وعدوں پر بوڑھا ہو جائے یا خود کوئی قانون بنائے۔''

کلائمکس میں سوال۔ سوال در سوال کہ یہیں سے فکر وخیال کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور سچ پوچھئے تو فکر وفلسفہ سے ہی کہانی اور افسانہ بنتی ہے۔ لارنس نے غلط نہیں کہا تھا کہ فکشن جب تک فلسفہ نہ بن جائے بڑا فکشن کہلائے جانے کے لائق نہیں ہوتا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ہر واقعہ ضروری نہیں ہے کہ عمدہ کہانی بن جائے جب تک کہ کہانی کار کا اپنا ذہن اور وژن شاملِ فکر وفن نہ ہو۔ احمد صغیر ترقی پسند ادیب ہیں اس لیے حیات ومعاشرہ کے تئیں ایک نظریہ رکھتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں یہ نظریہ ورویہ خارجی سطح پر زیادہ دکھائی دیتا ہے جبکہ نظریہ کو تحلیل ہوکر فنکارانہ

تجسیم میں جذب ہوجانا چاہئے۔ اس عمل میں ایک تخلیقی حقیقت یا افسانوی حقیقت بھی ابھرتی ہے جو حقیقت کو وجدان میں بدلتی چلتی ہے کہ خالص حقیقت نگاری سے افسانہ کی ترسیل وتفہیم آسان اور جلد ضرور ہوجاتی ہے لیکن تخلیق میں گہرائی اور تہہ داری مشکل سے پیدا ہو پاتی ہے۔ یہ افسانوی حقیقت بہ الفاظ دیگر درمان اور وجدان ہی اسے دور تک لے جاتا ہے۔ جہاں ایک طرف یہ ضروری نہیں کہ ہم ایک بہتر اور حسین زندگی کا خواب دیکھیں اور زندگی ویسی ہی میسر ہو جائے اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ زندگی اور حسن یعنی جمال کا کوئی ایسا میکانیکی رشتہ قائم ہوجائے کہ زندگی حسین تو ہو جائے اور اس سماج میں اس کا عکس بھی اتنا ہی حسین ہو' اس لیے زندگی کا عمل بھی میکانیکی نہیں ہوتا اور چونکہ ادب زندگی کا آئینہ اور عکس ہوتا ہے۔ اس لیے ادب میں بھی اس طرح کا میکانیکی عمل نہیں ہوا کرتے۔ ان سب کے باوجود ایک بہتر زندگی کا خواب دیکھنا ہر انسان کا فطری عمل ہے اور افسانہ نویسی فکری وتخلیقی عمل۔

احمد صغیر کی یہ کہانیاں حقیقت سے زیادہ قریب ہیں حالانکہ جا بجا رومانی وتخلیقی جملوں اور عنوانوں نے اسے بڑی حد تک افسانوی فضا بنائی ہے تاہم ان کی ترقی پسندی' سماجی وابستگی نے بڑے خلوص واہتمام سے اسے جذب و پیوست کیا ہے۔ اس لئے کوئی چاہے تو اسے اکہری یا جامد حقیقت کہہ سکتا ہے جبکہ حقیقتیں سیال بھی ہوا کرتی ہیں اور پیچیدہ بھی۔ کہیں ماسٹر بدکردار ہوجاتا ہے اور کہیں بددماغ مالکن پر ممتا غالب آجاتی ہے اور کہیں ظالم اور سخت پولس والا اچانک نرم اور رحم دل ہوجاتا ہے۔ کرداروں کے ان متضاد رویوں سے انسان کی بوالعجبی تو ظاہر ہوتی ہے۔ کہانی کا تاثر بھی دلچسپ اور معنی خیز ہوکر زندگی سے جڑ جاتا ہے۔ اس عمل کو پیش کرنے میں صغیر خاصے کامیاب ہیں۔ دلت اور غریب طبقہ سے وابستہ یہ کہانیاں فن اور تہذیب کے اعتبار سے جس معیار کی بھی سمجھی جائیں لیکن فنکار کی صداقت اور زندگی کی حقیقت سے الگ کرکے دیکھ پانا مشکل ضرور ہے۔ ان کہانیوں میں انسانیت بالائی سطح پر تیرتی نظر آتی ہے اور انسانیت سے بڑی کوئی شے نہیں' اس کا اپنا جمال ہوتا ہے اور جلال بھی۔ دلت پر لکھنا یوں بھی آسان نہیں۔ ایک اردو افسانہ نگار کے لیے ایک مسلمان کے لیے بطور خاص اس لیے خالص دلتوں اور غریبوں کے خشک وغیر دلچسپ مسائل پر افسانے لکھ کر احمد صغیر نے جرأت وجسارت کا کام تو کیا ہی ہے یہ افسانے احتجاجی تو ہیں ہی انحرافی بھی ہیں۔ بہت پہلے پریم چند نے بھی انحراف کیا تھا تو ان کے خلاف احتجاج ہوا تھا۔ آج صورتِ حال بدل ضرور گئی ہے لیکن ہم اندر سے آج بھی فیوڈلزم سے زیادہ الگ نہیں ہیں اس لیے ان کہانیوں کی قبولیت میں رخنے آسکتے ہیں لیکن ان کی انحرافی واحتجاجی کیفیت سے انکار نہیں کرسکتے کہ یہی کیفیت اور خاصیت ہی ان کہانیوں کو پڑھوائے گی اور اس کی انسانیت ہی اسے زندہ رکھے گی۔ اس جسارت کے لیے احمد صغیر یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں۔

◀◀ ● ▶▶

Department of Urdu
Allahabad University, Allahabad 09415306239

● اعتراف

● ڈاکٹر اقبال واجد

راشد طرازؔ کا کارِسخن

راشد طراز کا کارِسخن اپنی نوعیت' عرض' اثبات اور عمل میں ہمارے سامنے ایک ایسا تخلیقی محاذ کھولتا ہے جو دیدہ وری کو اس کے معیار تک پہنچاتا ہے اور شعرِ عصر کی شناوری میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ حسن' ارادہ' تخلیق کی حکمتیں' کائناتی تحیّر' زمانہ' توقیر آدم' حکمت و دانائی اور گردش شمس و قمر کی تمام رنگت اور حکایت کے تمام مضامین نے ان کے اشعار میں خروج کیا ہے۔ وہ ہمیشہ طویل القامت ارادوں اور افعال کو اپنا ہدف بناتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ انہوں نے ۸۰ء کے بعد اردو شاعری کے ایوان میں ایسے قمقمے روشن کئے ہیں جو اس سے پہلے نہیں دیکھے گئے۔ (غرب) وشرق کے شعری تناظر میں راشد طراز کا امتیاز ان کا وہ وجدانی اسلوب شعر ہے جو ان کی پوری شاعری میں آہستگی کے ساتھ رقصاں نظر آتا ہے۔ یہ وجدانی اسلوب ہی ہے جو ان کو ہم عصروں سے جدا بھی کرتا ہے۔ وہ اپنی شعری تراکیب اور اشاروں میں ہمیں ایسے تجربات سے دوچار کرتے ہیں جو شعر و سخن کے تناور درختوں کے گرد حمائل ہیں اور اسی کے ساتھ فروغ حسن اور توزیع مسرت کو شاخوں کی طرح پھیلاتے ہوئے نہال سخن کی آبادکاری و شادابی میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ان کے کارِسخن سے مسرت اور بصیرت کا ایک ایسا نادر الوقوع ممنوعہ پیدا ہوتا ہے جو شعری شناخت کے نئے جواہر اور نئی حکایات کا ضامن بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ صرف گداز راہوں کے مسافر نہیں ہیں بلکہ ایسے احساسات اور جذبات سے بھی گذرتے ہیں جو ابھی زیرِ تعمیر ہوں اور نئے' انوکھے اور جدید قسم کے نوخیز نادیدہ حوالوں سے سرشار ہو رہے ہوں۔ اسی لئے ان کی شاعری کا مطالعہ ہمیں دیدہ و نادیدہ حوالوں اور اظہار و بیان کے خفیہ اشاروں سے بھی ہمکنار کرتا ہے اور بسط و سرور کی مجوزہ شعری تلبیسات سے لطف اندوز ہونا بھی سکھاتا ہے۔ راشد طراز کی شاعری اپنی تاثیر اور طرز میں شعری جہات کے نئے چشمے جاری کرتی ہوئی آگی بڑھتی ہے۔ یہ ایسے مقام کی رنگت سے ہمیں آشنا کرتی ہے جو کسی پیرائے کی محتاج نہ ہو بلکہ اپنی دلکشی اور معیار کے ئے ہمیشہ نئے نشانات تلاش کرتی ہو۔ ان کی شاعری کا مطالعہ ذہن و روح کے متعلقات اور علائق پر گہری ضرب لگاتا ہے۔ پھر شاعری کو سمجھنے کا ایک رضا کارانہ جذبہ بھی

پیدا کرتا ہے جو اپنے اعتبار اور قیاس کے ساتھ قائم رہتے ہوئے شعری حدود متعین کرتا ہے۔ راشد طراز کا تخلیقی معرض ایسے فنی اعتبارات پیدا کر رہا ہے جو اپنے شعری حسن اور تمازت میں کئی حیثیتوں میں ممتاز ہے۔ انہوں نے شاعری میں ایسے طریق کا انتخاب کیا ہے جو ابتدائی مرحلوں میں مجحوب اور منتہائے نظر میں مکشوف ہے۔ کشف ذات ہو یا کشف کائنات یا حیات و ممات کا کوئی بھی مسئلہ ہو راشد طراز کی شاعری میں منتہائے نظر کے بعد ہی تفہیم کے امکانات روشن کرتا ہے۔ یہاں سے تفہیم کے کئی راستے نکلتے ہیں اور تفہیم کا ایک راستہ ان کے یہاں خاموشی کی طرف بھی نکلتا ہے جہاں زبان سے کچھ اظہار خیال کرنے کی بجائے انسان خاموش رہ کر بصیرت کے مدد سے لذت حاصل کرنا چاہتا ہے' اس لئے کے اس بات پر شرح صدر ہے کہ خاموش رہ کر جو وجدانی لذت حاصل ہوتی ہے وہ بولنے کے عمل میں کم ہو جاتی ہے۔ گویا راشد طراز کی کی شاعری کے مطالعہ سے بعض مقامات پر ہم اتنا بے خود ہو جاتے ہیں کہ ذہن اس وقت ایک طرح کی عارفانہ لذت میں ڈوب جاتا ہے اور اس مدہوشی میں ایک قفل سا محسوس ہوتا ہے جیسے اس وقت کوئی چیز ذہن میں نہ آسکتی ہو اور نہ جاسکتی ہو' بس ایک عجیب سرور آگیں لذت ہو جس نے سب کچھ بھلا کر دیا ہو۔ یہ ان کی شاعری کی وہ تمجید ہے جو کسی مثال کے بغیر قائم ہوتی ہے اور تمام معاصر شعری رویوں کو اپنی عظمت میں ڈھانپ لیتی ہے۔ شعری حسن اور تمازت کے درمیان اپنی تخلیقی بلندیوں کو چھوتے ہوئے راشد طراز شعری سرزمین کے ایسے مکینوں کے پاس سے بھی گذرتے ہیں جو شاعری کی مدح میں بلند و بالا صداقتوں اور شعری تماثیل کے ارفع پہلوؤں کی روشنی میں ان کی شاعری کو دیکھنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ ردوقبول اور اکتساب فن کی منزل سے گذرتے ہوئے ایک مقام پر آزاد و خود مختار سے ہو گئے ہیں جہاں فن خود بخود معراج کے زینے طئے کرنے لگتا ہے اور اسے اب ردوقبول کی حاجت نہیں رہتی۔ یہ بھی ایک طرح کی تخلیقی آزادی ہے جو فنی مہارت حاصل ہونے کے بعد میسر آتی ہے۔ راشد طراز کی شاعری کو آپ جہاں سے بھی دیکھیں وہ آپ کو مکمل شعری وجدان کے ساتھ نظر آتی ہے:

یہ کس فلک سے حقیقیت پکارتی ہے مجھے
کہ جیسے خلق محبت پکارتی ہے مجھے

نور سحر کے بعد تو ظلمات شب بھی ہیں
روشن ہمیشہ نقش وفا ہی لگا مجھے

طلوع صبح ہوئی شام بھی ملی شب سے
مگر فسانۂ دل نا تمام رہ گیا ہے

خواب صحرا کو مری لوح نظر پر رکھا
اس نے کیوں سارا فسوں خاک بسر پر رکھا

پسینے بن کے لہو مل گئے ہیں پھولوں سے
بہار یوں ہی نہیں رنگ و بو میں شامل ہے

امیر کارواں سے کہ دو منزل آخر شب ہے
یہاں پر صرف گردوں کا اشارہ دیکھنا ہوگا

اس سے بڑھ کر کوئی درویشی کا اعجاز نہیں
روح سرشار حقیقت نظر آتی ہے مجھے

مجھے ظلمت میں بھی مائل بہ امکاں کون رکھتا ہے — میری بیدار راتوں کو فروزاں کون رکھا ہے
تیرے تصورات میں لوح و قلم تک آ گئے — لے کے چراغ لفظ کو ہم بھی حرم تک آ گئے

راشد طراز نے اس وقت اپنا شعری علم بلند کیا جب بہار میں سلطان اختر، صدیق مجیبی، لطف الرحمٰن، پرکاش فکری اور علیم اللہ حالی کا نامی چاروں طرف گونج رہا تھا اور بہار ہی نہیں بلکہ یہ لوگ ہندوستان کے شعری افق پر درخشاں ستارے کی طرح روشن تھے۔ ایسے میں ایک نووارد شاعر کے لئے مشکل تھا کہ وہ ان لوگوں کے ہوتے ہوئے کوئی مقام بنا پاتا مگر وقت آیا تو اردو شاعری نے یہ نظارہ بھی کیا کہ راشد طراز نے ان حضرات کا عصر ان کی موجودگی میں چھولیا اور ان کے زمانے میں ہوتے ہوئے اپنا زمانہ بھی قائم کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ شعرائے جدید کی اس نسل کے بعد بہار میں اردو شاعری کی جو نسل تیار ہوئی ہے اس میں راشد طراز کا نام سب سے نمایاں ہے۔ اس فہرست میں ان ساتھ اور لوگ بھی شامل ہیں جن میں خورشید اکبر، عالم خورشید، جمال اویسی، خالد عبادی، منیر سیفی، نعمان شوق، قربان آتش، اور طارق متین وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

راشد طراز کی شاعری کی ابتدا میں ان رنگوں کی آمیزش سے ہوئی ہے جو حسن خلق اور محبت کے درمیان ابھرتے ہیں۔ خلق اور محبت کا امتزاج خود ایک ایسا لاثانی تیور ہے جو فنی تخلیق کے لئے گراں قدر نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ جب حسن خلق اور محبت نے ان کی شاعری کو استعارہ کیا تو راشد طراز کی شاعری اپنی محور پر گھومنے لگی۔ یہ اس کا اولین زمانہ تھا جب ان کی شاعری ابھی زندگی کے پیچیدہ اسرار سے نبرد آزما نہیں ہوئی تھی اور اپنے ارادوں میں ایسی کارفرمائی تلاش کر رہی تھی جو اس کے شعری اظہار کے لئے موزوں تھا۔ حسن خلق اور محبت ان کی شاعری کا ابتدائیہ ہے۔ لیکن ان کے ابتدائی دور میں یہ دونوں باتیں ان کے پاس خارجی اثر کے تحت آئی ہیں۔ اس لئے کہ دونوں باتوں کا خارجی اثر ان کے تخلیقی عمل پر نظر آتا ہے۔ اس اثر تلے راشد طراز دبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گویا ان پر حسن خلق کا فیضان ان کی اپنی طلب اور حوصلے سے زیادہ ہے۔ دیکھا جائے تو اس ترتیب پر کہ جب کوئی شاعر اپنے شعری ابتدائیہ میں اشیاء اور صور کو اپنے حوصلے سے زیادہ پا رہا ہو اور وہ حسن خلق کی بارش کو جب اپنے ظرف سے زیادہ دیکھتا ہو تو اس پر لازم آئے گا کہ وہ اپنی شعری شناخت کے لئے ردوقبول کے ذریعہ ایسے استعارات وضع کر لے جو اس حسن خلق کو اس کی اپنی سطح کے برابر کر دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر ایسے ہی اخلاق کو اپنے اندر سمیٹنا چاہتا ہے جس کی طلب اس کے اندر پہلے سے موجود ہو یا وہ اس حسن خلق سے مماثلت رکھتا ہو۔ اب شاعر کے لئے ضروری ہوا کہ وہ اپنا دست طلب دراز کر دے اور اپنے تخلیقی عمل کو اظہار و بیان کی ایسی سطح پر لائے جہاں شوق کی بلادستی قائم ہو

سکے۔ اسی طرح راشد طراز کے اولین دور کی شاعری میں ان کے شوق کی بالادستی قائم ہے جو ان کو دوسرے ہمدردانہ موقف سے احتیاط کرنا سکھاتی ہے۔ اسی احتیاط کا نتیجہ ہے کہ ان کے تخلیقی عمل میں ایسی شناخت پیدا ہوگئی ہے جو انہیں ایک پختہ کار شاعر کے روپ میں پیش کرنے میں معاون بنتی ہے۔ شاعری میں ان کی اصلاحات اور ترقی کو دیکھ کر محسوس ہو جاتا ہے کہ وہ عام سطح سے بلند حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کی شاعری علائق سے مستغنی ہو کر اپنا تخلیقی سفر شروع کرتی ہے اور اونچائی پر اپنا مقام بناتی ہے۔ ایک اور احساس ان کے شعری ابتدائیہ میں یہ بھی ملتا ہے کہ وہ تخلیقی سطح پر اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ اس حال میں اولاً تو ان کا اپنا اعتماد کام کرتا ہے دوسرے تحفظ کی خارجی تصویر پھر انہیں ایسی طرف لے چلتی ہے جہاں سے ان کی خود اعتمادی انہیں اپنے مقام پر واپس لے آتی ہے۔ راشد طراز اسی کشمکش میں بڑے اعتماد کے ساتھ اپنا تخلیقی سفر جاری رکھتے ہیں اور پھر دریافت کے اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں سے تحیر اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس اثر و تاثر کے ذیل میں ان کا تخلیقی سفر نئے مزاج کی روشنی سے ہم کنار ہوتا ہے:

پانی پہ اس نشاں سے مماثل ہوا ہوں میں — لہروں کے بیچ کس سے مقابل ہوا ہوں میں
جواز روشنی بن جائے آہ نیم شبی — شکستہ راہ میں دل کا لہو تمام نہ ہو
زمیں سے دور کہیں لامکاں میں کھلتے ہیں — یہ کس خیال کے در آسماں میں کھلتے ہیں
بس ایک درد ہے باقی چہار سمتوں میں — کہاں ہے کوئی میرا غم گسار سمتوں میں
تمام کرتا ہوں میں بھی چلو عریضۂ شام — میں پھر ستاروں کو لشکر بنا کے چلتا ہوں
خموشی توڑ کے جذبوں کے بیاباں کا سکوت — کیسے ہوتی ہے ہم آواز دکھایا ہے مجھے
قطرے میں آنسوئیں کے بھی دریا شناس تھے — وہ لوگ کیا ہوئے جو ستارہ شناس تھے
کسی خبر تھی کہ آنکھوں کے سامنے ہوگا — زمیں کا درد نگاہوں کے سامنے ہوگا
زمانہ یاد رکھے گا مری مساعی کو — عروج پھیل رہا ہے زوال ہوتے ہوئے

حرف محبت کو راشد طراز نے مختلف صورتوں میں دیکھا ہے۔ ان کے یہاں محبت کا ابتدائیہ بہت محاط رویوں اور ذرائع کا پابند ہے۔ شاید اس لئے کہ انہیں محبت کو تمیز کرنے میں جذباتیت سے پرے کچھ ایسے تقاضوں کا بھی لحاظ رکھنا تھا جو ان کی تخلیقی آزادی میں مخل نہ ہو۔ وہ ہر وقت ان پر سایہ کئے ہوئے نہ ہو بلکہ انہیں کبھی کبھی آزاد اور خودمختار بھی چھوڑ دیں۔ ایسی محبت جو انہیں تمام علائق سے کاٹ کر الگ کرتی ہو انہیں پسند نہیں ہے۔ وہ زندگی جینے کے عمل میں آزاد و خودمختار رہنا پسند کرتے ہیں یہاں تک وہ ایسی محبت سے بھی آزادی چاہتے ہیں جو ان کی آزادی پر قدغن لگائے۔ ان کا یہ تصور علامہ اقبال کی طرح 'ایک آرزو' اور 'ہمالیائی' تصور ہے جو اس سے آگے کی منزل میں

آفاق کی طرح وسیع تر ہوتا چلا گیا ہے۔اس سے آگے تو ان کے یہاں پھر محبت کے ایسے رویے اور ذرائع پیدا ہو گئے ہیں جو ان کی شاعری کو ممیز لگاتے ہوئے برق رسیدہ بنا دیتے ہیں۔ یہاں پر مقصود محبت کے ابتدائیہ سے رہنمائی حاصل کرنا تھا ورنہ جو بات انتہا میں پیدا ہوئی ہے اس کا اعتبار تو شعری اظہار کے تمام سمتوں میں موجود ہے۔ بات چونکہ محبت کے ابتدائی مرحلوں کی ہو رہی ہے جس میں احتیاط کے تقاضوں کو پورا کرنا اور خود مختاری کے ممکنہ ذرائع پر کسی خارجی نقشے کے دباؤ سے نکلنا' راشد طرز کی اولین ترجیح تھی اس لئے وہ اس معاملے میں ہمیشہ محتاط نظر آئے۔اس احتیاط اور سراپا گریز کے نتیجے میں ان کی شاعری قلندرانہ جذبات سے سرفراز ہوئی اور ذوق و وجدان کی سرحدوں کو عبور کرتی ہوئی کشف ذات اور کشف کائنات کی بلند سطح تک پہنچ سکی۔ راشد طراز کا یہ عمل ایسی صورت کا متقاضی اس لئے ہوا کہ وہ براہ راست مواخذے سے بچنے کے لئے بھی اپنے موقف پر پرعزم رہے اور کسی معنوی در اندازی سے اپنے تخلیقی عمل کو محفوظ رکھا۔اس گریز کا یہ اثر ہوا کہ جب محبت کا رنگ ان کے اوپر بغیر کسی تحدید اور تعریف کے کھلا تو شاعری کے مختلف طباق روشن ہوتے چلے گئے۔شاعری زندگی کی تعبیر بن کر ان کے شعری اسلوب میں نمایاں ہوتی چلی گئی۔ان کی شاعری ایسے واسطوں اور حوالوں کا مرکز گئی جس نے خود اپنی شان کو بلند کرتے ہوئے اعلیٰ شعری اعتبارات تک رسائی حاصل کی۔اس طریقے پر فنی اعتبار سے راشد طراز کے کار شعر نے اپنا ایسا ٹھکانہ مقرر کر لیا جو واقعتاً شاعری میں نئی روش کی برتر مثال ہے۔ پھر ان کی شاعری اپنے عصری اسلوب کے نہاں خانوں سے گذرتی ہوئی ایسے اسرار میں گم ہوتی ہے جہاں حیرانی ایک نئی تخلیقی بصیرت بن جاتی ہے۔اس طرح ان کی شاعری نئے حوصلے اور عزائم کے ساتھ ہمارے تخلیقی مزاج کو چھیڑتی ہوئی آگہی کے دروازے کھولتی ہے۔لفظ و بیان سے ہٹ کر بھی انہیں اور بھی تخلیقی جستجو حاصل ہے جو ان کے کار شعر کو ذوق و شوق کا بیانیہ بنا دیتی ہے۔ یہ شعری جہت ایسے لمحات کی اسیر ہے جہاں شوق سے استفادے کے لئے نئے استعارات کی تشکیل ضروری ہے۔ چنانچہ یہ نئے استعارات جب اپنی تعبیر کے لئے کوئی اشاراتی اسلوب قائم کر چکے ہوں تو شعوری سطح پر انہیں ایسی حد بندیوں کے قیود سے طبعاً آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔اسی لئے ان کا قاری کچھ ایسے طور پر رد و قبول کی آزمائش سے گذرتا ہے کہ اسے براہ راست معنی تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر اسی کشمکش میں جب وہ راشد طراز کے جمال شعر سے قریب ہوتا ہے تو اس کے حوصلے میں شعری توجیہات اپنے اسرار کے ساتھ مچلنے لگتی ہیں۔ یہ وہ شعری اسرار ہیں جو کبھی تو اپنے انفرادی رنگ و آہنگ میں بیان ہوتے ہیں اور کبھی اس اجتماعی دروں بینی کی نذر ہو جاتے ہیں جو شاعری سے لطف اندوز ہونے کا ایک تمثیلی رشتہ ہے۔ راشد طراز اپنے تخلیقی سفر میں محبت بن کر چھا جانے والے رویے سے گریز کرتے ہوئے ایسے شعری نوادرات جمع کئے ہیں جو ان کے دامن کے علاوہ کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتے۔اس گریز نے ان کے اندر تخلیقی آزادی کا علم بلند کیا اور ان کے اندر تخلیق کے سنگ ریزوں کو جمع کرنے کی استعداد پیدا ہوئی۔ پھر ان

کے یہاں طویل القامت شعری اشارے بھی قائم ہوئے جو پیچیدہ احساسات کے ضامن بنے اور اسی کے ساتھ نشیب میں وسعت لئے ہوا نیچے کی طرف کھلتا ہوا معنوی اعجاز بھی ان کے تخلیقی سفر کا نشانہ بنا۔اس طرح ان کا تخلیقی مزاج ان راستوں کا محرم بھی بن گیا جو عصری مزاج سے ہم آہنگ تھا۔ گویا راشد طراز عصری پیچیدگیوں سے بھی ایک گونہ محفوظ رہتے ہوئے خود تخلیق کا وہ بڑا میدان بن گئے جس میں کسی طرح کی توثیق کی حاجت باقی نہیں رہی۔ہم جب ان تخلیقی پیچیدگیوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں وسعت کون و مکاں کے حوالوں میں نشانات رنج و غم کی خبر گیری بھی نظر آتی ہے۔تخلیق کی اس داستان نے ان کے خیال پاروں کو روشنی عطا کی ہے۔ یہ وہ روشنی ہے جو ان کے تخلیقی بساط پر دھیرے دھیرے اثر انداز ہوتی ہے پھر اپنا اثر قائم کرتے ہوئے دو طرفہ آہنگ پیدا کرتی ہے۔اس قرینے سے کہ شاعری اپنی تاثیر ان توقعات کو بھی پوری کرتی چلی گئی ہے جو اس راہ میں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نشیبی پھیلاؤ نے ان کی شاعری کو قدرانی کی ایسی منزل تک پہنچا دیا ہے جہاں شعری تمثیلات کے تمام دروازے خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں۔ یہ تمام کیفیات اور منازل کسی پیچیدگی کے بغیر جب اپنا اثر ڈالتے ہیں تو ایسے میں رفتہ رفتہ ان تمام تشریحات کے بغیر ایسے عوامل جو ہمیں کسی ایک طرف چلنے کے مجبور نہ کریں وہ اپنے آپ سے قبل کئی جہات کی تہذیبی فضا کو اپنے گھیرے میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے یہاں ایسے احوال سے گذرنے میں ایک انجانی سی رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے گویا ایک تخلیقی حال دوسرے کے لئے حجاب بن جاتا ہے۔ خاموشی یا امساک کی ایک الگ کیفیت ہے جو اس بصیرت کے فروغ میں مانع آتی ہے۔تاہم ایک مخصوص مدت کے بعد کوئی بھی خاموشی یا رکاوٹ خود بخود ختم ہوتی ہوئی نظر آجاتی ہے۔ یہ تخلیقی نہج زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہتی بلکہ یہ خود ایک بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے :

یقیں آتا نہیں خود کو دیکھ کر اب بھی
مری وفا بھی کبھی کارواں بنائے گی

چلو یہ رات ہی مشکل کو دور کر دے گی
جو کہہ رہی ہے سویرا سویرا دکھائی دیتا ہے

ایک زندان محبت میں ہوئے ہم بھی اسیر
خود کو ہر قید سے آزاد کہاں تک کرتے

چاند میں کس کی تجلی ہے ذرا غور سے دیکھ
یہ کہیں منزل آخر نہ ہو سلطانۂ شب

رہے گا کیوں نہیں جذبات دائمی کا امام
بنا دیا ہے اسے حق نے روشنی کا امام

اک آستانِ نور سے کردار بن گیا
یہ کس کا آئینہ مرا پندار بن گیا

میں درد بن کے رات کے منظر میں ڈھل گیا
دریائے مضطرب تھا سمندر میں ڈھل گیا

کر دیا گردش افلاک کو رحمت پہ محیط
اور کیا اس سے سوا خلق خدا چاہتی ہے

یہی بہت ہے سر انتشار ٹوٹا نہیں
شکست سے بھی دل بے قرار ٹوٹا نہیں

راشد طراز اپنے رنگ وآہنگ میں اردو کے معتبر اور معیاری شعراء کے ساتھ رشتہ قائم کرتے ہیں۔ان کی زمین معراج سخن کے نارسیدہ گوہر بھی اگلتی ہے اور ایسے شعری امکانات سے رشتہ جوڑتی ہے جو اپنی گیرائی میں بے مثل ہیں۔ان کے وادیٔ سخن میں ہمیں ایسے نوادرات دیکھنے کو ملتے ہیں جو لمحات کو صدیوں پر عبور کر لیتے ہیں۔یہ نوادرات شاعری کے نارسیدہ حوالوں اور بیان کی آفاقیت کا خمیازہ ہیں۔ان ہی کے ذریعہ معراج سخن تک رسائی ممکن ہوتی ہے۔انہوں نے اس میدان میں جو سرخروئی حاصل کی ہے وہ ان کی طول جدوجہد کا نتیجہ ہے۔خیالات کو پر عزم رکھنا اور اسے نئی تمثیلات عطا کرنا ان کا بنیادی وصف ہے۔اس صفت سے متصف ہو کر جب وہ شاعری کے اعلیٰ معیار اور قدر کو اپنے اندر سمیٹتے ہیں تو ان کی شاعری میں ایک جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے جو انہیں کسی دوسری جانب رخ کرنے ے روکتی ہے۔فن شعر اپنی چیرہ دستی کے ساتھ ان کی شاعری میں شعر وسخن کے نئے معیار کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے۔فن شاعری نے راشد طراز کے کار سخن میں جس طرح استقرار سے کام لیا ہے وہ وہ ان کی فنی بصیرت کو مہمیز لگاتا ہے۔ان کی شاعری نے معروفات کی طرف بھی رخ کیا ہے۔وہ معروفات کو بھی اپنے جلو میں سمیٹتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے ہیں۔معروفات کی دانشمندانہ طریقے پر سمجھنا' اس کے احکامات اور علائق سے باخبر ہونا' پھر اسے شعری تعبیرات میں جمع کرنا راشد طراز کا وہ فن ہے جو اپنی تاثیر میں نہایت قوی اور جاذب نظر ہے۔معروفات کے شیوع کو انہوں نے جس تخلیقی انداز میں پیش کیا ہے اس سے اس کا تیور اور زیادہ شیریں ہوتا چلا گیا ہے۔یہاں پر اس یقین کو حاصل کرنا بھی ایک عمل ہے کہ ناگواریوں کو بدلنے کے لئے ایسے نشانات ک بلند کرنا ضروری ہے جو معروفات کے دائرے میں آتے ہوں اور وہ بالواسطہ طور پر ناگوار لمحات سے لگاؤ رکھتے ہوں۔شاید راشد طراز کا طرز سخن اس رخ کی طرف بھی گیا ہے کہ معروف کی ترویج سے ظلمتوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔اس لئے ان کا قدم اس میدان میں آگے بڑھتا چلا گیا ہے۔ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ اس کام میں انہوں اپنے کار سخن پر ایک جمالیاتی پرت ڈھانپ رکھی ہے جو اس احساس سے بچاتی ہے کہ وہ اپنے قاری سے براہ راست مخاطب ہو رہے ہوں۔اس کیفیت نے دونوں جہات میں اپنا اثر دکھایا ہے۔ایک جانب تو وہ اپنے اقدام میں خود کامیاب ہیں دوسری طرف ان کے اس اقدام کی حکمت بھی قاری کی نظر سے اوجھل رہتی رہ جاتی ہے اور ایسے میں عمل کی تاثیر اس تصور سے زیادہ بڑھ چکی ہوتی ہے اور یہ حکمت انہیں ایسی تشکیل سے بھی بچاتی ہے جو کسی قدر پردے میں رہ کر اپنی شناخت قائم کرتی ہے۔کبھی کبھی معروف کی صورت ایسے اقدام سے بھی نکلتی ہے جو اپنی ذات کی طرف موسوم ہو اور اس سے کسی دوسری تہذیب کا کوئی قرینہ نہ نکلتا ہو۔ہر بات اپنی جگہ نمایاں اور بیّن بھی ہو اور اس سے کوئی دوسرا ناگوار پہلو بھی نہ نکلتا ہو۔یعنی معنی کا التباس اس درجہ محسوب ہو

جائے کہ اس کا واقعاتی ترتیب پر اپنے تخلیقی مزاج کے ساتھ ہم آہنگی قائم کرنا سب سے زیادہ پسندیدہ بن جائے۔نتیجے کے طور اس رنگ وعمل میں تمام ناہمواریاں محسوب بھی ہو جائیں اور فن کار کسی طرح کے اتہام سے بھی محفوظ ہو جائے۔یہ طریقہ اصلاحات کی وہ کلیّت ہے جہاں ہر کس وناکس کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔جہاں اس بات کا ارادہ کرنا بھی دشوار طلب ہو کہ شاعری کی مرکزیت میں معروفات کو داخل کرنا کس حد تک قابل قبول ہے وہاں کسی شاعر کا معروف کے شیوع کے نام پر اقدام کر کر لینا کتنی بڑی کامیابی ہے جو اس ذوق کی تربیت کے ضمن میں راشد طراز کی شاعری کا محاذ بن گیا ہے۔وہ اس راستے پر ہمیں سبک گام نظر آتے ہیں۔ان کی رفتار اس میدان میں نرم اور دھیمی ہے۔وہ نہیں چاہتے کہ معانی کا جو باب معروفات کے میدان میں متنازعہ فیہہ رہا ہو اس میں کسی رعایت کے بغیر کوئی خود احتسابی رویہ قائم کر دیا جائے۔اس لئے وہ معروفات کے اظہار میں جہاں تک بھی گئے ہیں درد آشنا بن کر گئے ہیں۔وہ آگہی کے دام شنیدن کی مطلق پرواہ نہیں کرتے اور اپنے عالم تقریر کا مدعائے عنقا پیش کر دینے سے ہرگز گریز نہیں کرتے:

کہ آگہی کے منازل کو سر جبیں سے کیا
افق کو ہم نے موافق اسی زمیں سے کیا

میں ہی نہ جا سکا سر کوئے نشاط تک
دستک تو آ کے باد صبا دے گئی مجھے

قتل کرتے ہوئے اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا
اس کا مقتل بھی شہادت سے منور ہوگا

طرآز کہتے ہیں ہم دوستی کی دنیا میں
وہ شخصیت ہی نہیں جو کھلی کتاب نہ ہو

عرفان ہے یہ شوق شہادت کے ذیل میں
خنجر سے ارتباط نہیں ہے تو خوں نہی

راشد طراز کی شاعری جمال اور بصیرت کے فروغ کی شاعری ہے۔یہ دو چیزیں ان کے خانۂ شعر میں روز اوّل سے مکین ہیں۔وہ احساس جمال اور بصیرت کی مدد سے اپنے اشعار میں ایسی تازہ کاری پیدا کرتے ہیں جو قاری کو فروغ حسن کی وادی سے گذارتے ہوئے بصیرت تک پہنچاتا ہے۔یہ بصیرت اسے مسرت کے ساتھ ساتھ تازگی بھی عطا کرتی ہے اور ان کی شاعری کے معنوی حسن معنی کو اس کی نیرنگی میں کمال تک پہنچاتی ہے۔شاعری میں' بلکہ اچھی شاعری میں احساس جمال کا پایا جانا ضروری ہے مگر جب شاعری اپنی سطح سے بلند ہوتی ہوئی نئے امکانات کی طرف قدم بڑھاتی ہے تو ایسے میں قاری کے احساس جمال میں فروغ واقع ہونے کے ساتھ ساتھ نئے جہات بھی پیدا ہوتی ہیں۔ایسے میں اسے مسرت کا نیا خزینہ ہاتھ آجاتا ہے اور وہ بصیرت کی لامتناہی فضا میں عرفان ووجدان کی مختلف کیفیات سے گذرتا ہے۔یہ کیفیت جو قاری کو حاصل ہوتی ہے وہ دراصل احساس جمال اور مسرت وبصیرت کا نقطۂ انضمام ہے جہاں پہنچ کر شاعری کے آگے سجدہ ریز ہونے ک خواہش پیدا ہوتی ہے۔یہ مسرت کا وہ مقام ہے جہاں شاعری کا کوئی شریک نہیں

ہے۔راشد طراز کی شاعری اپنے صحت مند قاری کو ایسی ہی مسرت کا تجربہ کراتی ہے جو اسے ان کے اشعار کے علاوہ دوسری جگہ نہیں ملی۔اگر کوئی یہ سوال کرے کہ جب یہ صفت شاعری کی صفت ہے تو اس میں کسی شاعر کی نفرادیت کیا معنی رکھتی ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ گرچہ مسرت اور بصیرت کی نئی دریافت تک پہنچانا خود شاعری کا کام ہے مگر اس مسرت کے بھی درجات ہیں جو فی زمانہ شاعروں کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ لازمی طور پر بدلتے رہتے ہیں۔اس لئے گرچہ اس بات کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا جا سکتا مگر یہ حقیقت ہے کہ ہر شاعر کی شاعری کا لطف الگ الگ ہوتا ہے۔تنقید یا فلسفہء جمالیات اس کہ کنہیات تک نہیں پہنچا ہے مگر یہ واقعہ ہے۔اس نکتہ پر مزید غور وفکر کرنے سے معرفت کے کچھ اور پردے وا ہو سکتے ہیں۔شاعری سے ہمیں جو مسرت حاصل ہوتی وہ یقیناً شاعروں کے اختلاف سے مختلف ہو جائے گی۔اس لئے کہ جب ہم کسی شاعر کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں کلام کے ساتھ ساتھ صاحب کلام کے وجود کا بھی استحضار رہتا ہے اور یہیں سے ہماری لذت اثر انداز ہوتی ہے۔جس شاعر کے کلام کا مطالعہ کیا جا رہا ہے اسے قاری کس درجہ متاثر ہے اور وہ اس سے کس درجہ محبت رکھتا ہے؟ اس پہلو کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔اب جب قاری کسی شاعری کا مطالعہ کر رہا ہوتا ہے تو اسے شاعر کا نام اس کے ساتھ قاری کی عقیدت ومحبت' یہ تمام چیزیں مل کر اس مسرت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔راشد طراز کی شعری شخصیت اور عرض سے جو مسرت کے باب عیاں ہوتے ہیں وہ کسی دوسرے سے مماثل نہیں۔ان کی شاعری میں جمال اور مسرت وبصیرت کے وہ دلائل جمع ہو جاتے ہیں ان کی تفہیم میں معاون بنتے ہیں۔اس لئے ان کی شاعری کی تفہیم اعلی درجے کی درجہ بندی تک لے چلتی ہے۔ راشد طراز مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں عصری بصیرت کے ساتھ اپنی شاعری میں مسرت کے وہ جلوے بکھیرے ہیں جو ہمارے سامنے ان کا شاعرانہ قد بلند تر کرتی چلی جاتی ہے:

چلو اقرار کی منزل پہ ہم بھی چوم لیں آنکھیں
سنا ہے ہم نے اس کی لا مکاں تک روشنی ہوگی

رکھی ہے فکر اتنی ہم نے تنظیم چراغاں کی
چلا آئے گا نام اپنا جہاں تک روشنی ہوگی

ذرا سی یاد پہ دل کی صدائیں آنے لگیں
نظارہ ہونے لگا تابدار سمتوں میں

جہاں جہاں سے گذرتا ہوں آئینے کی طرح
دلوں میں اپنا وہاں گھر بنا کے چلتا ہوں

خامشی توڑ کے جذبوں کے بیاباں کا سکوت
کیسے ہوتی ہے ہم آواز دکھایا ہے مجھے

راشد طراز کی شاعری ایسے قرینے کی شاعری ہے جو ہمارے احساسات کو اپنے معانی کے ساتھ tag کر لیتی ہے اور یہ سلسلہ وہاں تک چلا جاتا ہے جہاں پہنچ کر احساسات کی لہریں اور معانی کی قید نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔احساس وجذبہ اور معانی کی کارفرمائی میں اس سے آگے ایسے راستے بھی

روشن ہو جاتے ہیں جو اس پہلے نہیں ہوتے۔پھر ہم اپنے احساس وجذبہ کا اعزاز واکرام کرتے ہوئے ایسے حوالوں کی طرف بڑھتے ہیں جو ہمیں شعری تناظر میں دوہرا لطف عطا کرتا ہے۔ان کے یہاں احساسات کو حیرانی عطا کی جاتی ہے پھر اس حیرانی سے ایک نئی وسعت عطا کی جاتی ہے۔حیرانی کا یہ باب دراصل بنیادی وصف سے نکلتا ہے جس میں یہ کائنات خود ہی ہر جانب سے حیرانی کا نظارہ پیش کرتی ہے۔یہ حیرانی اصلاً تو خود انسان کی ذات سے شروع ہوتی ہے اور پھر اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جاتی ہے۔چنانچہ ایک وقت آتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ شاعر کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگتا ہے۔یہاں آکر ساری چیزیں مساوی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔اس مقام پر کائنات کا ایک معمولی سا ذرہ بھی تحیر کی وہی کیفیات پیدا کرتا ہے جو اس ذرہ سے بڑی بڑی چیزیں یا مناظر جنہوں نے اپنی حیرانی سے اس کائنات کو پوری طرح ڈھک دیا ہے۔پھر یہ سارے مناظر اپنے تحیر کے ساتھ ایک ساتھ کائنات کو ایک ہی مفہوم عطاء کرتے ہیں۔پھر اس ایک مفہوم سے تمام وسعتیں پیدا ہوتی ہیں۔شاعر ایسے میں ان تحیرات کو کوئی نیا مفہوم عطا کرنا چاہتا ہے۔اس مفہوم کے ساتھ اس کی اپنی تخلیقی رنگت بھی شامل ہونا چاہتی ہے تاکہ تحیر کا کوئی پہلو اس کے پاس untouched نہ رہ جائے۔اس طرح راشد طراز کے یہاں کائناتی تحیر ایک بڑا موضوع بن کر ابھرتا ہے جو ان کی شاعری کو ایسے راستوں پر ڈال دیتا ہے جو زمین وآسمان کی وسعتوں میں نئے اثرات تلاش کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہیں۔حیرانی کی اس انتہا کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ شاعری کے وہ تمام آثار جو کسی تحیر کے ذیل میں آتے ہیں سب کا سب راشد طراز کی تخلیقی بساط پر معنی کے رشتوں کی طرح آدھمکتے ہیں۔اس طرح وہ تخلیقی وسعت جو تحیر کے ساتھ جمع ہوتی ہو وہ ایسے رنگ وآہنگ میں سمٹ آتی ہے کہ اس کی شناخت کے لئے شاعر کے وسعت ظرف کی طرف لوٹنا پڑتا ہے۔یہ خیال اور عمل جب اپنے علاوہ کسی مفروضے کی طرف راجع ہوتا ہے تو اس کی شناخت پہلے سے دیکھی ہوئی تمثیل کو حد شعور تک پہنچا کر واپس لوٹ آتی ہے۔لوٹ جانے کا یہ احساس کبھی تو شاعر کو خود نئی شناخت کے ساتھ قبول کرتا ہے اور کبھی اسے رد وقبول کی کیفیت سے ہٹ کر دیکھتا ہے۔شوق کا یہ عمل جب راشد طراز کی شاعری پر اپنا جلوہ دکھاتا ہے تو قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ شوق اپنی شرست میں حالات کے پس پردہ نئے قوانیں بھی اخذ کر لیتا ہے:

صبح کی پہلی کرن پرناز مجھ کو کیوں نہ ہو
روشنی کی وہ مجھے پہلی کرن تک لے گئی

جھکنا تھا سر کو اول و آخر اسی جگہ
افسوس ہے یہ کام بھی تاخیر سے ہوا

عکس مانا دل آئینہ پہ مشہود نہیں
اس سے ہٹ کر مرا پھر کوئی بھی مقصود نہیں

موت سے ڈرتی نہیں خوئے صداقت میری
دیکھ اے شہر ستم تو بھی بغاوت میری

غرض ہے سب کو نشاطِ سخن کی لذت سے — مری نوائے پریشاں کا کچھ شمار نہیں
اک بے ظہور حسن حقیقت کا جوش ہے — میری جبیں پہ جس کی اطاعت کا جوش ہے

شاعری کی ایسی تعبیر جو تمام شعری جہات اور عوامل کو یکساں طور پر محیط ہو اپنے معانی اور اسالیب میں اعلیٰ شاعری کی طرف راجع ہو راشد طراز کی شاعری کے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتی ہے۔ اپنی جزیات میں ایک وسیع دنیا کو اسی تخلیقی انا کے ساتھ وابستہ کر کے وہ اپنے پیش رووں سے جدا اپنے خیالات کی الگ تمثیل قائم کرتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں ایسی گویائی ہے جو شعری عمل میں ایک وسیع انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ راشد طراز نے شاعری کو جس مقام تک پہنچایا ہے وہ قابل قدر بھی ہے اور قابل رشک بھی۔ تفہیم شعر کے آثار و انور کو ذوق سماعت سے قریب کرنا اور اسے ایسی تاثیر عطا کرنا جو ماقبل پیدا ہونے والی لذات کا زائقہ بھلا دے' راشد طراز کا شاعرانہ نشان ہے۔ یہ شاعرانہ نشان ایسا ہے جو سماعت کی لذتوں کو دوسرے حواس خمسہ کے آگے نمایاں کرتا ہوا ہمارے ذوق شعر کو ویرانے سے نکالتا ہے۔ اس طرح ان کے اشعار ہمارے ذوق کی تہذیب بھی کرتے ہیں اور اس کے وصف میں نمایاں تبدیلی بھی لے آتے ہیں۔ انکے نزدیک شعری ذوق اور اسالب کی تہذیب اور اس کی آراستگی بھی اعلیٰ شاعری کے قرینوں میں سے ایک ہے۔ ہم جب اس تہذیب یا آراستگی کی طرف نگاہ کرتے ہیں تو ہم راشد طراز کے کارِ سخن کو اس شعری جواز کا محل سمجھتے ہیں جو ان کی شاعری کی تمثیل اور تعبیر میں جگہ جگہ قائم اور دائر ہے۔ یہ وہ مقام ہے جو ہمیں شاعری کے اعلیٰ معیار سے قریب کرتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ممکن ہے کہ شاعری کے اعلیٰ معیار کو سمجھنے میں جو توجیہات ہمیں دیکھنے کو ملتی ہیں وہ اس تخلیقی معیار سے اس حد تک اوپر اٹھ جاتی ہیں کہ ان کو مکمل طور پر سمجھنا ممکن نہیں ہوتا مگر جب ہمیں غور و فکر کی عادت ہو تو تمام پہلو رفتہ رفتہ کھلتے چلے جاتے ہیں اور شاعری کا جو قرینہ ایک وقت میں ناقابل تفہیم سمجھا جاتا ہے وہ کسی دورے وقت خوش اسلوبی کے ساتھ گرفت میں آجاتا ہے۔ گویا شاعری ایک وقت میں اپنی توجیہ خود کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ اس طرح یہ بات منتج ہوتی ہے کہ شاعری خود اپنا معیار ہوتی ہے۔ اس کا کسی دوسری شاعری سے صرف موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ کسی دوسری شاعری کے ساتھ اس کا معیار قائم نہیں کیا جاسکتا۔ راشد طراز کی شاعری بھی خود اپنا ظرف اور معیار بناتی ہے۔ وہ کسی دوسرے شاعر کے پلڑے میں تلنا پسند نہیں کرتی۔ اس نے اپنی راہ خود بناتی ہے۔ اس ترتیب پر جب ہم راشد طراز کو سمجھنے کی کوشش کریں گے تو وہ ہمارے سامنے ایک قدآور شاعر کی حیثیت سے ابھرتے ہیں۔ وہ اپنے معاصرین میں غیر معمولی شعری تخریج اور ادائیگی کی وجہ سے منفرد اور ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کی انفرادیت اور امتیاز سے شاعری کے نئے اصول وضع کئے جاسکتے

ہیں۔ ان کے اشعار معلوم اور مانوس وادیوں کے رخ پر چلتے چلتے جب لامعلوم اور غیر مانوس جذبات و خیالات کی تلاش میں نکلتے ہیں تو ان کے یہاں شاعری کے سارے قرینے معلوم سے لامعلوم میں اور مانوس سے غیر مانوس میں بدل جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں شاعری کی حسن کاری کی تمام صورتیں ایک عجیب کیف و سرور کے ساتھ اپنا تیور بدلتی ہوئی لامعلوم کی طرف چل پڑتی ہیں۔ پھر جب ان کے اشعار اس ضمن میں کوئی معنی کھولتے ہیں تو وہ اپنے ہر باب میں شعری تشکیل کی لامعلوم وسعتوں کو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شعری تشکیل کی یہ نامعلوم وسعتیں ہی اصلاً شاعری کی تفہیم کے نئے امکانات روشن کرتی ہیں :

کیوں ہو آغاز میں اندیشۂ انجام مجھے — ساتھ رکھتی ہے اگر گردش ایام مجھے
جو اجالا تھا دل و جاں میں تجھے نذر کیا — اے شب غم نہیں دینا کوئی الزام مجھے
وہ شام انتظار تھی یا عرصۂ وصال — روشن عروج بھی تھا پس پردۂ زوال
زمیں سے دور کہیں لامکاں میں کھلتے ہیں — یہ کس خیال کے در آسماں میں کھلتے ہیں

راشد طراز کی شاعری کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ راشد طراز نے اردو میں ۸۰ء کے بعد شاعری کے افق پر ابھرے اور اپنے کارِ سخن کے ذریعہ شعری تعمیر کے عمل میں وہ کارنامہ انجام دیا جس کے رو سے وہ ایک بڑے درجے کے شاعر بن کر شاعری کی عظمت کے نشان کو چھونے میں کامیاب ہو گئے۔ راشد طراز کو محض ایک اچھا شاعر کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان کی شعری حیثیت کو سمجھنے کے لئے ان کے اشعار کا غائر مطالعہ کرنا ہوگا اور اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرنی ہوگی کہ شاعری کے میدان میں راشد طراز نے جو تجربے کئے ہیں انہیں اس روشنی میں سمجھنا ہوگا کہ اصل میں شاعری کیا چیز ہے اور یہ تجربے شاعری کی قدر و منزلت کو کہاں سے کہاں لے گئے ہیں۔ انہوں نے شاعری میں جو تجربے کئے ہیں وہ کس حد تک ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں یا یہ کہ ان تجربات میں شاعری کہاں تک پھیلتی چلی گئی ہے اور اس کا حاصل و مقصود کیا ہے؟ اگر پیش کردہ تجربات کا ان شعری عوامل سے کوئی گہرا تعلق نظر آتا ہے اور اس تعلق میں شاعری اپنے قد سے بلند ہو کر چلنے کی کوشش کرنے لگتی ہے تو یقیناً ایسے تجربات کو شاعری کا نیا باب تصور کرتے ہوئے اس کی تفصیلات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں مذکورہ شاعر کے معیار و قدر کو اس کے اپنے شخصی تناظر سے اوپر اٹھ کر سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس زاویے سے جب ہم راشد طراز کی شاعری کو دیکھتے ہیں تو ہمیں راشد طراز ایک عظیم شاعر نظر آتے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے اپنے شعری سفر میں جو تجربات کئے ہیں وہ بہت اہم اور محترم ہیں۔ انہوں شعری تعبیرات کو غیر محسوسات کے علاوہ ان عزائم اور فکری تمناؤں کی طرف بھی ڈال دیا ہے جو ایسی تمثیلات پیش کرتی ہیں جس کے ذریعہ حسن تخلیق کے مختلف شعبوں کو

ان کی تاویلات کے سہارے یقینی بنا کر اس کی وہی تاویل کی جائے جو برسوں کی کوشش میں ترتیب نہ پا سکی ہو۔ اپنی جزویات میں خلوت کے اشاروں اور تمثیلات کے ساتھ حقیقی ترتیب قائم ہوتی ہے۔ اور اس کے مقابل جب ہم کسی تفصیل سے کام لیتے ہیں اور کوئی مفروضہ اس کے برعکس نظر آتا ہے تو باقی تمام شعری صورتیں اپنے معانی کی پابند ہوتے ہوئے بھی اپنی پیش کش میں نمایاں نظر آنے لگتی ہیں۔ یہ اہتمام اسی شاخسانے کا نتیجہ ہے جو شاعری کے گراں قدر تیور سے پیدا ہوتا ہے۔ راشد طراز نے اپنی شاعری میں بیان کی ایسی ترتیب قائم کی ہے جو شعری تعبیرات کو معانی اور عمل کے اسرار سے دور رکھتی ہے اور شعری تخلیق کی ایسی تعبیر ہمارے سامنے لاتی ہے جو اپنی تاویل خود کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ راشد طراز نے اپنی شعریات کی تعمیر میں حسن معنی کی نئی جہت کو ٹٹولتے ہوئے وابستگی کا ایک نیا راستہ ہموار کیا ہے۔ انہوں نے ایسی شعریت تعمیر کی ہے جو رواجی نہیں ہے بلکہ غیر تشکیلی ترتیب پر قائم ہوتی ہوئی ایک ایسی تخلیقی تحریک ہے جو اپنے اندر سے اپنی راہ نکالتی ہے۔ ہمیں ان کی شاعری میں ایسے مقامات سے گذرنا پڑتا ہے جو شعری ترتیب اور قیود کے شرائط سے پر ہوں مگر اپنے اظہار کے لئے تخلیق کی حسین راہوں سے گذر کر اپنی تخلیقی بصیرت کو اونچے درجے تک پہنچاتے ہوں۔ اس ضمن میں کسی ایسی شکل کا پیدا ہونا محال ہے جو شاعری کے حقیقی رنگ و آہنگ کو نئی ثمال سے آشنا کرے۔ صرف جذبات کا دبا رہنا یا کسی غیر ضروری واقعیت کا ان کے فنی اظہار سے اثر لینا بھی اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہو سکتی ہے۔ خیالات کے پرتو کو اس تاثیر کے حوالے کر کے اظہار کی نئی دنیا سے مربوط کر دینا راشد طراز کا فن ہے جو انہیں ناموزوں احوال میں بھی شعری تعمیر و تشکیل کی راہ میں نیا تیور دکھائی ہے۔ یہاں تک کہ جب شاعری میں اثر تاثر کی فضا کا پیدا ہونا تخریج معانی پر منحصر ہو اور کوئی بھی شعری تہذیب اس کے مقابلے پر نہ ہو تو شعری عمل کی دریافت مشکل ہو جاتی ہے۔ ایسی مشکل کا کام بھی راشد طراز کے یہاں آسان بن جاتا ہے۔ وہ اس عمل میں کھو سے جاتے ہیں اور ایسی ترسیل انجام دیتے ہیں جو درحقیقت ان کی شاعری کو غیر مانوس اشاروں سے نکال کر معلوم اور پسندیدہ راستوں پر لگا دیتی ہے۔ اچھی اور اعلیٰ شاعری کے شروط اور وسائل کو اس محدود فضا میں قید کرنا پھر اس سے اپنے رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کرنا کوئی آسان نہیں ہے:

عبادت میں اثر کیا ہے یہ آ کر دیکھ تو لیتے
مری آنکھوں کے صحرا میں سمندر دیکھ تو لیتے

ہم اپنی ذات کے اس آئینہ خانے میں مدت سے
جو خود سے آشنا رکھتے ہیں منظر دیکھ تو لیتے

بس ایک درد ہے باقی چہار سمتوں میں
کہاں ہے کوئی مرا غم گسار سمتوں میں

کبھی میں حرفوں سے مرہم کو ساز کرتا ہوں
کبھی میں لفظوں کو خنجر بنا کے چلتا ہوں

راشد طراز کے تین مجموعے 'کاسۂ شب' (۲۰۰۴ء) 'غبار آشنا' (۲۰۱۰ء) اور 'جہاں تک

روشنی ہوگی' (۲۰۱۶ء) منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان مجموعوں کی اشاعت نے ۸۰ء کے بعد اردو شاعری کے مزاج اور رنگ کو سمجھنے میں ہماری معاونت فرمائی ہے اور اسی کے ساتھ راشد طراز کی شاعری کے ذوق و وجدان تک پہنچنے میں بھی ہمارے ساتھ تعاون کیا ہے۔ راشد طراز کے یہ مجموعے اپنے نئے تیور اور اظہار کے مختلف انداز میں ہمیں شاعری کی ایسی دریافت تک لے چلتے ہیں جہاں کوئی شعوری عمل اپنے دائرے میں چلتے چلتے معاً لپک کر کسی دوسرے دائرے میں چلا جاتا ہے اور اس طرح شعری تعبیر کا یہ عمل خود اپنا نشان راہ بناتا ہوا اپنی منزلیں طئے کرتا ہو۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ راشد طراز نے جو شعری عمل پیش کیا ہے وہ نئے احساسات کی تلاش میں ایک پیش رفت ہے۔ راشد طراز کے نزدیک شاعری کی ایک ایسی فضا قائم ہوتی ہے جو انہیں ان تخلیقی قوتوں کے نشانات سے جدا کرتی ہے جو رواجی اثرات لئے ہوئے اپنا ہدف قائم کرتی ہیں۔ مروجہ طرز اظہار اور بیان کی تشکیلی جاذبیت سے اوپر اٹھ کر انہوں نے ایسے نشیب و فراز کا سامنا کیا ہے جو انہیں شعر عصر کے مزاج اور رنگ کے کسی بالاتر منزل تک لے جاتا ہے۔ ہم جب راشد طراز کی شعری تشکیل پر نظر کرتے ہیں تو وہ ہماری نظروں میں وہ ایک ترجیحی بنیاد اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ وہ ترجیحات ہیں جو انہیں قد آور بھی بناتی ہیں اور اپنے معاصر شعری رویوں میں ممتاز حیثیت کی حامل بھی۔ میں نے جب راشد طراز کی شاعری کو دیکھا تو وہ ہمیں ایسی شعری تہذیب کے نمائندہ نظر آئے جو اپنی دروں بینی اور دور اندیشی میں ایسے اسرار کو محیط ہیں جو شعری اظہار میں نہایت سبک رو اور تیز گام ہیں۔ وہ فرد کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے کبھی تو شخصی آزادی کی ایسی تعبیر پیش کرتے ہیں جو براہ راست انسان اور خدا کے تعلق سے بحث کرتی ہے اور انسانی خودی کو اس درجے تک پہنچانا چاہتی ہے جہاں خدا سے اس کا رشتہ ہم وار ہو جائے۔ کبھی وہ کائنات کی تخلیق اور اس کے اسرار کی جودت و وسعت میں گم نظر آتے ہیں۔ پھر اسی کیفیت کو اپنے شعری اظہار میں کامیابی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں اسرار ذات و کائنات' خدا اور بندے کا رشتہ' زندگی کی تفہیم' ارادے اور عمل کی تفہیم' جذباتی گیرائی اور تجرباتی تمثیل' معانی کا ارتقا' جذباتی تہداریت' بے یقینی کا درد' عشق کی وہ معنویت جو صرف خدا تک پہنچائے اور وعلائق سے ایک گونہ بیزاری بھی پائی جاتی ہے۔ ان تمام چیزوں نے جس ذات پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے وہ خود راشد طراز کی ذات ہے۔ ان تمام موضوعات نے ان کے تخلیقی عمل پر اجتماعی اثر ڈالا ہے جس کے نتیجے میں ان کے یہاں وہ مجموعی تاثر پیدا ہوا ہے جن سے وہ سب سے پہلے وہ خود متاثر ہوئے ہیں۔ اس اثر کے نتیجے میں ان کے یہاں ایک طرح کی مرکزیت قائم ہو گئی ہے یعنی ان کی شاعری خود اپنا مرکز بن گئی ہے۔ اس مرکزیت نے انہیں اپنے آپ میں گم ہونا اور غیر سے ایک گونہ اعراض کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ دوسرے وہ کسی بھی شئے کو اپنے آپ سے جدا

کرنا نہیں چاہتے۔ ہر بات اور ہر واقعہ کو وہ اپنی جانب منسوب سمجھتے ہیں لیکن کسی نادانی کا مظاہرہ کر کے اس سے جھگڑنا پسند نہیں کرتے۔ انہیں کہیں نہ کہیں اپنے انداز پر طمانیت بھی حاصل ہے۔ یہ طمانیت اور سکون ان کی اجتماعی زندگی کا حوالہ بھی ہے جسے کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی شخصیت پر مرکوز ہونے کی وجہ سے جو شان بے نیازی پیدا ہوتی ہے' وہ ان کا طرہ امتیاز ہے۔ اسی شخصی محور نے ان کے اندر وہ ترجیحات پیدا کی ہیں جو ان کی شاعری کو اسی شان بے نیازی سے متصف کرتی ہیں۔ یہی وہ خزینہ ہے جو ان کے یہاں تمام خزینوں کا منبع ہے۔ یہی وہ مرکز و محور ہے جہاں سے جہاں سے راشد طراز کی شاعری کے تمام قرینے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک اور اہم بات اپنے تخلیقی عمل پر ان کا ایقان بھی ہے۔ وہ جس حد تک علائق سے بے زار ہیں اسی حد تک اپنے تخلیقی عمل کے تئیں مطمئن بھی ہیں۔ ان کو خود اپنی شاعری پر جو شرح صدر ہے وہ ان کے کامیاب تخلیقی رویوں کا ضامن ہے۔ اپنی تخلیقات پر ان کا جو ایقان ہے اس سے یہ منتج ہوتا ہے کہ وہ اپنے تخلیقی رویے میں پختہ کار ہیں۔ اپنے اشعار کی دریافت میں وہ ہمیں معنی کے مختلف مدارج کی سیر کراتے ہیں اور ایسے رویوں کی شناخت میں وہ کبھی تاخیر سے کام نہیں لیتے بلکہ اپنی دیرینہ شناخت کو اور تعلق کو پس منظر بنا کر شاعری کا نیا مزاج مرتب کرتے ہیں۔ ان کے شاعری میں ایک دبیز سی پرت سنجیدگی کی بھی ہے جو مختلف قسم کے معنوی اظہار کی مدد سے سامنے آتی ہے۔ غرض اگر معنوی تناظر میں خلا بھی پیدا ہو گیا ہو تو بھی وہ اس کے شناخت میں تاخیر سے کام نہیں لیتے۔ راشد طراز اپنے دور کے ممتاز شاعروں میں ہیں۔ ان کا نام اردو شاعری میں ۸۰ء کے شعراء میں نہایت بلند و بالا ہے۔ اپنی شاعری کی نوعیت' طرز اور ادا میں ان کا مقام عصری شاعروں میں نمایاں ہے۔ ان کی شاعری ہمارے عہد کا ایک گراں قدر سرمایہ ہے۔

◂◂ ● ▸▸

C/o : Sahadab Hasan
14-A, Aliganj
Gaya Bihar 823001

شموئل احمد کی کتابیں

نام کتاب نملوس کا گناہ اور دوسری کہانیاں صفحات : ۲۵۶ قیمت : ۳۰۰/روپے ملنے کا پتہ : بک امپوریم، پٹنہ	نام کتاب: گرداب (ناول) صفحات : ۱۸۶ قیمت : ۲۲۰/روپے ملنے کا پتہ: ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس، دہلی

● **اعتراف**

● **حنا فردوس**

نہ بستی ہماری، نہ صحرا ہمارا.....ایک مختصر مطالعہ

دور جدید کے اردو غزل گو شعراء میں عالم خورشید کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کے مختلف شعری مجموعے نئے موسم کی تلاش، زہرِ گل، خیال آباد، ایک دریا خواب میں (ہندی) اور کارِ زیاں اپنے موضوعات اور مخصوص طرزِ اظہار کی بناء پر شعری ادب میں اپنی اہمیت و انفرادیت قائم کر چکے ہیں۔ ان کی شاعری انسان کی داخلی کیفیات، ذہنی اضطراب، سیاسی و سماجی انتشار اور عصرِ حاضر کے حقائق کا مؤثر اظہار ہے۔ انسان سماج کے بنائے گئے قوانین، وقت اور حالات کے جبر کے تحت پر لطف زندگی گزارنے کی کوشش میں اس طرح الجھ جاتا ہے کہ اسے منزلِ مقصود تک پہنچنے کی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی، اسے نہ تو بے فکری کے لمحات میسّر ہوتے ہیں اور نہ ہی روحانی تسکین مل پاتی ہے۔ انسان کی اس گومگو اور تذبذب کی کیفیت کا اظہار عالم خورشید کے ان دو مصرعوں میں واضح طور پر ملتا ہے:

نہ ہم اہل خرد ہیں نہ ہم اہل جنوں ہیں نہ یہ بستی ہماری نہ وہ صحرا ہمارا

''نہ یہ بستی ہماری نہ وہ صحرا ہمارا'' عالم خورشید کا چھٹا شعری مجموعہ ہے۔ زیرِ تبصرہ مجموعے کا عنوان انسان کی بے بسی، اس کی تہی دامانی اور دنیا کی بے ثباتی کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ کتاب عالم خورشید کی جدتِ طبع ذاتی خیالات و محسوسات، گہرے سماجی شعور اور عمیق مشاہدے کا دلکش مرقع ہے۔ ان کی شاعری سیاسی و سماجی انتشار، زوال پذیر تہذیبی اقدار، انسان کی لامتناہی خواہشات کی تکمیل میں الجھتی زندگی، اور ایک کے بعد ایک کئی منزل سر کرنے کی چاہت وغیرہ جیسے مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ بطور مثال چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ایسے بہت سے رستے ہیں جو روز پکارا کرتے ہیں کئی منازل سر کرنے کی اب تک چاہت باقی ہے

شہرِ تمنّا! باز آیا میں تیرے ناز اٹھانے سے ایک شکایت دور کروں تو ایک شکایت باقی ہے

الجھتی جا رہی ہے بس اسی چکّر میں اب دنیا یہ ہونا بھی ضروری ہی وہ ہونا بھی ضروری ہے

اعتبار آتا نہیں دل کی صداقت پر اسے یہ زمانہ چاہتا ہے ہم اداکاری کریں

آج کے سائنسی دور میں تو یہ عام بات ہے کہ انسان کے اندر صرف 'میں' کا جذبہ رہ گیا ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے لوگوں سے بالکل قطع تعلق ہو گیا ہے، ہر جگہ وہ صرف خود کو سرخرو ہوتے دیکھنا چاہتا ہے، اپنی خامیوں سے انجان دوسروں کی نقطہ چینی میں مشغول ہے۔ عہد حاضر کی تیز رفتار زندگی میں انسان پر آسائش زندگی اور

ظاہری خوشیوں کے لیے ممکن حد تک جدو جہد کرتا ہے۔تشنہ آرزوؤں کی تکمیل میں محو ہو کر زندگی کے اصل مقصد کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔چند پل کی مسرّتوں کے لیے مکر وفریب کی پرکشش دنیا میں گم ہو کر اپنی معصومیت، سادہ دلی، صداقت، پرخلوص جذبات اور روحانی سکون کو نظر انداز کر دیتا ہے۔عالم خورشید نے اپنی غزلوں میں بے ساختگی کے ساتھ انسان کی اس خودغرضی، بے راہ روی، ظاہری دکھاوے اور ایک دوسرے کے لیے نفرت وحسد کے جذبے کی مؤثر ترجمانی کی ہے۔مندرجہ ذیل اشعار میں ان کے لہجے کے کرب، کسک اور طنزیہ آہنگ کا اندازہ ہوتا ہے:

بظاہر سب کسی کے ساتھ ہیں محو سفر لیکن — بہ باطن اب کسی کا ہم سفر ہوتا نہیں کوئی
اداس ہو گئے اک پل میں شادماں چہرے — مرے لبوں پہ ذرا سی ہنسی کے آنے سے
کتنی محبت سے وہ نصیحت کرتے ہیں — جو مجھ سے دن رات عداوت کرتے ہیں

مصلحت اندیشی اور حقیقت سے لاتعلقی آج کے دور کا اہم مسئلہ ہے۔وقت اور حالات کے تحت لوگوں کے تبدیل ہوتے رویّے عالم خورشید کو گہرے دکھ سے دوچار کرتے ہیں۔انھیں اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ بظاہر تو بہت سے لوگ ہمارے دوست اور غم گسار نظر آتے ہیں لیکن مشکل حالات میں یہ سبھی لوگ ہمارے ساتھ ہوں گے، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔کون اعتبار کے قابل ہے، کس پر یقین کیا جائے اور کس کو اپنا ہمراز بنایا جائے، یہ طے کرنا ایک دشوار کن فیصلہ ہے۔عالم خورشید کی غزلوں میں سماج کے ان تمام مسائل کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں۔معاشرے کے نامساعد حالات سے پریشان تو سب ہیں مگر ان کو دور کرنے اور نا آسودہ حالات سے مقابلہ کرنے کی ہمّت کسی میں نہیں ہے، سب کے سب خوف ومفاہمت کے تحت اپنے لبوں کو مقفل کیے بیٹھے ہیں۔عالم خورشید افراد کو بے حسی کا احساس دلاتے ہوئے اپنے تاسّف کا اظہار اس دانش مندی کے ساتھ کرتے ہیں کہ انسان اپنی بے ضمیری پر درحقیقت ندامت محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس کے اندر اپنی تمام کوتاہیوں اور خامیوں کو دور کرنے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور یہی فنکارانہ انداز جدید غزل گو شعراء میں عالم خورشید کی انفرادیت کو قائم کرتا ہے۔مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بری اب ہو گئی دنیا شکایت سب کو ہے — کوئی کوشش نہیں کرتا اسے بہتر بنانے کی
دل روتا ہے، چہرہ ہنستا رہتا ہے — کیسا کیسا فرض نبھانا ہوتا ہے
ہمیں تھا خوف کہیں یار کم نہ ہو جائیں — سو مشکلوں میں کسی کو بھی آزمایا نہیں

عالم خورشید کے کلام میں اخلاقی اقدار کی پامالی، فرسودہ روایات، نفسیاتی پیچیدگی اور زمانے کی تغیر پذیری کا مؤثر ذکر ملتا ہے۔ان کی غزلوں میں معاشرے کے چھوٹے بڑے تمام مشکلات، ٹوٹتے بکھرتے انسانی رشتے، ملک وقوم کی تنزلی، افراد کی بے بسی وتنہائی کی فکر انگیز ترجمانی ملتی ہے لیکن عالم خورشید کا یہ کمال ہے کہ وہ ان مایوس کن حالات سے ناامّید نہیں ہوتے بلکہ ہمّت واستقلال کے ساتھ ان سے نجات کی راہ نکالنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔وہ پر یقین ہیں کہ وہ وقت بھی جلد ہی آئے گا جب درد وکرب کے یہ لمحات دور ہو جائیں گے۔ان کی غزلوں میں انسان کی اپنے اس

روشن خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی خواہش نظر آتی ہے، جو گہری سیاہ رات میں کہیں مدغم ہو گیا ہے۔ان کے اشعار کو پڑھ کر صبر وضبط، بلند حوصلگی اور جوش وولولے کا احساس ہوتا ہے، اور ذہن ودل کو تازگی وتوانائی حاصل ہوتی ہے۔عالم خورشید کی شاعری نوجوان نسل کو صحت مند سوچ اور فکر سے ہمکنار کرتی ہے اور انسان کو خودداری وحق طلبی کا درس دیتی ہے:

ہمارا حق طلب کرنا تمھیں اچھا نہیں لگتا — ہمیں آتا نہیں ہے کاسہ فریاد ہو جانا
اتنا مشکل بھی نہیں یار! یہ موجوں کا سفر — ہر طرف کیوں تجھے گرداب نظر آتا ہے
کیوں ہراساں ہے ذرا دیکھ تو گہرائی میں — کچھ چمکتا سا تہِ آب نظر آتا ہے

عالم خورشید کے یہاں نہ صرف سیاسی وسماجی حالات اور زندگی کے مختلف مسائل کے موضوعات ملتے ہیں بلکہ رومانی اور عشقیہ رنگ بھی ان کی غزلوں کو مزید دلکش بنا دیتے ہیں۔ان کی شاعری میں محبوب کے حسن وعشق، ناز وادا اور ہجر ووصال کی باتوں کے بجائے عاشق کی بے خودی اور بے لوث خیالات کا اظہار ملتا ہے۔عالم خورشید کے خیال میں محبت انسان کو خودغرض نہیں بناتی بلکہ یہ جذبہ اسے پر وقار اور سنجیدہ بناتا ہے۔محبت انسان کو حسنِ آداب سکھاتی ہے۔اس جذبے میں مبتلا ہو کر انسان اپنی خوشیوں اور خواہش سے بے پرواہ ہو کر محبوب کے لیے فکرمند ہوتا ہے۔عالم خورشید محبت میں گرفتار عاشق کے دلی خیالات وکیفیات کو کچھ اس انداز میں پیش کرتے ہیں:

یقین ہوتا نہیں شہر دل اچانک یوں — بدل گیا ہے کسی اجنبی کے آنے سے
کہیں پہ جسم کہیں پر خیال رہتا ہے — محبتوں میں ہے کہاں اعتدال رہتا ہے
محبت! خوب یہ انجام ہے اہل محبت کا — تجھے آباد کرنا اور خود برباد ہو جانا

اسی طرح محبوب کی بے رخی، ناراضگی، بے گانگی، نظر اندازی اور منفی رویے کے جواب میں صبر وضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے عالم خورشید محبوب کے لیے خدا سے دعا گو ہیں:

خدا انھیں بھی ہو توفیق اس عبادت کی — محبتوں کو جو کارِ زیاں سمجھتے ہیں

گویا ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عالم خورشید کے کلام میں زندگی کے مختلف گوشے، فرد کی داخلی کیفیات، مقصودِ زندگی اور عشق ومحبت کے جذبات کی خوبصورت اور دلفریب آمیزش ملتی ہے۔ان کے اشعار ان کی دور اندیشی اور فکر انگیزی کا پتہ دیتے ہیں۔وہ اپنے جذبات وخیالات کو پیش کرنے کا فنکارانہ ہنر رکھتے ہیں۔ان کے لہجے کا وقار اور متانت وسنجیدگی اشعار میں اثر آفرینی کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔مانوس الفاظ کا برمحل استعمال، عام فہم زبان، ردیف وقافیہ کا حسن التزام اور خوبصورت پیرایۂ بیان ان کی غزلوں کو انفرادیت بخشتے ہیں۔مجموعی طور پر عالم خورشید کا یہ شعری مجموعہ فکر وفن کے اعتبار سے شعر وادب میں ان کی شہرت ومقبولیت میں اضافے کا ضامن ہے۔

◂◂ ● ▸▸

C/o: Dr. Imtiyaz Ahmad Dept of Urdu
AMU Aligarh Mob: 9760664908

● محمد غالب نشتر

تشدد کی جمالیات اور احمد رشید کے افسانے

مابعد جدید رجحان نے جہاں ایک جانب اردو کے تمام اصناف کو متاثر کیا، وہیں اردو افسانہ بھی اس کے زد سے نہ بچ سکا بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ اصنافِ شعر میں نظم اور اصنافِ نثر میں افسانہ، اس لحاظ سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں جن میں جدیدیت نے اپنا نقش ثبت کیا اور مابعد جدیدیت نے بھی انہی اصناف کو نشان زد کیا۔ جس طرح سے جدیدیت کو ترقی پسند تحریک کی ضد کہہ بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی، ٹھیک اسی طرح مابعد جدیدیت کو جدیدیت کے روبرو رکھ سکتے ہیں۔ جدید دور کے جو امتیازات فن پاروں پر اثر انداز ہوئے تھے، انہی خیالات کو ردّ و بدل کے ساتھ مابعد جدید فن کاروں اور ناقدین نے روا رکھا مثلاً علامت کا عنصر جدید دور کا نشانِ امتیاز تھا تو نئی تخلیقات میں بھی علامت کو برتا گیا لیکن ہلکی سی ترمیم کے ساتھ۔ دوسرے خصائص کا بھی اسی طور پر اطلاق کر سکتے ہیں۔ مابعد جدید دور میں دو طرح کے افسانہ نگار ایک ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہیں۔ پہلی نسل کے وہ افسانہ نگار ہیں جو ایک زمانے سے افسانے لکھ رہے تھے اور دبیز علامات برتتے تھے لیکن بعد میں انہوں نے اہمال اور اشکال سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے نئی علامات وضع کیں اور قاری کا خاص خیال رکھا۔ دوسری نسل کے افسانہ نگاروں کے سامنے ایک واضح تصور سامنے آچکا تھا لہٰذا انھیں ذہنی کشمکش سے نہیں گزرنا پڑا۔ ان کے سامنے دبیز علامات کا تصور ختم ہو چکا تھا۔ اسی لیے بعد کے افسانہ نگاروں نے فرسودہ علامات کو ترک کر کے نئی علامات کے رجحان کو عام کیا۔ انہی افسانہ نگاروں کی فہرست میں احمد رشید (علیگ) کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ان کے تاہنوز دو افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ دونوں مجموعوں میں کئی ایک افسانے ایسے ہیں جن کی قرأت کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں جبر و تشدد کا توانا اظہار ہے۔ بن باس کے بعد، ایک سہما ہوا آدمی، بی بی بولی، ایک خوبصورت عورت اور حاشیے پر اس ضمن میں اہم ہیں۔ سب سے پہلے افسانہ ''بن باس کے بعد'' کو لیتے ہیں۔ یہ کہانی فرسودہ مذہبی رائیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔ افسانہ میں اسلامی اور ہندو متھ کی معنویت عصری تعاون میں واضح کی گئی ہے۔ فساد کے بعد جو اثرات انسان کی زندگی پر نمایاں ہوتے ہیں ان کا اظہار افسانہ نگار نے بڑی چابکدستی سے پیش کیے ہیں۔ فنّی نقطۂ نظر سے بھی یہ کہانی بڑی موثر اور منفرد ہے۔ افسانہ کا آغاز قرآن کے سورہ بقرۃ کی کچھ آیتوں کے ترجمہ

سے کیا گیا ہے جس کی زبان بھی افسانہ نگار نے تخلیقی اور علامتی اختیار کی ہے۔

کہانی ''بن باس کے بعد'' فرسودہ مذہبی روایتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔ اس میں ماورائی اساطیری فضا بندی کی گئی ہے، ساتھ ہی افسانہ میں اسلامی اساطیر اور ہندو متھ کی معنویت کو عصری صورت حال کے تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فساد کے بعد جو اثرات انسان کی زندگی پر نمایاں ہوتے ہیں ان کا اظہار افسانہ نگار نے بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ فنّی نقطۂ نظر سے بھی یہ کہانی بڑی موثر اور منفرد ہے۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

> ''بھئی مرنا تو سب کو ہے'' دائیں ہاتھ پر بیٹھے ہوئے پنچ نے تیر پھینکا۔ جانکی نے تیر کی کاٹ کو برداشت کیا۔ 'ہاں' میرا قصور یہ ہے کہ میں موت سے ڈر گئی... کیوں ڈر گئی...؟ کیوں نا نیل کنٹھ کی طرح زہر اپنے گلے میں انڈیل لیا... لیکن موت اگر شکتی پر قابض ہو جاتی تو....؟ کیا کوئی موت سے نہیں ڈرتا؟ جب جھیر ساگر من تھن ہوا تو دیوتاؤں نے وش پینے سے کیوں انکار کر دیا تھا؟

علائم نگاری اور استعاراتی اسلوب سے فساد کے منظر کو تخلیقی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ افسانہ میں جانکی بنیادی کردار ہے جو چودہ دنوں تک فساد میں گھری رہتی ہے اور جب وہ اپنے گھر واپس ہوتی ہے تو اس کو اپنی پاکیزگی ثابت کرنے کے لیے اگنی پریکشا سے گزرنا ہوتا ہے، باوجود اس کے کہ وہ اگنی پریکشا میں کامیاب ہو جاتی ہے پھر بھی مرد کے طنز و تعریض کا نشانہ بنتی ہے۔ وہ اپنوں کے نازیبا سلوک سے تنگ آجاتی ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہوتی ہے کہ وہ جہاں تھی، وہ اس کے لیے معقول جگہ تھی۔ اس افسانے کو پڑھتے ہوئے راجندر سنگھ بیدی کے افسانے ''لاجونتی'' کی یاد آتی ہے جہاں 'لاجو' کے ساتھ بھی یہی واقعہ رونما ہوتا ہے۔ بیدی کے افسانے کے ماسوا احمد رشید کے افسانے میں نسائی حسیت کی مختلف جہتوں کو فن کارانہ شعور کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی عورت کی جذباتی کیفیات اور اس کے اندرونی کوائف کو بڑی چابکدستی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کہانی میں ''طوطا'' ان فرسودہ روایتوں پر جن پر انسان عقل و خرد کی آنکھیں بند کر کے سختی سے پابند رہتا ہے، کی علامت کے طور پر وارد ہوتا ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مردوں نے عورت کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر دیا ہے حالاں کہ وہ اس کائنات کے آدھے کی حصہ دار ہے۔ اس جدید اور ترقی یافتہ دور میں بھی عورت مرد کے آگے مجبور اور بے بس نظر آتی ہے۔ مرد ہی اسے اپنی شہوت اور ہوس کا شکار بناتا ہے، مرد ہی اس کی اگنی پریکشا لیتا ہے، مرد ہی قاتل ہے اور منصف بھی وہی ہے۔ انصاف ملنے کے باوجود بھی اس کی زندگی طنز و تعریض کا تازیانہ بن جاتی ہے۔ ''جانکی'' کی عصمت بھلے ہی محفوظ رہی ہو جو اگنی پریکشا سے بھی ثابت ہو چکی ہے لیکن پھر بھی

بدنامی کا طوق اس کے گلے میں ڈال دیا گیا ہے۔ افسانہ کی معنویت اس امر میں پوشیدہ ہے کہ بہ ظاہر کہانی جانکی اور رگھوبیندر کے اردگرد گھومتی ہے لیکن بین السطور میں رام اور سیتا کی کہانی (جو چودہ سال کا بن باس کاٹ کر ایودھیا واپس آتے ہیں) معلوم ہوتی ہے۔ چوں کہ اس درمیان میں راون سیتا کا ہرن کرتا ہے اور سیتا کو اگنی پریکشا سے گزرنا پڑتا ہے۔ کامیابی کے بعد بھی کہانی ختم نہیں ہوتی بلکہ اگنی پریکشا کا یہ سلسلہ آگے بھی چلتا رہتا ہے۔ جب ایک دھوبی گھر سے غائب ہونے پر اپنی بیوی کو مار پیٹ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ''میں رام تھوڑی ہوں جو انہوں نے سیتا کو گھر میں رکھ لیا تھا۔'' رام کے کانوں میں جب یہ آواز آتی ہے تو وہ سیتا جی کو لکشمی کے ہاتھوں جنگل میں چھڑواتا ہے۔ اس طرح کہانی کا عنوان ''بن باس کے بعد'' بڑا معنی خیز ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ سیتا کو 'جانکی' اور رام کو 'رگھوبیندر' بھی کہا جاتا ہے۔

رام چند ایک دیوتا تھے۔ اس کے باوجود انسانوں کے اس سماج میں وہ بھی مجبور نظر آتے ہیں اور سیتا کے حق میں وہ ایک مذاہب فیصلہ نہیں لے سکے لیکن ''بن باس کے بعد'' کا راگھوبیندر پنجڑے سے طوطے کو آزاد کر دیتا ہے۔ راگھوبیندر، جانکی کو گلے سے لگا لیتا ہے۔ افسانہ کا انجام طربیہ اور پُر امید ہے اور معنی خیز جملوں پر ختم ہوتا ہے۔ اس طرح یہ کہانی روایت، مذہبی اجارہ داری کے خلاف صدائے احتجاج کی طرف نشاندہی بھی کرتی ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں فسادات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ فساد کی یلغاریں تو پوری دنیا جھیل رہی ہے اور ہر ملک اس مسئلے کے تئیں ہراساں ہے۔ فسادات میں انسانوں کی ایسی جذباتی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہر شخص اس کو صاف طور پر محسوس کر سکتا ہے۔ فن کار چوں کہ زمانے کا نباض ہوتا ہے، اس لیے فن کار کا متاثر ہونا کوئی عجیب بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ادب میں بھی فسادات کا ادب وافر مقدار میں رقم کیا گیا ہے۔ احمد رشید کی بھی چند کہانیاں اس ضمن میں حوالے کے طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ افسانہ ''سہما ہوا آدمی'' میں فساد کو ہی براہ راست موضوع بنایا گیا ہے جس میں مذہب کی بنیاد پر انسانیت کا قتل کیا جاتا ہے۔ اس کہانی کا کردار فساد سے بچنے کے لیے اپنے ٹانگوں کے درمیان کا مذہب چھپا کر بھاگنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ اس کی شہادت کے بعد جب اس کی لاش ملتی ہے تو اس کا عضو تناسل غائب ہوتا ہے۔ اس افسانے میں کہانی کار نے فساد کی اس نفسیات کی جانب اشارہ کیا ہے جہاں مذہب اندھی تقلید کے نتیجے میں جنم لیتا ہے اور وحشیانہ عمل اختیار کر لیتا ہے۔ فساد کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ ایک عورت کا استحصال کرتے ہوئے انسانیت شرمسار بھی نہیں ہوتی ہے۔ افسانہ ''بی بی بولی'' کا موضوع فساد میں گھری عورت کے ساتھ ہوئے استحصال کی جانب اشارہ کرتا ہے، عورت کے ساتھ ہوئے ظلم و ستم کو سنتے ہوئے لوگوں کے جسم کانپ اٹھتے ہیں لیکن اس عمل کو انجام دیتے ہوئے لوگوں کی حس مر جاتی ہے اور وہ اس کام کو فرض سمجھ کر انجام دیتے ہیں۔ اسی ضمن کی ایک کہانی ''ایک خوبصورت عورت'' بھی ہے

جہاں عورت ہی ہوس کا شکار بنی ہے۔ یہ کہانی یوں تو گجرات میں ہوئے فساد کی یاد دلاتی ہے جہاں انسانیت کے ساتھ کھلواڑ کا ناٹک کیا گیا اور عورت کو استعمال کیا گیا۔ فساد میں گھری عورت کو لوگ نعمت غیر مترقبہ تصور کرتے ہیں اور گھناؤنی حرکت کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اس افسانے کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''صالح تلملا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ آنکھیں سرخ آلود ہو گئیں۔ دھوپ کی سرخی سے تپش بڑھ گئی تھی، ہوا تھم گئی تھی۔ تڑک کر بولے ''زمین پر پڑے گندگی کے ڈھیر کو صرف دکھاتے ہو.... اور ہم اُسے اٹھانے کی بات کرتے ہو' صالح نے قریب پڑے ہوئے مٹی کے ڈھیر پر دھوپ پھیل چکی تھی، کی طرف اشارہ کیا۔

احمد رشید کے موضوعات کی بات کریں تو پتا چلتا ہے کہ انھوں نے تمام بڑے موضوعات کا اپنے افسانوں میں احاطہ کیا ہے، خواہ وہ انسانیت کی بے مروتی کا بیان ہو یا دنیا سے ختم ہوتی تہذیب کا المیہ، عدم مساوات کا رونا ہو یا سیاسی رسہ کشی کا عالمی منظر نامہ، عورتوں کا استحصال ہو یا مفلسی و دنیا کی بے ثباتی کا ذکر، الغرض ہر موضوع پر ان کے افسانے ہمیں پڑھنے کو مل جائیں گے۔ سیاسی رسہ کشی پر ان کی کئی کہانیاں ہیں جن میں ''ناخدا''، ''مداری''، ''حاشیہ پر'' اور اندھا قانون'' قابل ذکر ہیں۔ افسانہ ''ناخدا'' کا موضوع امریکہ کی چودھراہٹ ہے۔ آج پوری دنیا میں جو افراتفری نظر آتی ہے اس کا وہی ذمے دار ہے۔ اس پس منظر میں احمد رشید نے کھلے طور پر یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ امریکا کی چودراہٹ کا زوال ہونے والا ہے کیوں کہ ہر عروج کے بعد زوال کا آنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح ''مداری'' اور ''حاشیہ پر'' جیسے افسانے بھی سیاسی موضوعات پر مبنی کہانیاں ہیں جہاں پر اقلیتی اور اکثریتی طبقے میں کشمکش جاری ہے اور ان کے تصادم سے طرح طرح کے مسائل پنپنے لگتے ہیں۔ ساتھ ہی اس افسانے میں مسلمانوں کی تہذیبی شناخت پر بھی راوی سوالیہ نشان قائم کرتا ہے کہ اپنی شناخت کا مسئلہ بہت باریک اور ناقابل برداشت ہے۔ افسانہ ''مداری'' میں تو سیاسی رہنماؤں کو مداری کی تمثیل کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ بہ ظاہر یہ کہانی مداری کے تماشے اور اس کی چرب زبانی کے ذریعہ پیش ہوا ہے لیکن اس کے پس منظر میں گنگا جمنی تہذیب کو پیش کرنے کی عمدہ کوشش ہے۔ مجموعی طور پر یہ بات صاف طور پر کہی جا سکتی ہے کہ احمد رشید کے فکشن کا ایک خاص ڈکشن ہے اور موضوع کے ساتھ ٹریٹمنٹ کا اپنا ایک خاص انداز ہے جسے وہ علامات، استعارات اور تشبیہات کے ذریعے بیان کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں اور بہت حد تک کامیاب بھی ہیں۔ ان کی کہانی ایک ہی قرأت میں ختم کرنے کا تقاضا کرتی ہے، ورنہ کہانی کا سرا ذہن سے پھسل جاتا ہے اور قاری، کہانی میں استعمال شدہ علائم سے پوری طرح واقف نہیں ہو سکتا۔ یہی ان کے افسانوں کا فنی اختصاص ہے۔

◂◂ ● ▸▸

Lane No. 3 Sallar Colony
Bariatu, Ranchi 834009

● سلمان عبدالصمد

''کربِ جاں'' صنفِ مثنوی کی تجدید

ایوانِ قصص میں داستان اور مثنوی کے درمیان جو یکجائی رہی، اس میں گردشِ ایام نے انتہائی دوری پیدا کردی۔ داستان میں تو ایسی ایسی تبدیلیاں ہوئیں کہ متعدد نئی اصناف وجود میں آگئیں لیکن داستان سے یکجائی کے باوجود صنف مثنوی، قصے سے اس قدر بچھڑ گئی کہ اس کا اصل سراغ ملنا مشکل ہوگیا۔ داستان کا سفر، ناول کی وادیوں سے ہوتا ہوا افسانہ اور افسانچہ کے ایوان تک پہنچ گیا تاہم مثنوی کی روایت پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنے قدم آگے بڑھانے کے بجائے پیچھے کھینچ لیے ہوں۔ یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ مثنوی اپنی مکمل شناخت کے ساتھ آگے بڑھی، جدید شاعری کی دنیا میں بھی قدم رکھا، بلکہ ایک طرح سے دیکھا جائے تو جدید شاعری کے اولین چراغوں میں مثنوی کا ہی تیل اور پلیتہ نظر آئے گا۔ اپنی قدامت اور قصوں سے مناسبت کی بنیاد پر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مثنوی آج بھی اپنا دم دکھاتی۔ نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ کبھی افسانہ تو کبھی افسانچہ کی صورت میں آگے بڑھتی۔ جدید شاعری کے ابتدائی دور میں محمد حسین آزاد، مولانا حالی، علامہ شبلی وغیرہ نے تو ضرور مثنوی کی ہیئت میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود صنفِ مثنوی اپنی مکمل شناخت اور تمام ترفنی لوازمات کے ساتھ آگے نہ بڑھ سکی۔ جس طرح داستانوں سے مافوق فطری عناصر غائب ہوئے اور ناول کا فارم مضبوط ہوا، اسی طرح مثنوی کے ساتھ بھی ہونا چاہیے تھا۔ شاعروں کو چاہیے تھا کہ مثنوی سے عشقیہ اور داستانوی فضا کو ختم کرکے اسے نئے موضوعات سے ہم آہنگ کرتے۔ ان میں سے کچھ نے کوشش بھی کی مگر فنی اور موضوعاتی سطح پر مثنوی میں جو تبدیلی آئی، وہ ایک صنف کو زندہ رکھنے کے لیے کافی نہیں تھی۔ اس لیے مثنوی کی مضبوط روایت پیچھے چھوٹتی چلی گئی اور داستان کی روایت سے نکلی ہوئیں افسانوی اصناف مثلاً ناول، افسانہ اور افسانچہ وغیرہ مضبوط و مربوط ہوتی گئیں۔ یہ اور بات ہے کہ ترقی پسند شاعروں نے صنفِ مثنوی کو بھی اپنی اظہار کا ذریعہ بنایا اور اسے کچھ آگے بڑھانے کی کوشش کی مگر ترقی پسندی کے زمانہ میں مثنوی کے فارم میں لکھی گئیں بیشتر مثنویوں کے ماتھے پر مثنوی کا جھومر تو ہے مگر وہ اپنے جسم و جان سے مثنوی کے بجائے طویل نظم ہی معلوم ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ ان کے بناؤ سنگار میں اتنی سستی و کاہلی برتی گئی ہے کہ ان کے بدن سے مثنوی کا رنگ و آہنگ اور گداز پن جاتا رہا ہے۔ نہ ان میں مثنوی جیسی روانی رہی، نہ ہی بیانیہ میں سبک رفتاری۔ فقط سیاسی

ابال کے ساتھ قافیے پر قافیہ بٹھانے کی روایت جاری رہی۔ اس لیے ان مثنویوں کو سیاسی نظمیں ہی کہنا بہتر ہوگا۔

مثنوی اور داستان کی یکجائی یا ان دونوں میں پائی جانے والی مماثلت، جس طرح مثنوی کے فروغ میں اہم وجہ ثابت ہوسکتی تھی، اسی طرح فنی سطح پر بھی مثنوی میں آگے بڑھنے کی کچھ قدر اشتراک موجود ہیں، جس کا اعتراف سخت گیر نقادوں نے بھی کیا۔ داخلی و خارجی اور وسعتِ مضامین کے تناظر میں جہاں امداد امام اثر نے صنفِ مثنوی کی تحسین کی، وہیں شبلی نے کہا 'یہ صنف تمام انواع کی بہ نسبت زیادہ مفید، زیادہ وسیع، زیادہ ہمہ گیر ہے'۔ ان کے علاوہ حالی، جلال الدین احمد جعفری، عبدالقادر سروری، کلیم الدین احمد نے واقعاتی ارتقا، تسلسل و تسہّل، ارتباط واطناب اور سحر انگیزی کے تناظر میں اس صنف کو انتہائی مفید تسلیم کیا ہے۔ اس لحاظ سے بھی مثنوی کو آج مسلّم و مکمل صنف کی طرح باقی رہنا چاہیے تھا لیکن مثنوی کی روایت پر نظر ڈالنے سے مایوسی ہوتی ہے کہ مثنوی، مثنوی نہ رہی۔ قصائد کی کم ہوتی ہوئی اہمیت کا جواز تو مل جاتا ہے، مگر مثنوی کا نہیں۔ اس لیے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ شاعری کے پروں پر پرواز کرنا بے شمار افراد کو پسند تو ہے، لیکن پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جانے والی کسی شعری صنف کا کسی کو پاس ولحاظ نہیں۔ ظاہر ہے مثنوی میں مشق و مزاولت، قافیہ کی جستجو، شعری تسلسل، موضوعاتی حسن اور لسانی جمالیات کے لیے ذہن و دماغ پر زور ڈالنا ضروری ہے، اس لیے شاید جو کھم بھری صنف کو ہاتھ لگانا کسی نے گوارا نہیں کیا۔ اگر مرورِ زمانہ کی بنیاد پر صنفی لحاظ سے آج مثنوی میں ناپسندیدگی کی کوئی وجہ پیدا ہوجاتی تو غضنفر کی مثنوی ''کرب جاں'' کی طرف کسی کا التفات نہیں ہوتا۔ اس نئی مثنوی کی طرف اہل علم اور ادب دوست قارئین کی رغبت از خود یہ دلیل فراہم کرتی ہے کہ مثنوی مری نہیں ہے۔ اس میں بس نئی روح پھونکنے کی ضرورت ہے۔ اس کے تمام ترفنی لوازمات اور ہیئتی انسلاکات کے ساتھ تجدید کی ضرورت ہے، جس طرح غضنفر نے نئی روح پھونکنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے یہ کہنا بجا ہے کہ انھوں نے اپنی مثنوی کے ذریعے ہیئتی و موضوعی دونوں سطح پر مثنوی کی تجدید کی ہے۔ ہوسکتا ہے ان کے تجدیدی رویوں پر کچھ اشکالات ہوں۔ آئندہ سطور میں ہم بھی چند ایک اشکال سے پردہ اٹھائیں گے۔

''کرب جاں'' سیاسی تناظر یا شہر آشوب کی فضا میں پروان چڑھنے والی پہلی مثنوی نہیں ہے، بلکہ پہلے بھی اس موضوع پر متعدد مثنویاں لکھی گئیں۔ کیفی اعظمی، اختر انصاری، سردار جعفری، جانثار اختر، عبدالمجید شمس عظیم آبادی وغیرہ نے اپنی مثنویوں میں سیاسی موضوعات پیش کیے۔ ان میں سے کئی مثنویاں موضوعاتی سطح پر غضنفر کی مثنوی سے مماثلت بھی رکھتی ہیں، لیکن فن کاری اور تخیلاتی آنچ کے تناظر میں ''کربِ جاں'' سے کم تر نظر آتی ہیں۔ ترقی پسندوں کی قابل ذکر مثنویوں میں کیفی اعظمی کی خانہ جنگی، سردار جعفری کی جمہور اور جانثار اختر کی امن نامہ اہم ہیں۔ ان سے قطع نظر، عبدالمجید شمس عظیم آبادی کی 'یادِ وطن' اور اختر انصاری کی ''درد و داغ'' جیسی جدید مثنویوں سے یہاں چند مثالیں پیش کرکے غضنفر کا موازنہ مناسب رہے گا:

چہروں پہ زمانے کی خراشوں کے نشاں — اندر کی سسکتی ہوئی لاشوں کے نشاں
جو قتل کیے جائیں باعلان دہل — نیزوں پہ لیے جائیں باعلان دہل

پر مکر سیاست کے مکائد کے شکار — بدکیش قیادت کے مفاسد کے شکار
(اختر انصاری)

تفرقے اس طرح بڑھتے گیے — چین سے دونوں مل کے رہ نہ سکے
بھائی بھائی میں تھا جو جنگ وجدال — آخرش دونوں ہی ہوئے پامال
اتری ہند میں اٹھا طوفان — کسی صو بے میں نہ تھا امن وامان
(عبدالمجید شمس عظیم آبادی)

گیا ناگ پھر سے بدن میں سما — لگی ہونے پھر سے قیامت بپا
بپھر تا ہوا ، پھنپھنا تا ہو ا — نگاہوں کو شعلہ دکھاتا ہوا
نئے عزم سے ناگ آگے بڑھا — غضب ناک ہوکر زمین پر چلا
کہیں جاکے پھن اس نے پھیلا دیا — کہیں پھونک سے سب کو دہلا دیا
غضنفر

ان اشعار کے تناظر میں یہ بات پایہ وثوق تک پہنچتی ہے کہ غضنفر نے موضوعاتی سطح پر بہت کچھ نیا نہیں پیش کیا ہے۔ البتہ تاریخی حسیت سے رشتہ استوار رکھتے ہوئے انھوں نے ہندوستانی تاریخ کے مختلف مراحل کو جس تسلسل کے ساتھ ہمارے سامنے رکھ دیا، وہ کسی مثنوی میں نہیں ملتی۔ بیشتر مثنویوں کی حیثیت محض سیاسی نظم؛ یا پھر راست بیانیہ میں پیش آمدہ مسائل کے تجزیہ کی ہوجاتی ہے۔ جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر پوری مثنوی میں کسی لطیف رشتہ کا پاس ولحاظ نہیں رکھ رہا ہے، بلکہ نثری صحافت کی جگہ نظمیہ صحافت کو فروغ دے رہا ہے۔ اس پیرایہ اظہار میں ظاہر ہے ادب سے کہیں زیادہ صحافتی محرکات کا عمل دخل ہوگا۔ چنانچہ سیاسی موضوعات پر لکھی گئی بے شمار مثنویاں ادبی ابال، تخیلاتی آنچ اور دلکش بیانیہ کے اثر سے خالی نظر آتی ہیں۔ عبدالمجید شمس اور اختر انصاری کے اشعار کے دوش بدوش غضنفر کی مثنوی کے اشعار رکھ دینے سے ہی از خود موازنہ اور مقابلہ کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ کسی ناقد یا پھر تجزیہ نگار کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ قارئین خود ان اشعار کی روشنی میں فنی چابک دستی، تسلسل وتسہیل، روانی اور بندش الفاظ کا اندازہ خود کر سکتے ہیں کہ کس کے یہاں کیا کیا صورتحال ہے۔

حالی نے صنف مثنوی کے لیے جو آٹھ بنیادی باتیں بیان کیں، وہ تمام وکمال کے ساتھ غضنفر کے یہاں موجود ہیں۔ ان کے مکمل اصول کو یہاں پیش کر کے تجزیہ ممکن نہیں، البتہ اپنے لفظوں میں ان کے مباحث کا عکس پیش کیا جاتا ہے۔ ربطِ کلام، ناممکنات سے احتراز، مبالغہ میں اعتدال، کلام حسب حال، نیچر اور فطرت کا التزام، امساکِ تضاد، تجربات ومشاہدات کی آنچ، رمز وکنایہ کا استعمال۔

ان اصولیات کے پس منظر میں قدیم وجدید بہت سی مثنویوں کا عکس دھندلا نظر آئے گا۔ بیشتر جدید

مثنویوں کا المیہ، رمز وکنایہ سے اجتناب میں پوشیدہ ہے۔ اس لیے راست طور پر مسائل کو پیش کرنے میں ہی ان مثنوی نگاروں نے عافیت سمجھی۔ یہی وجہ ہے کہ طویل نظمیہ شاعری سے شعری حسن ختم ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اختر انصاری اور عبدالمجید شمس کی مثالیں میری اس بات کی تصدیق کرتی ہیں۔ کیوں کہ ان کی مثنوی کے اشعار میں ایمائیت وتہہ داری اور رموز وکنایہ تو دور، ڈھنڈھورچی کا احساس ہورہا ہے یا پھر صحافیانہ تجزیے کا گمان گزرتا ہے، لیکن فکشن کی فسوں کاری میں ابہام ورمزیات سے دلکشی آتی ہے، اسی طرح غضنفر نے اس مثنوی میں بھی ابہام سے سروکار رکھا۔ دیگر ابہامی اشاریہ سے قطع نظر مثنوی کے تیرہویں حصہ میں ''کرب جاں'' قصہ گوئی کا اپنا جوہر دکھاتی ہے۔ ایجاز کا رویہ بھی غضنفر کی فنکاری کی مثال بن جاتا۔ ساتھ ہی رمز واشاریہ بھی اپنی نمائندگی درج کرواتی ہے:

کہیں پھونک سے پھک گیا آسماں — کہیں پھونک سے جل گیا آشیاں
کہیں پھونک سے کچھ مکاں ہل گئے — کہیں پھونک سے جسم وجاں ہل گئے
مگر اس کا ایسا اثر بھی ہوا — اٹھا ناگ برسوں کا سویا ہوا
اچانک وہ پھن کو اٹھانے لگا — غضبناک چہرہ دکھانے لگا

رمز وکنایہ کے تناظر میں جہاں جدید مثنویوں سے ''کرب جاں'' ذرا نمایاں نظر آتی ہے۔ وہیں قدیم مثنویوں سے بھی یہ مثنوی ارتباط کلام، مبالغہ میں اعتدال، کلام زمانہ کے حسب حال، نیچر وفطرت کے لحاظ سے وجہ تفوق رکھتی ہے۔

اسی طرح اگر سحر البیان اور گلزار نسیم کی نعت ومنقبت سے مثنوی ''کرب جاں'' کے نعتیہ اشعار کا موازنہ کیا جائے تو غضنفر اپنی سادگی، پرکاری اور نزاعی معاملات سے کنارہ کشی کی وجہ سے سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ غضنفر کی نعت میں نہ صرف عقائد کی پاکیزگی ملتی ہے، بلکہ تعریف وتوصیف اور نبی کی ثناخوانی شایان شان ہے۔ انھوں نے شمائل نبی کے ساتھ تاریخی حسیت کو بھی بیدار کیا ہے۔ تاریخی تناظر کی ہی دین ہے کہ چند اشعار میں طائف کی جھلکیاں ہیں تو معراج کی عکاسی بھی۔ ہجرت کی کربناکی کا احساس ہے تو جہالت وتاریکی کو دور کرنے کے لیے کی گئی تگ ودو بھی۔ سحر البیان ہو کہ گلزار نسیم یا پھر فریاد داغ، سب میں غضنفر کا اندازِ ثناخوانی مفقود ہے۔ حتی کہ سحر البیان میں خاص عقائد کی جھلکیاں اور مبالغہ آرائیاں بھی ملتی ہیں:

بغیر از لکھے اور کیے بے رقم — چلے حکم پر اس کے لوح وقلم
ہوئی جو نبوت نبی پر تما م — ہوئی نعمت اس کے وصی پر تمام
جہاں، فیض سے اس کے ہے کامیاب — نبی آفتا ب ، وعلی ماہتاب
(سحر البیان)

اگر ان اشعار کی تشریح کریں تو کئی اختلافی مسائل پیدا ہو سکتے ہیں لیکن غضنفر نے ایسی تمام باتوں سے خود کو الگ رکھا اور لکھا:

سنو کوئی ایسا بھی بندہ ہوا — زمیں کے لیے جو فلک پر گیا
کبھی جو اندھیری گپھا میں گیا — کبھی دشت وصحرا میں پھر تارہا
جسے ہر طرح سے ڈرایا گیا — جسے راستوں میں ستایا گیا

ان اشعار سے نہ خاص عقائد کی وضاحت ہورہی ہے اور نہ کوئی التباس واشتباہ پیدا ہورہا ہے۔

شعری دنیا کا غضنفر ہو یا پھر فکشن کی کائنات کا، ہر جگہ کئی معنوں میں وہ معاصرین اور قدما تخلیق کاروں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ وہ اگر زودنویس ہیں تو تجربہ کار بھی۔ انہیں لفظوں سے کھیلنا آتا ہے تو لفاظی سے اجتناب بھی۔ انسانی جبر کے خلاف قلم کو حرکت دیتے ہیں تو اس کے حل کی طرف ذومعنی اشارہ بھی کرتے ہیں۔ معاصر لکھنے والوں میں ان کے سرمایہ فکشن کو موضوعات کے لحاظ سے دیکھیں تو سب کسی نہ کسی حد تک آس پاس کھڑے نظر آتے ہیں تاہم تجربات کے تناظر میں غضنفر کا پلڑا بھاری ہے۔ مثنوی ''کرب جاں'' میں بھی ان کی امتیازی شان جا بجا نظر آتی ہے اور تجرباتی سطح پر قدما اور جدید مثنوی نگاروں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ غضنفر کی تخلیقات کے مطالعہ سے قاری یہاں تک پہنچتا ہے کہ وہ ایک ایسے فنکار ہیں، جن کی تخلیق ذرا لیک سے ہٹی ہوئی ہوتی ہے۔ باوجود اس کے ان کے مواد، مکالمہ اور منظر نگاری میں عجب سی لذت ہوتی ہے۔ تازگی ہوتی ہے۔ شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کی دوسری تخلیق پہلی تخلیق سے یکسر ممتاز ہو۔ اس میں نیا پن اور رعنائی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تجربات سے کبھی جھجکتے نہیں۔ شاید تجربات کا ہی نتیجہ ہے کہ ان کا ادبی ماحول تھوڑا پیچیدہ اور غیر روایتی ہوتا ہے، غضنفر نئے نئے تجربات کے بارے میں خود کہتے ہیں:

''میری کوشش ہوتی ہے کہ ہر ناول میں ایک نئی اور تجرباتی زمین تلاش کروں۔ ناول لکھتے وقت مجھے ہمیشہ یاد رہتا ہے کہ یہ لفظ ''ناویلا'' سے نکلا ہے، جس کا مطلب ''کچھ نیا'' ہوتا ہے، مجھے قصہ گوئی کی وہ روایت کبھی پسند نہیں آتی جس میں ساری باتیں کھلے طور پر سامنے کہہ دی جاتی ہیں، مجھے راست بیانیہ پسند نہیں ہے، اس لئے میں نے اپنی تخلیقات کو تہہ در تہہ بننے کی کوشش کی۔'' (شعر وحکمت صفحہ: 521)

ناولوں میں انھوں نے جس طرح رمز وکنایہ سے رشتہ استوار کھا اسی طرح اپنی پہلی مثنوی میں بھی۔ اوپر کہیں مثنوی کے حوالے سے چند مثالیں بھی دی گئی ہیں، جن سے ان کی جدت طرازی کا احساس ہوا ہوگا۔ رہی بات ان کے غزلیہ رویوں کی تو فکشن اور مثنوی میں ایمائیت کا مظاہرہ کرنے والے غضنفر وہاں کیسے، تہہ داری پیدا کرنے کی کوشش نہیں کریں گے، جب کہ غزل میں ابہام سے کشش پیدا ہوتی ہے۔ غضنفر کے تجربات اور لسانی رویہ پر نقادوں نے تیکھے طنز بھی کیے۔ ظاہر ہے جس فنکار کا شیوہ تجربات پر ہی موقوف ہو، اس کے یہاں رنگارنگی ضرور پیدا ہوگی تاہم وہ بآسانی کوئی مستقل پہچان بنانے میں کامیاب نہیں ہو پائے گا۔ البتہ تجربات میں رنگارنگی ہوتی ہے، اس لیے اس میں التفات اور قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی قوت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے۔

زودنویسی کے پس منظر میں بھی غضنفر پر اعتراضات ہوئے۔ ۱۹۸۹ سے متواتر نو ناول ان کے قلم سے

منظر عام پر آئے، جو کہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ زودنویس ہیں۔ اس لیے کم وقت میں سب سے زیادہ لکھنے والوں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ غضنفر پر عائد ہونے والے اس الزام کا اگر جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ گرچہ غضنفر کے پے درے ناول منظر عام پر آئے تاہم صفحات کے مقابلے میں اپنے ہم عصر ناول نگاروں (افسانہ نگاروں) سے وہ کوئی بہت زیادہ آگے نہیں ہیں۔ اس لیے یہ کہنا بجا ہوگا کہ وہ ناول کے ناموں کے لحاظ سے تو زودنویس نظر آتے ہیں تاہم صفحات کے معاملے میں وہ بہت زیادہ آگے نہیں ہیں۔ یہ صورت غضنفر کے حق میں بہتر ہے یا غیر مفید ہے، مجھے نہیں معلوم۔ اسی طرح ناول کے سکڑتے کینوس کے تناظر میں ان پر اعتراضات ہوتے رہتے ہیں، حالانکہ طوالت کے پجاریوں کے یہاں بھی کینوس وسیع نہیں ہوتا، بلکہ زیب داستان کے لیے غیر ضروری چیزیں ٹھونس دی جاتی ہیں، جس کی اجازت نہ ناول کا حجم دیتا ہے اور نہ ہی موضوع۔ اس کے باوجود کینوس وسیع کرنے کا نعرہ وہ بلند کرتے رہتے ہیں، مگر غضنفر نے غیر ضروری طوالت اور جنسیت سے اجتناب کی راہ اپنائی ہے۔

زودنویسی کے تناظر میں ایک کثیر التصانیف مرحوم ادیب سے میرا جو مکالمہ ہوا، اسے پیش کرنا یہاں مناسب سمجھتا ہوں۔ سوال تھا کہ آپ پر لگنے والے زودنویسی کے الزام کا جواب کبھی آپ نے دیا ہے یا دینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ زودنویسی کی اصل تعریف کیا ہے؟ کیا تیزی سے لکھنے والے ہر ادیب کو زودنویس کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے؟ اس طرح نظر انداز کرنے سے کس کا نقصان ہوگا؟ انھوں نے کہا کہ میں انہماک سے لکھتا ہوں۔ تخیل کو معاشرے سے قریب کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں۔ جس کا اعتراف بھی لوگوں نے کیا ہے۔ اس کے باوجود زودنویسی کا الزام کیسا؟ انھوں نے کہا کہ جو ادب سامنے آجائے، اس کو تو سب دیکھ لیتے ہیں اور فوراً فیصلہ بھی سنا دیتے کہ یہاں تو زودنویسی کا معاملہ ہے لیکن جس تخلیق کار پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے اس کے سوچنے اور غور وفکر کے عمل کو کوئی دیکھتا ہی نہیں ہے۔ اگر اس ادیب کے غور وفکر کے لمبے سفر پر کسی کی نظر چلی جائے تو شاید زودنویسی کا الزام، آسانی سے نہیں لگایا جا سکتا۔ شاید یہی حال غضنفر کا بھی ہے کہ تخیل کی لو ہمیشہ وہ تیز رکھتے ہیں۔ معاشرتی اور سیاسی کوئی نہ کوئی پہلو ان کے غور وفکر میں ہمہ وقت شامل رہتا ہے۔ ظاہر ہے جو ادیب جس قدر تخیل اور غور وفکر میں مبتلا رہے گا اور مشاہدات وتجربات سے مدد لیتا رہے گا، اسی قدر تخلیقات بھی پیش کرتا رہے گا۔ سرسری دیکھنے والی آنکھیں زود نویسی کا الزام لگائے گی اور تخلیق کار کے تخیل اور مشاہدات وتجربات پر نظر رکھنے والی نگاہ جائز تجزیہ کرے گی۔

اگر ''کرب جاں'' کو تجربات کی روشنی میں دیکھیں تو یہاں بھی متعدد نئے رنگ مل جائیں گے۔ جیسے رمز وکنایہ سے رشتے کی استواری۔ قدیم اور جدید مثنوی کے رویوں کو ایک ساتھ اپنانا، قصہ گو کی زندگی کا طویل تذکرہ، تاریخی حسیت اور اشارہ وکنایہ میں پوری ہندوستانی تاریخ کا بیان، اسی طرح مسلمانوں کی آمد پر فلسفیانہ اظہار:

سبھی کے بدن میں لہو ایک ہے — بشر جو بھی ہے اس کی بو ایک ہے
تو پھر کوئی کیسے ہوا باہر ی — کہ جس کے لیے ہے مچی کھلبلی

کہ جس کے سبب آشیاں منتشر مکیں منتشر ہیں ، مکاں منتشر

سترہ حصوں میں منقسم اس مثنوی میں سحرالبیان اور گلزارنسیم کی طرح قصہ کی سطح پر ارتکاز نہیں ہے۔غواصی نے اپنی مثنوی ''طوطی نامہ'' کے بارے میں لکھا ہے''نہیں داستاں ہے، یوں ہے بوستاں'' اسی طرح غضنفر نے اپنی مثنوی کے بارے میں لکھا ہے:

یہ قصہ نہیں ہے خراسان کا یہ قصہ نہیں ہے پرستان کا
نہیں کوئی قصہ خیالی ہے یہ نہیں کوئی قصہ مثالی ہے یہ
نہیں یہ کوئی عشق کی داستاں نہ ہے داستانوں سا اس میں سماں

طوطی نامہ میں غواصی قصہ کی سطح پر التزام و تنظیم سے گرچہ کوئی سروکار نہیں رکھتے ہیں، البتہ اس میں ان کی زبان دیگر مثنویوں سے زیادہ نکھر کر سامنے آتی ہے۔غضنفر نے بھی تاریخی حسیت کے ساتھ ہندوستان کا پورا منظر نامہ سامنے رکھا ہے، کسی ایک واقعہ پر اپنی مثنوی کی بنیاد نہیں ڈالی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے ابن نشاطی کی مثنوی کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا کہ انھوں نے انشا کی خصوصیات اپنی مثنوی میں شامل کردی ہے۔اس سے ذرا ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے میرا ماننا ہے کہ غضنفر نے اپنی مثنوی میں ناول کی خصوصیات بھی سمونے کی کوشش کی ہے۔گویا یہ مثنوی فارم اور ہیئت کے لحاظ سے تو مثنوی ہے، لیکن بیانیہ کے تناظر میں ناول ہے۔اس مثنوی کو منظوم ناول قرار دینے سے خود میرے اس مفروضے پر سوالیہ نشان کھڑا ہوسکتا ہے کہ جب ناول ہے تو تنظیم اور ارتکاز کے ساتھ کوئی کہانی کیوں نہ پیش کی گئی؟ اس سوال کا جواب غضنفر کے آخری ناول ''مانجھی'' سے دیا جاسکتا ہے۔کیوں کہ وہ قصہ کی سطح پر بھی تجربات کرتے ہیں۔اس ناول میں غضنفر یا راوی مرکزی کردار مانجھی سے فلسفیانہ انداز میں بات کرتے رہتے ہیں۔آگے بڑھتے ہیں۔دوران گفتگو کئی قصے اور حالات وواقعات ناول کے وسیع کینوس سے جڑتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناول کو اور بھی آگے جانا چاہئے، لیکن غضنفر کچھ اور آگے جا کر کہتے ہیں چلو مانجھی لوٹ چلتے ہیں اور ناول اختتام تک پہنچ جاتا ہے۔یہاں پر قاری کئی خیالوں میں اس طرح گم ہوجاتا ہے کہ نہ اسے مزید قصہ کی ضرورت رہتی ہے اور نہ ہی ناول ادھورا محسوس ہوتا ہے، بالکل اسی طرح اس مثنوی میں بھی قصہ کی کرشمہ سازی نظر آتی ہے۔

لیکن اتنی بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ اس مثنوی میں واقعاتی سطح پر بکھراؤ ہے تو اس کو اور بھی طویل ہونا چاہئے۔یہ سوال فقط اس لیے نہیں پیدا ہوتا ہے کہ مثنوی میں کوئی کسا ہوا قصہ نہیں ہے، بلکہ وجہ اس کی یہ بھی ہے کہ غضنفر نے ہندوستان کی ابتدائی تاریخ اور اپنے اور اپنے دوستوں کے تعارف میں طوالت کا سہارا لیا ہے۔اس طویل تجربے کے بعد میرے جیسے حساس قاری مزید اشعار کا متمنی ہوجاتا ہے اور معجزانہ طور پر رستمی نے چوبیس ہزار اشعار پر مشتمل ''خاور نامہ'' پیش کیا ہے، اسی طرح مثنوی ''کرب جاں'' میں مزید اشعار جوڑنے چاہئے۔مثنوی میں کہانی کا بکھراؤ اور متعدد حالات کی شمولیت مزید اشعار کو اپنے اندر سمونے کی اجازت بھی دے رہی ہے۔''کرب جاں'' گیارہ سو ستائیس

اشعار پر مشتمل ہے، جس میں پانچ سو پچھتر تمہید و تعارف کے لیے مختص کے گیے اور جہاں سے غضنفر نے ''آغاز کرب جان کے قصے کا'' کا عنوان باندھا ہے، وہاں سے 522 اشعار رہ جاتے ہیں۔اس لیے یا تو اس آغاز کے بعد، درمیان واختتام میں مزید اشعار ہوتے یا پھر تمہید و تعارف کا دائرہ تھوڑا مختصر کیا جاتا۔اس تناظر میں داغ کی مثنوی ''فریاد داغ'' کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ سو تراسی اشعار والی مثنوی میں تمہید کے لیے فقط تیرہ اشعار ہیں۔اس کے بعد عشقیہ مباحث سے سماں باندھنے کے لیے پندرہ اشعار لیے گیے ہیں۔وہیں گلزار نسیم میں سولہ اشعار کے بعد اصل کہانی شروع ہوجاتی ہے اور سحرالبیان میں تقریباً ڈیڑھ سو اشعار تمہید کے لیے استعمال کئے گئے ہیں۔غضنفر کی طولانی ابتداء کے تناظر میں پروفیسر انیس الرحمٰن نے لکھا ہے''ابتدائی حصہ ذاتی دلچسپی کا باعث ہے۔یہ راوی کی زندگی کے اہم نکات کا احاطہ کرتے ہیں۔یعنی اب ہم تیار اس قصے کو سننے کے لیے جس کا سنانا اس شعری تجربے کا سبب بنا۔یعنی شاعری کا سبب ہوا۔اصل قصہ طولانی ہے کئی حصوں پر مشتمل ہے۔اس میں اساسِ قصہ شامل ہے اور اسباب قصہ بھی''۔ہوسکتا ہے کہ پروفیسر انیس نے پوری مثنوی کو ایک اکائی کی حیثیت سے دیکھتے ہوئے طولانی ابتدائیہ کو بھی مثنوی سے الگ تسلیم نہیں کیا ہے، لیکن غضنفر نے ''آغاز کرب جاں کے قصے کا'' سے یہ وضاحت کردی کہ پہلے جو کچھ تھا، وہ کچھ اور تھا اور اب مثنوی سنو''سنواے زمانے کے دانشوروں سنو.....''۔اس کے علاوہ میں یہ کہنے کا حق ضرور رکھتا ہوں کہ طولانی ابتدائیہ کے بعد مزید اشعار ہونے چاہئے، چاہے طولانی ابتدائیہ مثنوی کا اٹوٹ حصہ ہے یا زائد حصہ، اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔البتہ ہمیں بھی تسلیم ہے کہ ابتدائی حصوں میں دلکشی ہے۔

خلاصہ کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح داستانوی فضا سے نکل کر ناول اور افسانہ کی روایت مضبوط ہوئی، اسی طرح مثنوی کی روایت کو بھی کسی نہ کسی سطح پر مستحکم ہونا چاہئے تھا لیکن طویل مثنوی لکھنے کے لیے درکار تندہی اور مشق ومزاولت پر شعرا کے لبیک نہ کہنے کی وجہ سے یہ صنف تنزلی کی شکار ہوئی، مگر غضنفر نے اس عہد میں جب کہ مثنوی کی طرف التفاف بالکل ہی نہیں تھا، صنف مثنوی کی تجدید کی ہے اور تجدیدی رویوں میں اپنی تجرباتی روش کو بھی باقی رکھا۔جس طرح ناولوں اور خاکوں میں جدت طرازی اور نئے نئے تجربات کو انھوں نے جگہ دی، اسی طرح اپنی اس مثنوی میں بھی۔چنانچہ ان کی مثنوی ''کرب جاں'' جہاں متعدد خصوصیات کی بنیاد پر قدیم مثنویوں سے ممتاز ہے، وہیں جدید سے منفرد بھی۔کیوں کہ انھوں نے قدیم رویوں سے سرتاپا سرانحراف کیا ہے اور نہ ہی جدید آہنگ واسلوب کو نظر انداز، بلکہ پیش آمدہ مسائل کو تخیل اور رمز وکنایہ کے پیرایہ میں اس طرح کس دیا کہ ہیئت وفارم کے لحاظ سے وجود میں آنے والی مثنوی میں منظوم ناول کا عکس ابھر آیا ہے۔

◀◀ ● ▶▶

Room NO. 29 Mahi , JNU New Delhi
salmansamadsalman@gmail.com
8287287093

● عمر فرحت

اقبال مجید کے افسانے

اقبال مجید کے افسانوی مجموعوں میں ''دو بھیگے ہوئے لوگ'' ۱۹۷۰ء ''ایک حلیفہ بیان'' ۱۹۸۰ء'' شہر بدنصیب'' ۱۹۹۷ء'' تماشہ گھر'' ۲۰۰۳ء اور'' آگ کے پاس بیٹھی عورت'' ۲۰۱۰ شائع ہو چکے ہیں جو عصری حسیت، تکنیکی تنوع اور اسلوب کی ندرت کے لحاظ سے اردو افسانہ نگاری میں ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

افسانہ'' عدو چچا'' سے لے کر اب تک اقبال مجید کو افسانے لکھتے ہوئے نصف صدی گذر چکی ہے۔ اس لمبے عرصے میں ان کی تحریریں کئی تبدیلیوں سے گذریں۔ ان کے مجموعے ان کی افسانہ نگاری کے الگ الگ پڑاؤ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ پڑاؤ اسلوبیاتی رجحانات، ملکی اور عالمی صورت حال، ماحول اور تفکیری انداز کی واضح تبدیلیوں سے عبارت ہیں۔ جو چیز نہیں بدلی وہ ہے نظریاتی طرز فکر جس پر وہ سختی سے قائم ہیں۔'' عدو چچا'' میں اس دور کا انداز بیان ہے جب منٹو، بیدی، کرشن چندر انتظار حسین، عصمت اور احمد ندیم قاسمی جیسے فن کاروں کی تحریر میں نئے افسانہ نگاروں کو متاثر کر رہی تھیں۔ افسانہ نگاری کی اساس زبان، ماحول سازی اور کردار نگاری تھی۔ زندگی انہیں دائروں میں محدود تھی اور تحریر میں شباب کی جھلک تھی۔ لیکن اقبال مجید نے جب'' دو بھیگے ہوئے لوگ'' لکھا تو اس میں ایک صاف تبدیلی نظر آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال مجید نے اپنی شناخت'' دو بھیگے ہوئے لوگ'' سے بنائی اور دوسرے اہم افسانے'' مدافعت''،'' پوشاک''،'' سرنگیں''،'' تیرا اور اس کا سچ'' اور'' چیلیں'' بعد میں تحریر کیے گئے۔

'' دو بھیگے ہوئے لوگ'' اقبال مجید کے افسانوں میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس نے ان کے فن کو ایک نئی جہت دی۔ یہ افسانہ علامتی کہانی کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ یہاں افسانے میں کہانی پن پوری طرح موجود ہے۔ واقعات کے بیان میں منطقی ربط ہے قاری کا تجسس تا اختتام قائم رہتا ہے۔ واقعات کا تانا بانا صرف دو بے نام کرداروں کے گرد بنا گیا ہے، جو ایک دوسرے کے لیے آخر تک اجنبی ہی رہتے ہیں۔ چند اقتباسات دیکھیے :

> ''اس کے اس جواب پر میں دل ہی میں جز بز ہوا، میں نے سمجھا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان بہت کچھ مشترک تھا۔ سفر کا ارادہ، یک بارگی بارش میں پھنس جانا، ایک ایسی چھت کے نیچے سر چھپانا جس کی رگ رگ چھدی ہوئی تھی اور پھر ایک ہی کیفیت میں لگا تار دونوں کا بھیگنا، اس لیے میں نے سوچا تھا کہ ایسے حالات میں ہم دونوں کی سوچ بھی مشترک

> ہوگی۔ لیکن وہ ایسی حماقت آمیز حرکتیں کر رہا تھا جن کا کوئی جواز میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔''
>
> ''آپ کے پاس جوتے، قمیض، پتلون اور ریزگاری کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں۔ لیکن میرے پاس ہے۔ آپ کے لیے اگر جوتے اور قمیض اور پتلون اور ریزگاری بھیگ بھی جائے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن میں جوتے، پتلون اور قمیض کے بھیگ جانے پر بھی اس چیز کو بھیگ جانے سے بچانا چاہتا ہوں۔''

کہانی کا پورا واقعہ علامت کے جال میں بنتا چلا گیا ہے اور عام قاری کی طرح کہانی کا کردار بھی اس راز سے بے خبر ہے۔ افسانے کے موضوع کی پیچیدگی قاری کی دلچسپی کو اور بڑھاتی ہے۔ یہاں بارش اور چھت کے علامتی طور پر کئی معنی سامنے آسکتے ہیں۔ یہاں کردار کی مرکزیت نہیں رہی ہے بلکہ ماحول مرکزی ہو گیا ہے۔ اسلوب بیان کی بنیاد حالات ہیں، افسانے میں پرانی اور نئی پیڑھی کے اپروچ کا عمل اور ردعمل ہے۔ لگاؤ، حیرت و جستجو اور عقیدہ جیسے رگ وید والے الفاظ اپنا اثر اور معنویت کھو دیتے ہیں۔ یہاں قدروں کو محفوظ کرنے اور نہ کرنے کی کشمکش ہے، صورت حال ایبسر ڈ ہو چکی ہے۔ یہ افسانہ اپنے عہد کی اسلوبیاتی تبدیلی کا پیش خیمہ ہے۔'' دو بھیگے ہوئے لوگ'' اس افسانوی مجموعے میں اور بھی بہت سے اہم افسانے ہیں جیسے'' پیٹ کا کینچوا''،'' بیساکھی''،'' رگ سنگ''،'' تھکن''،'' شوکیس''، جس میں موضوع، اسلوب و تکنیک کا ایک نیا اور اچھوتا انداز ملتا ہے۔'' پیٹ کا کینچوا'' میں گوشت و پوست کی کردار سازی سے گریز نظر آتا ہے۔ اس میں ایک شدت نظر آتی ہے۔ ایک منطقی سوچ اور بیان ہے ایک احساساتی عمل اور ردعمل ہے۔ جسے معاشرتی مذہبیت اور غیر مذہبیت فکر کے درمیان رکھ کر واضح انداز میں برتا گیا ہے۔

''ایک حلفیہ بیان'' مجموعہ میں'' ہائی وے پر ایک درخت''،'' مدافعت''،'' خدا، عورت اور مٹی''، ''ایک حلفیہ بیان'' اور'' جنگل کٹ رہے ہیں'' قابل ذکر افسانے ہیں، جو جدید افسانہ نگاری میں خوشگوار تبدیلیوں کے مظہر ہیں۔ اقبال مجید کی اکثر کہانیوں میں ڈرامائی فضا پائی جاتی ہے۔ دراصل ایک زمانے میں ان کا رجحان ڈرامے کی طرف زیادہ تھا۔ انہوں نے کامیاب نشری ڈرامے بھی لکھے ہیں اور ریڈیو کے میڈیا سیان کی وابستگی نے ان کی کہانی میں مکالمے کو نمایاں جگہ دی ہے۔ جب وہ دوبارہ افسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہوئے تو شعوری یا غیر شعوری طور پر ڈرامائی انداز ان کے افسانوں میں بھی شامل ہو گیا۔'' ایک حلفیہ بیان'' میں ایسی ہی فضا پائی جاتی ہے۔ مہدی جعفر نے اس افسانے کے بارے میں پوچھا تو اقبال مجید کا کچھ یوں کہنا تھا:

> ''سیدھی سادی واردات اور کردار کا منطقی بیان کرنے والی بیانیہ کہانی سے گریز کی صورت میں'' ایک حلفیہ بیان'' جیسی مختلف کہانی لکھی گئی ہے۔ مختلف ان معنی میں کہ یہ کہانی بحث انگیز پیش کش میں جس کو discourse کہتے ہیں لکھی گئی ہے۔ یعنی اس کہانی میں ڈسکورس ہی کہانی کے واقعات پیش کرتا ہے۔ یہ دراصل discursive narration کی مثال ہے۔ یہاں پہلے سے فرض کیے ہوئے نہ تو کردار ہیں نہ واقعات، اس کا اسلوب

کہانی کو غور طلب اور بحث طلب کہانی بناتا ہے۔اس میں ہوا عمل ہے جو کچھ جاری و ساری ہے وہ بحث انگیز بیانیہ یعنی narration discurive ہے۔اسی لیے اس قبیل کی کہانیاں اپنے اسلوب، الفاظ اور متن کے لحاظ سے غور طلب اور بحث طلب بن جایا کرتی ہیں۔''

چنانچہ ''ایک حلفیہ بیان'' قاری کی سوچ کو مہمیز کرتا ہے۔اس کا اسلوب گو کہ فردیت والا ہے مگر قسموں کی راہ سے پورا معاشرہ جھلاہٹ کی زد پر ہے۔''مدافعت'' اور ''جنگل کٹ رہے ہیں'' میں اقبال مجید کی اسلوبیاتی قوت نمایاں ہے۔

اقبال مجید نے وقت کو کئی سطحوں پر اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ان کے یہاں تاریخی تسلسل والے وقت کے ساتھ وقت کا ذہنی تصور بھی موجود ہے۔جس کی مثال ''ہائی وے پر ایک درخت'' میں ملتی ہے۔اس افسانے میں ایک غیر معمولی سچویشن پیش کی گئی ہے جس میں مرکزی کردار کا دماغ موت سے فوراً پیشتر اور موت کے فوراً بعد بھی حیرت انگیز طور پر بڑی تیز رفتار سے کام کرتا ہے اور اس کی کچھ حسیں جیسے قوت باصرہ، قوت سامعہ نیز قوت ادراک ایک نارمل انسان کی حسوں سے زیادہ صحیح طور پر کام کرتی ہیں۔

اس افسانے کی فضا ''چوراہے پر ٹنگا آدمی'' (انور قمر) کی یاد دلاتی ہے۔لیکن وہاں تو صورت حال کچھ زیادہ ہی غیر معمولی ہے اور بعید از قیاس ہے کہ پیڑ پر لٹکے ہوئے آدمی کی لاش نہ صرف ہجوم سے مخاطب ہوتی ہے بلکہ کچھ عرصہ بعد وہ شخص دوبارہ حیات پا کر ان ذی روح انسانوں میں شامل ہو جاتا ہے۔یہی نہیں اپنے گھر جا کر ایک نارمل زندگی بھی گذارنے لگتا ہے اور دوسرے روز اخبار میں اپنی پھانسی سے متعلق خبریں پڑھ کر متحیر بھی ہوتا ہے۔

تاریخی تسلسل والا وقت ''خدا، عورت اور مٹی'' میں پیش کیا گیا ہے۔یہاں فنکار وقت کے مرقعوں کو آگے پیچھے کر کے انھیں کبھی قدیم اور کبھی جدید آوازیں دے کر بہت کچھ سمجھانا چاہتا ہے اور صدیوں پر محیط حیات کے ساؤنڈ ٹریک کو حال کے پس منظر میں کسی طرح بچانے کی کوشش میں سرگرداں ہے۔نیز حال کی زندگی کو حیات ماضی کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔افسانے کا ابتدائی پیراگراف دیکھیے، جس میں بظاہر بے ربط الفاظ اور نامکمل فقروں کے ذریعے ماضی، حال اور مستقبل کی کڑیوں کو ملانے کی کوشش کی گئی ہے :

''شمعیں، عطر، شراب، پوشاکیں اور بدن.....جوان، گوری، تندرست، جھومتی، مچلی، بانکی چھولداریاں..... پسینے میں نہائے، وارنش جیسے چمکتے تیز و تند، تھرکتے گھوڑے.....ایسٹ انڈیا کمپنی کا چڑھتا سورج..... تابناک، شمشیر بکف زوق برق شہسوار..... گومتی، کنارا، پرچم، دولت انگلیشیہ.....چھتہ منزل، اس کا نیلا آکاش سب ایک خدا کے ساتھ میں تھے.....قدسیہ بیگم! نصیر الدیں! چاندنی، جوہی، چمیلی، موتیا.....اندیشے، بھیانک مستقبل کے لرزتے کانپتے ہونٹ خوف اور نامرادی کی شب بیداریاں.....خلوت! جشن، پھر خلوت، شراب لڑکیاں، جسم، خلوت.....''

خاص اور اہم واقعات کی طرف محض اشارے کیے گئے ہیں ان کی کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔وقت اور مقام کا تسلسل بالکل ٹوٹ گیا ہے۔کوئی پلاٹ نہیں، کوئی مخصوص کردار نہیں۔بس سوچنے والے یا خود افسانہ نگار کا تلازمۂ خیال پیش کیا گیا ہے جس نے افسانے میں ڈرامائی کیفیت پیدا کر دی ہے۔یہاں تکنیکی تنوع کی اچھی مثال پیش کی گئی ہے، یہ سینما کی تکنیک ہے۔پردہ پر ایک فلم چل رہی ہے جو حال کے واقعات کے ساتھ صدیوں پرانی تاریخ کو پیش کر رہی ہے جس کے سبب کہانی میں اساطیری عناصر بھی شامل ہو گئے ہیں۔تکنیک کے لحاظ سے بھی یہ افسانہ نادر اور اچھوتا ہے۔محمد حسن اپنے مضمون ''تیسری آواز کا افسانہ'' میں اقبال مجید کی تکنیک کے بارے میں کچھ یوں رقمطراز ہیں :

''اقبال مجید نے دراصل اپنی کہانیوں کے ذریعے تکنیک میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔انہوں نے اپنی کہانی ''خدا، عورت اور مٹی'' میں بیانیہ کو نیا مونتاذ نما گھیراؤ دیا ہے۔''

''شہر بدنصیب'' والے افسانے اپنے اسلوب کے لحاظ سے اور بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ان میں استعارہ سازی علامتی سطح کو چھوتی نظر آتی ہے۔حکایتی اور داستانی اسلوب ''سکون کی نیند''، ''حکایت ایک نیزے کی'' اور ''شہر بدنصیب'' میں موجود ہے مگر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کے منظر نامے میں دراصل آج کے ماحول پر طنز ہے۔غم و غصہ، وسوسے، اندیشے کی بنا پر لکھے گئے افسانے اقبال مجید کے پچھلے افسانوں سے مختلف ہیں۔استعاراتی وصف اور علامتی صورت حال کے علاوہ انسانی حالت، سیاسی اور سماجی شعور ان کی کہانیوں کی پہچان ہے۔چنانچہ اقبال مجید کے افسانوی سفر کے تیسرا موڑ زندگی کے اسی عرفان سے نسبت رکھتا ہے وہ خود کہتے ہیں :

''ہمیں انسان کو اس کی تمام اچھائیوں، خوبیوں، کمزوریوں، نیکیوں اور بدیوں کے ساتھ جیسا وہ تھا، جیسا وہ ہے اور جیسا ہونے کی سعی کر رہا ہے اس سب کے ساتھ قبول کرنا ہوگا۔کیونکہ کوئی کہانی انسان کے اس وصف سے اس کو ہٹا کر نہیں لکھی جا سکتی۔اس فغاں میں اپنے عہد کے انسان، اس کی totality کے ساتھ سمجھنے کے لیے ایک بار پھر شفاف روایتی اور مکمل بیانیہ میں تازہ کاری کے ساتھ اپنے عہد کے انسان کو افسانوی شکل میں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں ..... یہ میرے افسانوں کے حالیہ موڑ کی عبارت ہے جس کی نمائندگی ''سرنگیں''، ''ہم گریہ سر کریں گے''، ''سوختہ ساماں''، ''سخت جانوں کا انتظار'' اور ''انوکا گھر'' وغیرہ کرتے ہیں۔''

چنانچہ اقبال مجید نے زبان سنوارنے کے بجائے اپنی بات کو قاری تک پہنچانے پر زیادہ توجہ دی۔ان کی زبان میں فطری خوش اسلوبی ہے۔کہانی سنانے والی ڈرامائی تکنیکوں کی بنا پر بے ساختگی ہوتی ہے۔ان کی کہانیوں میں تنوع ہے اور ہر کہانی دوسری کہانی سے تخلیقی طور پر الگ ہوتی ہے۔

◀◀ ● ▶▶

Opp: ITI Road, W. NO. 4 Rajouri (J&K)

● غلام نبی کمار

افسانوی ادب کا ایک گمشدہ فنکار: بلونت سنگھ

بلونت سنگھ کو افسانوی ادب کا گمشدہ فنکار قرار دینا اردو ادب کا ذوق رکھنے والوں کے لیے بالعموم اور فکشن پر تنقید لکھنے والوں کے لئے بالخصوص کسی بڑے المیہ سے کم نہیں ہے۔ جن افسانہ نگاروں نے آزادی سے قبل افسانہ نگاری میں خاصی شہرت پائی، اُن میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ شامل ہیں۔ مذکورہ فنکاروں سے قبل افسانہ نگاروں کا ایک جم غفیر تھا جس میں ایک دو نہیں بلکہ بہت سے ایسے لکھنے والے تھے جنھوں نے افسانوی ادب میں اپنے لئے مستقل جگہ بنائی تھی۔ ان میں غلام عباس، خواجہ احمد عباس، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، مہندر ناتھ ممتاز مفتی، بلونت سنگھ، دیوندر ستیارتھی اور قدرت اللہ شہاب وغیرہ جیسی شخصیات نمایاں تھیں۔ جن میں کئی لکھنے والوں نے بعد میں تھکن محسوس کی جیسے کہ ممتاز مفتی، لیکن بعض لکھنے والوں نے ایسا قلم چلایا کہ صفحات در صفحات سیاہ کرتے چلے گئے۔ ان افسانہ نگاروں نے بہترین اور مؤثر کن افسانوں کی تخلیق کر کے قارئین کے حلقے میں خوب شہرت حاصل کی۔ بلونت سنگھ بھی انہی افسانہ نگاروں میں شامل ہیں۔ جنھوں نے اردو کے چھ افسانوی مجموعے، چار ناول، تین ناولٹ، ڈرامے اور کئی طنز و مزاحیہ مضامین لکھے ہیں۔ ان کا تخلیقی سرمایہ صرف اردو میں ہی نہیں ہے بلکہ ہندی میں تو ان کے دس افسانوی مجموعے اور چوبیس ناول شائع ہو چکے ہیں۔ اردو میں لکھے گئے افسانوی مجموعوں میں 'جگا' (اپریل ۱۹۴۴ء) 'تاراپود' (سنہ اشاعت درج نہیں ہے: ڈاکٹر جمیل اختر کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب ۱۹۴۵ء کے اواخر میں یا ۱۹۴۶ء کے اوائل میں شائع ہوئی ہے) 'ہندوستان ہمارا' (۱۹۴۷ء) 'سنہرا دیش' (سنہ اشاعت ندارد: ڈاکٹر جمیل اختر کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب ۱۹۵۰ء کے دہے میں شائع ہوئی ہوگی) 'پہلا پتھر' (دسمبر ۱۹۵۳ء) اور 'بلونت سنگھ کے افسانے' (سنہ اشاعت ندارد) قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کے اردو ناولوں میں 'رات، چور اور چاند' (۱۹۶۱ء) 'چک پیراں کا جسّا' (سنہ اشاعت کا اندراج نہیں) اور 'کالے کوس' (سنہ اشاعت درج نہیں ہے) ناول ہیں۔ جبکہ ایک 'معمولی سی لڑکی'، 'عورت اور آبشار' اور 'راوی بیاس' ان کے ناولٹ تصور کیے جانے چاہئے۔ ان سب پر سنہ اشاعت کا اندراج نہیں ہے۔

بلونت سنگھ کے سارے افسانوی مجموعے پاکستان سے شائع ہوئے ہیں۔ ماسوائے افسانوی

مجموعہ 'ہندوستان ہمارا' کے، جس کو الہٰ آباد سے سنگم پبلشرز نے شائع کیا تھا۔ یہ سب افسانوی مجموعے ان کی زندگی اور ان کی نگرانی میں ہی شائع ہوئے۔ لیکن اس کے بعد سے ان کتابوں کے دوسرے ایڈیشن شائع کرنے کی کبھی نوبت ہی نہیں آئی۔ ہمیں احسان ماننا چاہیے ڈاکٹر جمیل اختر کا جنھوں نے بلونت سنگھ کے افسانوی مجموعوں اور ناولوں کو تحقیق، تدوین اور ترتیب کے بعد آٹھ جلدوں میں قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان سے شائع کیا۔ جمیل اختر صاحب ہمیشہ ایسے کاموں پر ہاتھ ڈالتے ہیں جن سے لوگ یا تو خوف کھاتے ہیں یا نام سنتے ہی سر دُھنتے ہیں۔ تحقیقی سطح پر کام انجام دینے کا ان کا ہر طریقہ نرالا ہوتا ہے۔ انھوں نے بلونت سنگھ کے افسانوی مجموعوں میں پہلے سے شامل ۶۵ کہانیوں کے علاوہ نئے دریافت شدہ ۶۷ کہانیوں کو بھی کلیات میں شامل کیا ہے۔ جن سے بلونت سنگھ کے افسانوں کی مجموعی تعداد ۱۳۲ قرار پاتی ہے اور اگر اس فہرست میں ہندی کے دس افسانوی مجموعوں کی ۱۱۲ کہانیوں کو بھی جوڑا جائے تو یہ تعداد ۲۴۴ تک پہنچتی ہے۔ اُن کی کہانیوں کی یہ فہرست حتمی نہیں ہے۔ اس میں اور بھی اضافہ کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ بہر حال بلونت سنگھ کے حوالے سے جمیل اختر کی تحقیق معتبر اور مستند قرار دی جا سکتی ہے۔ مواد کی فراہمی میں انہیں کن دشوار گزار اور جاں توڑ مراحل سے گزرنا پڑا ہوگا اس کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں۔ جمیل اختر موضوعِ بلونت سنگھ کے ساتھ اپنی دلچسپی اور محرک کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''بلونت سنگھ کے کلیات کو مرتب کرنے کا خیال میرے دل میں کئی وجہوں سے پیدا ہوا۔ جس میں سب سے بڑی وجہ اس عظیم افسانہ نگار کو ناقدوں کے ذریعے نظر انداز کیا جانا تھا۔ اردو اور ہندی میں ملا کر تین درجن سے زائد کتابوں کا مصنف اور بقولِ اوپندر ناتھ اشک تقریباً ''تین سو کہانیوں کا خالق'' ہونے کے باوجود ان کے انتقال کے بعد نہ ہی اخبارات میں ان کے موت کی خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی اور جب ارتھی اُٹھی تو اردو، ہندی کے ادیبوں میں سے کوئی وہاں موجود نہیں تھا۔ یہ کیسی دردنا کی تھی۔ نہ ہی کسی رسالے نے اس کے شایانِ شایان کوئی نمبر ہی شائع کیا۔ سوائے چند ایک کے۔ مضامین لکھنے والے لوگوں کی بھی بے حد کمی رہی۔ زیادہ تر مضامین رسائل نے ایک دوسرے سے نقل کیے۔ شاید کسی ناقد نے لکھنے کی حامی نہیں بھری۔ یہ ناانصافی اور دردنا کی مجھ سے دیکھی نہ گئی اور یہیں سے یہ خیال پختہ تر ہوا کہ پرانی پیڑھی نے جو کیا سو کیا۔ میں نئی پیڑھی سے ان کو متعارف کراؤں تا کہ اس ناانصافی کی تلافی ہو سکے۔ یہ سوچ کر قدم آگے بڑھایا۔''
>
> (کلیات بلونت سنگھ 'افسانے'، جلد چہارم، مرتب: جمیل اختر، قومی کونسل، دہلی، ۲۰۱۰ء، ص ۸)

ڈاکٹر جمیل اختر سے پہلے بلونت سنگھ پر سب سے پہلی کتاب ''بلونت سنگھ کے بہترین افسانے'' ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی لکھی ہوئی ہے۔ اس میں بلونت سنگھ کی شخصیت اور فن پر گوپی چند نارنگ

نے بالغانہ اور مفکرانہ انداز میں بہت ہی عمدہ، بسیط اور بلیغ مقدمہ بعنوان ''سائیکی، ثقافت اور شکست رومان'' ۷۰ صفحات پر مشتمل تحریر کیا ہے۔ موصوف نے اب تک جن موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے اُس میں اپنی تحقیق وتنقیدی صلاحیت، علمی ذکاوت وادراکی قوت، عالمانہ سُوجھ بُوجھ اور بصیرت افروز معلومات کی بنیاد پر نئے نئے گل بوٹے کِھلائے ہیں۔ ان کے بلیغ ذہن اور روشن ضمیری کی بہ نسبت ہی بلونت سنگھ سے آج پوری اردو دنیا متعارف ہوچکی ہے۔ انہی کی تحریک پر کتاب نما، جامعہ، سوغات اور آجکل میں بلونت سنگھ پر خصوصی گوشے شائع کئے گئے۔ ''بلونت سنگھ کے بہترین افسانے'' کتاب کے ہندی اور انگریزی تراجم بھی ہوچکے ہیں۔ اس میں بلونت سنگھ کے اکیس بہترین افسانوں کا انتخاب شامل ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بعد اور جمیل اختر سے پہلے یعنی درمیان میں بلونت سنگھ پر ہندوستان کی جن جامعات میں تین تحقیقی مقالے لکھے گئے ان میں ایک مقالہ دہلی یونی ورسٹی میں، دوسرا جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اور تیسرا کلکتہ یونی ورسٹی میں تحریر کیا گیا ہے۔ ممتاز آرا کو دہلی یونی ورسٹی میں ''بلونت سنگھ: شخصیت اور فن'' پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی ہے۔ جو پھر کتابی صورت میں ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی۔ تینوں مقالات میں کوئی نئی اور پُر مغز تحقیق نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ بلونت سنگھ کے تئیں ناقدینِ ادب کے ادبی یا ذاتی تعصّبات کارفرما ہوسکتے ہیں۔ دوسری وجہ مواد کی عدم دستیابی ہے۔ لیکن پھر بھی ان کی تحقیق برحق قرار دی جاسکتی ہے کیونکہ کھلے میدان میں گھوڑے دوڑانا تو آسان کام ہے جبکہ ہجوم سے بھرے میدان میں انتہائی مشکل۔

بلونت سنگھ کے تخلیق کردہ ادبی سرمایے پر اتنا کم لکھا گیا ہے کہ چند سطروں میں پوری داستان بیان ہوسکتی ہے۔ پرانے تو پرانے آج کے ادبا اور ناقدین حضرات بھی تنگ نظری کے شکار نظر آتے ہیں۔ ایسے میں کہا جاسکتا ہے کہ ادبی دائرہ کو وسعت بخشنے اور کشادگی عطا کرنے کے بجائے ادب کو سمیٹنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ بلونت سنگھ پر نہ لکھنے کے کیا وجوہات ہوسکتے ہیں؟ اس کا خلاصہ اس مضمون کی آئندہ سطور خود بخود واضح ہوتا جائے گا۔

بلونت سنگھ جون ۱۹۲۱ء میں ضلع گوجرانوالہ موضع بہلول، مغربی پنجاب (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آبائی گاؤں کے پرپیریٹری اسکول میں ہوئی۔ ان کے والد لال سنگھ دہرہ دون کے ملٹری کالج میں لکچرر تھے۔ کچھ برسوں بعد انہیں بھی والد کے پاس دہرہ دون جانا پڑا۔ یہیں سے انھوں نے میٹرک کیا۔ بعد میں الہ آباد یونی ورسٹی سے ایف۔ اے اور پھر اس کے بعد یہیں سے بی۔ اے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ ۱۹۴۸ء میں ان کی شادی ہوئی۔ لیکن بعض وجوہ کی بنا پر ایک سال بعد ہی طلاق ہوگئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بقول دوسری شادی اکیس برس بعد منجھو سے ہوئی۔ جن سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہوئی۔ ان کی دوسری بیوی ان سے ۲۵ سال چھوٹی تھی۔ بلونت سنگھ جولائی ۱۹۴۸ء سے جنوری ۱۹۵۰ء تک پبلی کیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات و نشریات، حکومت ہند کے رسائل 'آجکل'، 'بساطِ عالم' اور 'نونہال' کے ادارتی عملے سے وابستہ رہے۔ ملازمت سے

استعفیٰ دینے کے بعد مستقل طور پر الہ آباد منتقل ہوگئے۔ اسی زمانے میں ان کے والد کا انتقال بھی ہوگیا۔ ابتدا میں والد کے قائم کردہ ''امپیریل ہوٹل'' کو سنبھالا۔ لیکن بعد میں عدم توجہی کے باعث ہوٹل کو فروخت کردیا۔ آخر میں کینسر جیسی موزی بیماری لاحق ہوئی۔ بالآخر ۲۷/ مئی ۱۹۸۶ء کو ان کا انتقال ہوا۔

بلونت سنگھ بڑے بڑے اعزازات کے مستحق تھے لیکن ان کی زندگی میں انہیں صرف اتر پردیش سرکار ادبی ایوارڈ، بھاشا وبھاگ حکومتِ پنجاب کا ادبی ایوارڈ اور پنجاب سے ہی شرومنی ساہتیہ کار ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان کی اردو اور ہندی زبانوں میں مجموعی طور پر چالیس سے زائد تصانیف شائع ہوئی ہیں۔ جن میں زیادہ تر ہندی کتابیں ہیں۔ اردو میں غیر معمولی لیاقت رکھنے کے باوجود اردو میں کم لکھنے کی بلونت سنگھ کی کیا وجوہات ہوسکتی ہیں اس کو جمیل اختر کے درج ذیل اقتباس سے سمجھنے میں مدد ملتی ہے:

> ''ہندوستان ہمارا'' کو چھوڑ کر بلونت سنگھ کے باقی تمام افسانوی مجموعے پاکستان میں شائع ہوئے ہیں۔ ''ہندوستان ہمارا'' الہ آباد سے شائع ہوا ہے۔ تمام مجموعوں کی اشاعت دوم کی نوبت نہیں آئی۔ قاری نے بھی نہ جانے کیوں ایسی بے رُخی برتی کہ بلونت سنگھ یا تو دل بدل ہوگئے یا انھوں نے اس جانب توجہ نہیں دی اور صرف ہندی میں کتابیں چھپوانے میں مشغول رہے۔ کیونکہ تقسیم کے کچھ دنوں بعد اردو کی زبوں حالی کو دیکھتے ہوئے انھوں نے ہندی میں لکھنا شروع کردیا تھا۔ اردو میں برائے نام لکھتے تھے۔''
>
> (کلیات بلونت سنگھ از مرتب کردہ جمیل اختر، جلد ۱، ص ۲۲)

بلونت سنگھ نے اردو میں کئی لازوال کہانیاں لکھیں۔ انھوں نے پہلی کہانی 'سزا' میٹرک میں لکھی تھی۔ جو ماہنامہ 'ساقی' دہلی میں شائع ہوئی تھی جس کو پڑھ کر کرشن چندر بھی بے حد متاثر ہوئے تھے۔ بلونت سنگھ نے نریش کمار شاد کو دیے گئے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ نذیر احمد چودھری کے بقول ''کرشن چندر تو لاہور بھر میں 'ساقی' کے اس شمارے کو گھماتا پھرا اور اپنے ہر ملنے والے سے کہتا رہا کہ دیکھو افسانے یوں لکھے جاتے ہیں۔'' اس کے بعد بلونت سنگھ کا قلم نہیں رُکا بلکہ مسلسل لکھتے گئے۔ ان سے پہلے بیدی، کرشن چند، عصمت، منٹو وغیرہ اردو ادب میں اپنا مقام متعین کرچکے تھے۔ لیکن جب بلونت سنگھ نے افسانوی دنیا میں اپنے قدم جمانے شروع کیے۔ تو ان افسانہ نگاروں کے ہم پلہ ان کے بھی افسانے شائع ہوتے رہے۔ بلونت سنگھ نے جن ملکی اور غیر ملکی افسانہ نگاروں سے اثر قبول کیا ہے۔ ان میں اردو میں کرشن چندر، سدرشن، نیاز فتحپوری، سجاد حیدر یلدرم، حجاب امتیاز، اور غیر ملکی افسانہ نگاروں میں چیخوف، کیتھرین، مینس فیلڈ، ڈی۔ ایچ۔ لارنس، ٹامس مان، ٹالسٹائی وغیرہ اہم ہے۔

بلونت سنگھ نے بہت لکھا اور اعلیٰ درجے کا لکھا۔ ان کے لکھے ہوئے افسانے نامور رسائل ساقی، ادبی دنیا، آجکل، سوغات، نقوش، ہمایوں، فسانہ، مسیحی دنیا، نئی دنیا، تیج ویکلی وغیرہ وغیرہ میں شائع ہوئے۔ بلونت سنگھ

نے اس زمانے میں لکھا جب ترقی پسندی کا دورہ دورہ تھا۔ ادب میں افادیت ترقی پسندی کے لئے نزدیک ناگزیر تھی۔ ہر ادیب ترقی پسندی کی حمایت میں لکھتا تھا۔ کرشن چندر، عصمت، بیدی، منٹو، خواجہ احمد عباس، غلام عباس وغیرہ سب ترقی پسند کہانیاں لکھتے تھے۔ قطع نظر اس کے بلونت سنگھ کی کہانیوں میں بظاہر کوئی ایسی افادیت نہ دکھائی دیتی تھی۔ شاید اس لئے کہ کسی نقاد یا ادیب نے اعلیٰ درجے کے افسانہ نگاروں کی فہرست میں بلونت سنگھ کا نام نہیں لیا۔ اس کا ایک سبب بلونت سنگھ کی انا بھی تھی۔ جو انہیں اپنے زمانے کے دوسرے ادیبوں سے دور کر رہی تھی۔ وہ اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کو اپنے سے کم تر تصور کرتے تھے۔ ابتدا سے آج تک ادب مختلف ادبی گروہوں، ادبی تحریکوں اور دبستانوں کے زیر اثر وجود میں آتا رہا ہے اور ہر زمانے میں ادبا ان ہی حلقوں اور گروہوں کے بنائے ہوئے اصولوں کے کاربند اور پیروی کرتے رہے ہیں۔ بلونت سنگھ کے دور میں بھی ترقی پسندی کی تحریک عروج پر تھی۔ اکثر و بیشتر ادبا اسی کے بنائے مورینڈم اور بینر تلے لکھتے۔ افسانہ نگاروں کے اپنے اپنے گروہ تھے جو اپنے اپنے لوگوں کا نام اچھالتے تھے۔ لیکن بلونت سنگھ نے نہ کبھی کسی حلقہ کا اثر قبول کیا، نہ کسی گروہ کے ساتھ اپنی وابستگی قائم کی، نہ کسی نقاد کو پٹایا اور نہ کبھی کسی سے لکھنے کی فرمائش کی۔ یہاں تک کہ رسائل کے مدیران ان کی کتابوں پر خود انہی سے مضمون لکھوانے کی پیش کش کرتے۔ یہ کیا کسی المیہ سے کم ہے کہ شخصیت کی آڑ میں ادب کو قربان کیا جاتا رہا ہے۔ بلونت سنگھ کو اپنے معاصرین سے شاذ ہی ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ دوست واحباب انھوں نے بنائے ہی نہیں۔ انھوں نے بالکل گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کی تھی۔ کہیں جانا ہوتا تو اکیلے ہی جاتے۔ ان کی شخصیت نمایاں ہونے میں یہ سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ ملنا جلنا انہیں پسند نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ''اَن سوشل'' کہا گیا۔ بلونت سنگھ پر مضامین اور دوسری لکھی ہوئی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اندرون بین شخص تھے۔ انھوں نے دنیا کی باتوں سے بے پروا ہو کر لکھا اور بہت لکھا۔ یہاں تک ان کے لکھنے کی رفتار بڑھتی گئی اور وہ اپنے تخئیل کی خلق کی ہوئی دنیا میں مگن ہو گئے۔ ان کی کہانیوں کی مہک اور نگارنگی سے ان کی زندگی کا اصلی حسن نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ پرفیسر گوپی چند نارنگ بلونت سنگھ کے افسانوی جہات کا ان الفاظ میں کا کہ کھینچتے ہیں:

> ''اردو افسانہ تنوع کے اعتبار سے ایک قوس قزح کی طرح ہے، جس کے رنگ ایک کے بعد ایک تنے ہوئے ہیں۔ ہر چند کہ بلونت سنگھ کو ان کی زندگی میں بھی کوئی اہمیت نہ دی گئی، اور موت کے بعد تو فراموش ہی کر دیا گیا۔ لیکن اردو افسانوں کے رنگوں میں ایک رنگ بلونت سنگھ کا بھی ہے، جو خاصا خوشنما ہے اور دوسروں سے الگ بھی ہے، افسانوں کے افق پر اس وقت منٹو، بیدی، کرشن چندر اور عصمت چھائے ہوئے تھے۔ جس سے بلونت سنگھ کی مہک پھیلی تو لیکن اتنی نہ پھیلی جتنا اس کا حق تھا۔ اس میں کچھ خود بلونت سنگھ کی کم آمیزی کا بھی دخل تھا اور کچھ یہ بھی کہ بعد میں ان کی

> زیادہ تر کتابیں، ناول اور افسانے ہندی میں بھی شائع ہوتے رہے اور اردو نے اپنے ایک البیلے فنکار کو فراموش کر دیا۔''
>
> (بلونت سنگھ کے بہترین افسانے از مرتبہ گوپی چند نارنگ، ص ۶۸)

بلونت سنگھ شریف النفس، خوددار، خود پسند، بیباک، صاف گو اور تنہائی پسند آدمی تھے۔ ان کی سادگی، بے ساختگی اور نرم مزاجی کا اثر ان کے افسانوں پر بھی پڑا ہے۔ بلونت سنگھ کی طرف اگرچہ ابتدا سے ہی کم توجہ مبذول فرمائی گئی لیکن ان کے تخلیق کیے گئے افسانوں کو ہمیشہ پسند کیا گیا۔ بلونت سنگھ اردو کے معروف اور بلند پایہ کے افسانہ نگار تھے اور ہمیشہ رہیں گے۔ اردو کے مایہ ناز افسانہ نگار کرشن چندر نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ''بلونت سنگھ ان خوش نصیب افسانہ نگاروں میں سے ہیں جو صرف ایک افسانہ لکھ کر بقائے دوام حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کا افسانہ 'سزا' ان کی پہلی کوشش ہے لیکن اس قدر کامیاب، اس قدر خوبصورت، اس قدر جامع کہ حرفِ اول حرفِ آخر معلوم ہوتا ہے۔'' راجندر سنگھ بیدی نے بھی ان کے افسانوں کی تنوع اور شگفتگی کی داد دی۔ پروفیسر وقار عظیم بلونت سنگھ کے متعلق یوں لکھتے ہیں کہ:

> ''بلونت سنگھ کے متعلق میں ایک صاحب نے لکھا ہے کہ انھیں دیکھ کر افسانہ کا گمان تو ہوسکتا ہے، افسانہ نگار کا نہیں۔ جب یہ بات لکھی گئی تھی اس کے بعد سے بلونت سنگھ نے اپنے اور بھی زیادہ افسانہ نگار ہونے کا ثبوت دیا ہے، اور اپنی افسانہ نگاری کی بہت تھوڑی عمر میں اپنے آگے چلنے والوں سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔''
>
> (نیا افسانہ از وقار عظیم، ص ۱۹۰)

ان سب کی صف میں عہد حاضر میں اردو کے بہت بڑے نقاد تصور کیے جانے والے شمس الرحمٰن فاروقی بھی شامل ہیں۔ جنھوں نے بلونت سنگھ کو ابتدا سے ہی پڑھا اور بعد میں ایک مبسوط مقالہ تحریر فرما کر اردو والوں کی بلونت سنگھ کے تئیں ناحق شناسی کی بازیافت کی ہے۔ ان کے مطابق:

> ''آج کے لوگوں میں سے اکثر نے بلونت سنگھ کا نام ہی نام سنا ہوگا، ان کی کوئی تحریر پڑھی نہ ہوگی۔ ہاں جب ہم لوگ ادب کی دنیا میں داخل ہو رہے تھے، اور ہر نو آمدہ ادیب کی جیب میں ایک دو افسانے ہر وقت پڑے رہتے تھے، اور ہر شخص، منٹو، بیدی، کرشن چندر کے تازہ افسانوں کو جلد از جلد پڑھ ڈالنا چاہتا تھا، ان دنوں میں بلونت سنگھ کے بھی جاننے والے، ماننے والے اور چاہنے والے بہت تھے۔''
>
> (افسانے کی حمایت میں از شمس الرحمٰن فاروقی، ص ۷۶)

بلونت سنگھ اردو کے ایک مقبول افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کو اُس وقت بھی پسندیدگی کی

نگاہ سے دیکھا گیا، اور دلچسپی سے پڑھا گیا جس وقت اردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگاروں کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔ مندرجہ بالا میں پیش کی گئی مختلف مشاہیر کی آراؤں سے اس کا اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔

بلونت سنگھ کثیر التصانیف اور کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ اگرچہ ناولوں کے برعکس ان کے افسانوی کتابوں کی تعداد کم ہے لیکن جتنی بھی ہے ان کے ناولوں پر بھاری پڑتی ہے۔ بلونت سنگھ نے پنجاب کے دیہات، دیہات میں رہنے والے کسانوں، ان کسانوں کی جفاکش زندگیوں، نچلے اور درمیانہ طبقے کے دیہاتیوں، ان دیہاتیوں کی معاشی اور اخلاقی اقدار کی صورتِ حال، ان کی مظلومیت، بھوک، بیکاری، ذہنی اور نفسیاتی مسائل، دیہات میں رہنے والے مختلف مذاہب کے لوگوں، ان کے فکر و احساسات، جذبات اور خیالات، رشتوں، ان کی جرائم پیشہ زندگی، تندمزاجی، وغیرہ کو اپنے افسانوں کے موضوعات بنا کر پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں سکھ اور خصوصاً جاٹ سکھ کو بنیادی کردار بنانے کی بے حد عمدہ کوشش ہے۔ مشکل سے ہی کوئی افسانہ ایسا ہوگا۔ جس میں جاٹ سکھ کے کردار کا استعمال نہ کیا گیا ہو، اور جس خوبی سے اس کردار کو افسانوں میں پیش کیا ہے وہ انہی کی تخلیقی صلاحیت کی مہمیز ہیں۔

ہندوستان کی سماجی زندگی دیہات سے عبارت ہے۔ اس لئے ہمارے بیشتر ابتدائی افسانہ نگاروں کے یہاں دیہات سے جڑے بہت سارے موضوعات پائے جاتے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں میں پریم چند، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، سہیل عظیم آبادی، سدرشن، علی عباس حسینی، بیدی، عصمت چغتائی وغیرہ شامل ہیں۔ بلونت سنگھ سے پہلے بھی ہمارے بعض افسانہ نگاروں نے پنجاب کے دیہات کو زندگی دی تھی۔ لیکن جب بلونت سنگھ اس میدان میں آئے۔ ان کے افسانوں کو پڑھکر یوں محسوس ہونے لگا کہ ہم نے اب تک پنجاب کے دیہات کو یا تو دیکھا نہیں تھا یا دیکھا تھا تو بہت دور سے دیکھا تھا۔ پنجاب کے دیہات سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ بدحال کسانوں اور ظالم زمینداروں کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ جاگیردارانہ معیشت، جہالت، مفلسی اور ان سب کے پیدا کردہ حالات جن کا دباؤ آدمی کو جرائم پیشہ زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ 'بابا مہنگا سنگھ'، 'کالی تیتری'، 'پنجاب کا البیلا'، 'تین چور' اور 'گرنتھی' جیسے افسانوں میں کم و بیش انھیں موضوعات کو بنیاد بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتاب ''بلونت سنگھ کے بہترین افسانے'' میں جن افسانوں کو شامل کیا گیا ہے ان میں 'جگا'، 'گرنتھی'، 'سزا'، 'راستہ چلتی عورتیں'، 'تین باتیں'، 'کالے کوس'، 'لمحے'، 'ہندوستان ہمارا'، 'دیبلے ۳۸'، 'پہلا پتھر'، 'دیش بھگت'، 'سورما سنگھ'، 'کالی تیتری'، 'گمراہ'، 'نہال چند'، 'خوددار'، 'سمجھوتہ'، 'پیرویٹ'، 'دیمک' اور 'کٹھن ڈگریا' خاص طور قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب کا شمار بلونت سنگھ کے بہترین افسانوں میں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب بلونت سنگھ ان کے بہترین افسانوں کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے بھی 'گرنتھی'، 'دیوتا کا جنم'، 'سزا' اور 'چکوری' وغیرہ کا ذکر کیا۔ جب گوپی چند نارنگ نے ان کے بہترین افسانوں کا انتخاب کیا تھا تب ان

کے سامنے محض وہی چھ افسانوی مجموعوں میں شامل ۶۵ کہانیاں رہی ہوں گی۔ لیکن اب صورتِ حال یکسر بدل گئی ہے۔ جمیل اختر صاحب کی بہترین تحقیقی صلاحیت سے مزید ۶۷ کہانیوں کا اس میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ اب اگر بلونت سنگھ کے بہترین افسانوں کی بات کی جائے گی۔ تو یقیناً اس میں اور بھی کہانیاں شامل کی جا سکتی ہیں۔

''جگا'' کو بلونت سنگھ کے بہترین رومانی افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یوں تو ان کی بہت ساری کہانیوں میں رومان، حقیقت اور تخلیقی حسیّت کے آہنگ کا امتزاج بالعموم نظر آتا ہے۔ لیکن ''جگا'' ان میں سے بالکل ایک منفرد کہانی ہے۔ اس کہانی میں بھیکن نام کا ایک چھوٹا سا غیر معروف علاقہ صرف سکھوں کی آبادی پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس گاؤں میں حسین لڑکیوں کا پیدا ہونا کوئی نئی بات نہیں اور پھر ان خوبصورت لڑکیوں کے دورِ شباب میں پُر لطف عشقیہ کہانیاں جنم لیتی۔ گورنام اسی گاؤں کی ایک حسین، شیتل، کومل، نرمل، چنچل، نازک، معصوم الھڑ لڑکی ہے۔ جس کے کئی دیوانے ہوتے ہیں۔ جس میں شنگارا سنگھ اور دلیپ سنگھ بھی ہیں۔ شنگارا سنگھ کے ہوتے ہوئے گاؤں میں کوئی بھی گورنام کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتا۔ ایک دن دلیپ اس سے مار بھی کھاتا ہے۔ لیکن ایک روز 'جگا' نام کا ایک خوفناک ڈاکو جس کا اصلی نام سردار جگت سنگھ ورک ہوتا ہے، رات کی تاریکی میں سانڈنی پر سوار اس گاؤں سے گزرتے ہوئے رہٹ پر پیاس بجھانے کے لئے رکتا ہے۔ بلونت سنگھ نے 'جگا' کے کردار کو بڑے خوفناک اور وحشت ناک انداز میں پیش کیا ہے۔ آس پاس کے علاقوں کے سبھی لوگ جگا کے نام سے کانپے اور لرزتے ہیں۔ لیکن رہٹ پر اچانک اس کی حسنِ اتفاق سے گرنام سے ملاقات ہوتی ہے۔ گرنام اس کی اصلیت سے واقف نہیں ہوتی۔ 'جگا' گرنام سے پوری واقفیت حاصل کرنے کے بعد اس کے ساتھ اسی کے گھر جاتا ہے۔ جہاں وہ گرنام کے گھر والوں سے اجازت حاصل کرنے کے بعد رات بھر ٹھہرتا ہے۔ وہ شام کے وقت گرنام کو اکیلے میں کھیتوں میں ملنے کو کہتا ہے۔ گرنام معصومانہ انداز میں ملنے جاتی ہے۔ جہاں باتوں باتوں میں 'جگا' کے ہاتھوں سے زیور گرتے ہیں۔ بالآخر سمجھانے بجھانے کے بعد دونوں ایک دوسرے کی چیزیں بدل دیتے ہیں۔ صبح کو جب 'جگا' نکلنے کی تیاری میں ہوتا ہے تو گرنام کے باپو اس سے نام پوچھتے ہیں، جواب ملتا ہے کہ کسی سے مت کہنا کہ آج رات 'جگا' تمہارا مہمان تھا۔ ورنہ انجام سب کی موت ہے۔ اس کے بعد سے 'جگا' گرنام کو رات کے اندھیرے میں روز ملنے آتا ہے۔ آہستہ آہستہ 'جگا' کو گرنام سے محبت ہوتی ہے۔ لیکن اس محبت سے گرنام انجان تھی۔ اسی اثنا میں لوگوں کو بھی پتہ چلتا ہے کہ گرنام کی محبت میں 'جگا' نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے اور وہ اپنے آپ کو گرنام کے قابل بنانا چاہتا ہے۔ اور سچ بھی یہی ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے وہ کبھی گرنام سے اپنے پیار کا اظہار نہیں کر پاتا۔ ایک دن جب گرنام کے گھر والے اس کی کسی انجان لڑکے سے شادی طے کرتے ہیں تو وہ 'جگا' سے مدد مانگتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ دلیپ سنگھ سے پیار کرتی ہے۔ جس سے سن کر 'جگا' چونک اُٹھتا ہے اور ایک دن دلیپ سنگھ پر قاتلانہ حملہ کر بیٹھتا ہے۔ مگر دلیپ سنگھ اس حادثے میں بچ جاتا ہے۔ ایک مرتبہ 'جگا' کو حقیقی محبت کا

اندازہ ہوجاتا ہے اور بالآخر میں دونوں کی شادی کرواتا ہے اور خود پھر سے خونخوار ڈاکو کی شکل اختیار کرتا ہے۔

یہ کہانی بہت اچھا پیغام دیتی ہے۔ 'جگا' ایک بڑی قد کاٹھی کا، تندرست، لحیم شحیم، بدصورت، ظالم، سخت گیر نوجوان ہے۔ امیروں کے یہاں ڈاکہ ڈال کر غریبوں میں فراخدلی سے تقسیم کرتا ہے۔ ہر غریب کی دعا اس کے ساتھ ہے۔ کوئی اس کے خلاف گواہی دینے کو تیار نہیں۔ کیونکہ یہ سب کا ان داتا ہے۔ لیکن 'جگا' خون کی ہولی بھی کھیل سکتا ہے۔ گرنام سے محبت کے بعد اس میں بہت بدلاؤ آنے لگتا ہے۔ کچھ وقت تک خون خرابے سے دور بھی رہتا ہے۔ لیکن جب اس کو پتہ چلتا ہے کہ گرنام کسی اور سے پیار کرتی ہے۔ تب طیش میں آکر مرنے مارنے پر دوبارہ آمادہ ہوجاتا ہے۔ آخر کار سچی محبت کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوتا ہے، اور دونوں گرنام اور دلیپ سنگھ کی شادی کی رسم اپنے ہاتھوں سے انجام دیتا ہے۔ بلونت سنگھ نے یہاں پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک ڈاکو میں بھی انسانیت کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ جو جابر اور ظالم سرمایہ داروں کو لوٹ کر غریبوں کی مدد کرتا ہے۔ جس کے دل میں محبت کا جذبہ بھی ہے۔ جو غلط کاموں سے باز بھی آسکتا ہے۔ جو عاشق ہے لیکن محبت کو قربان کرنے کا سلیقہ بھی رکھتا ہے۔ اگر 'جگا' چاہتا تو دلیپ سنگھ کا قتل بھی کرسکتا تھا۔ لیکن وہ گرنام کو دکھی یا تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ دراصل ایک اچھا انسان بننے کی ہر خوبی 'جگا' ڈاکو میں موجود ہوتی ہے۔ تو پھر اس سے ڈاکہ زنی، لوٹ مار، خون خرابہ جیسا راستہ اختیار کرنے پر کس نے مجبور کیا؟۔ اس کا پورا دارومدار ہمارے معاشرے پر ہے جو 'جگا' جیسے ڈاکوؤں کو جنم لینے سے پر مجبور کرتے ہیں۔ اوپندر ناتھ اشک اس کہانی کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''جگا، تخیلی، رومانی اور فارمولا کہانی ہے۔ نک چڑھے ساتھی، ادیب یا نقاد اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہوئے لاکھ اسے ہوائے اڑائیں۔ لیکن جب یہ دنیا بنی ہے اور نامرادی عاشقوں کے قصّے مشہور ہوئے ہیں ایسی کہانیاں لکھی اور پڑھی جاتی رہی ہیں اور آئندہ بھی لکھی اور پڑھی جاتی رہیں گی، اور اگر بلونت سنگھ جیسے کسی فنکار کے سدھے ہوئے ہاتھوں کا لمس اُنہیں مل گیا تو زندہ جاوید بھی ہوجائیں گے۔''
>
> (بلونت سنگھ: شخصیت اور فن از اوپندر ناتھ اشک، ماہنامہ آجکل، جنوری ۱۹۹۵ء، ص ۸)

اس کہانی میں ماحول، واقعات، فضا، مکالمے کردار سب جیتی جاگتی دنیا کے معلوم ہوتے ہیں۔ غرض کہ پوری کہانی حقیقی اور تجرباتی زندگی سے قریب تر نظر آتی ہے۔

''آزادی کے بعد اردو افسانہ: ایک انتخاب'' میں بلونت سنگھ کا ایک افسانہ ''دیش بھگت'' بھی شامل کیا گیا ہے۔ ان کے کم وبیش افسانوں میں سکھ کرداروں کے ساتھ ساتھ مسلمان کردار بھی نظر آتے ہیں۔ مذکورہ افسانہ میں بھی یہ خوبی ہے۔ 'دیش بھگت' ان کی حاضر راوی کہانی ہے۔ جس میں راوی صرف حالات سے واقف کراتا ہے۔ تبصرہ نہیں کرتا۔ 'راوی' نے ایک ادھیڑ عمر کے سردار جی کو 'چچا' کہا ہے۔ جن کی عمر تقریباً ۴۵ ہیں لیکن اپنے آپ کو

بائیس کی عمر کا ٹھہراتے ہیں۔ 'چچا' راوی کا کچھ نہیں لگتا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دونوں ایک ہی گاؤں کے ہیں۔ 'چچا' راوی کو ایک روز شام کو اپنے ساتھ کسی کام کے واسطے لے جاتا ہے۔ راستے میں انہیں تیرہ چودہ برس کی ایک کم سن، لاچار، بے بس، غریب، مظلوم عورت دھول میں لپٹی ہوئی ملتی ہے۔ اپنے سامنے لحیم شحیم مردوں کو پا کر یہ کم سن لڑکی خوفزدہ ہوتی ہے اس کو اپنی عزت خطرے میں محسوس ہوتی ہے۔ 'چچا' دیکھتا ہے کہ ایک عورت جو ایک چالاک لومڑی جیسی بڑھیا کے قریب ٹاٹ پر بیٹھی ہے۔ جس میں سوائے اس کے کہ جوان تھی، اور کوئی خوبی نہ تھی۔ بڑھیا اس کا سودا آٹھ آنے کر رہی تھی۔ راوی کہتا ہے کہ پھر چلتے چلتے کئی گلیوں سے گزرتے ہوئے آخر کار مجید کے گھر پہنچے۔ مجید نے خوب آؤ بھگت کی۔ 'چچا' اور مجید کے درمیان کانا پھوسی ہوتی ہے اور کچھ منٹوں بعد وہی لڑکی بڑھیا کے ساتھ آتی ہے اب پانچ لوگ موجود ہوتے ہیں۔ جہاں سب کے سامنے لڑکی کو 'چچا' کو سپرد کیا جاتا ہے۔ چچا اس لڑکی کو بہلا پھسلا کر گھر لے جانے میں کامیاب ہوتا ہے اور بعد میں اپنی ہوس کا شکار بنانا چاہتا ہے۔ کچھ دنوں بعد جب راوی چچا کے گھر سے گزرتا ہے تو لڑکی کے چلانے کی آواز سے لگتا ہے کہ چچا لڑکی کے ساتھ زور زبردستی کر رہا ہوتا ہے۔ جہاں کرب کی حالت میں لڑکی اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب ہوتی ہے۔ اس کے بعد انہی دنوں میں جواہر لال نہرو کی آمد میں جلسہ منعقد کیا جاتا ہے۔ جہاں چچا اور مجید بھارت ماتا کی جے، پنڈت جی کی جے، مہاتما گاندھی کی جے وغیرہ کے نعرے لگاتے ہیں۔ اس افسانہ میں چچا جیسے لوگوں کے چہروں سے نقاب اُٹھایا گیا ہے جو ایک طرف محبِ قوم کے نعرے بلند کرتے ہیں تو دوسری طرف عورتوں کی آبرو کے ساتھ کھیلنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ اس کھیل میں صرف ایک سکھ چچا مجرم نہیں ہے بلکہ مجرم ہے مجید، مجرم ہے بڑھیا، مجرم ہے راوی جو مظلوم کی مظلومیت کا نظارہ کرتے ہیں اس کی چیخ سنتے ہیں اور بے غیرتی کے ساتھ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک گھنونے کاموں میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ دراصل یہ سب ملک وقوم کے نام پر ایک بدنما داغ ہے۔ جو معاشرت کو پلیدہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ جن کی پہنچ ہر چھوٹے بڑے شخص تک ہے۔ یہاں جرائم پیشہ افراد کسی ایک مذہب سے تعلق نہیں رکھتے۔ اس افسانے کی منظر کشی کمال کی ہے اور اس کا بیانیہ بھی مؤثر ہے۔

بلونت سنگھ نے افسانہ ''ہندوستان ہمارا'' میں ایک ہندوستانی سکھ فوجی کی داستان پیش کی ہے۔ جگجیت سنگھ جو فوج کی نوکری کرتا ہے اور جس کی شادی کو صرف چار پانچ مہینے ہی ہوئے ہوتے ہیں۔ بیوی کو پہاڑی کی سیر کرانے کی غرض سے چھٹی لے کر گھر آتا ہے۔ گھر میں ماں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی بیوی 'جوڑ' میلے میں اس کے بہنوں کے ساتھ چلی گئی ہے۔ چونکہ اس کی تازہ تازہ ہی شادی ہوئی تھی اس لئے اُتاؤلے پن میں بیوی کو دیکھنے کا زیادہ ہی اشتیاق پیدا ہو رہا تھا۔ جلدی سے میلے میں پہنچ گیا اور میلے کی ہر تفریح کن جگہ چھان ماری لیکن بیوی کو نہ پایا۔ اس دوران اسے میلے کے کئی پرکشش مناظر دیکھنے کو ملے۔ لیکن آخر کار تھک ہار کر من ہی من میں بیوی کو کوستا رہا۔ بالآخر میلے میں بہن کو دیکھ کر بیوی کے پاس پہنچ ہی جاتا ہے اور اپنی آپ بیتی

سناتا ہے۔گھر پہنچنے کے بعد اپنی بیوی کو سیر پر لے جانے کی تیاری کرتا ہے۔لیکن ماں اشاراً کنایاً سمجھاتی ہے کہ اس کی بیوی ماں چار مہینے کے پیٹ سے ہیں۔اس لئے جانے کی اجازت نہیں دے گی۔لیکن بیٹے کی ضد کے آگے اس کی ایک نہیں چلتی۔دونوں میاں بیوی سفر کے لئے سامان باندھتے ہیں۔چونکہ جگجیت سنگھ کو ترقی ملی ہوتی ہے اور وہ اب لفٹننٹ بن گیا ہوتا ہے۔اسی خوشی میں جگجیت اپنی بیوی ایک مہنگے ہوٹل میں کھانا کھلاتا ہے۔اس دن جنگ کی وجہ سے پلیٹ فارم پر زیادہ بھیڑ ہوتی ہے۔ان دونوں کے پہنچنے پر سکنڈ کلاس کے ایک ڈبہ میں صرف ایک انگریز بیٹھا تھا۔جوانہیں بھی ڈبہ میں چڑھنے سے منع کرتا ہے۔ابتداً جگجیت نے ہر اصول کی پیروی کی۔اس کے بعد بھی کچھ نہ چلا۔چونکہ جگجیت سنگھ بڑا نڈر رہے اور بہادر فوجی بھی۔انگریز کی آنا کانی کرنے پر اُسے فلیٹ فارم پر دھکیل دیا۔''جونہی جگجیت سنگھ نے پائیدان پر پاؤں رکھا۔گاڑی چل دی۔''

اس کہانی میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح غیر ملکی ہونے کے باوجود انگریز نے جگجیت کو ڈبے میں بیٹھنے سے منع کیا۔مادرِ وطنی کے باوجود انگریز یہاں کے لوگوں کے ساتھ کس قدر استحصال کر رہے تھے۔اس کہانی میں انگریز سامراج سے نفرت اور عوام میں آزادی کے احساسات کی بھرپور ترجمانی کی گئی ہے۔سکھ مذہب کے رسم و رواج کی اس کہانی میں خوب عکاسی کی گئی ہے۔سکھوں میں جوش، جذبہ، محبت، بھائی چارگی بیان کر کے ساتھ ساتھ ان کی بہادری کے قصے بھی اس کہانی میں سنائے گئے ہیں۔

بلونت سنگھ کی دیگر کہانیوں میں 'پردیسن'، 'ماتا ہری'، 'خدا کی وصیت'، 'بھول بھلیاں'، 'خلا'، 'تین باتیں'، 'تلچھٹ'، 'رقیب'، 'آشیانہ'، 'کلی کی فریاد'، 'حدِ فاصل'، 'بازگشت'، 'اعتراف'، 'ایک ہی ناؤ میں'، 'چالان'، 'بھیک'، 'سکوت'، 'ڈاکو' اور 'موت' وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

بلونت سنگھ نے اپنی کہانیوں کو کسی ایک موضوع محدود نہیں رکھا، بلکہ انہیں تو ہر موضوع کو برتنے میں فنی اختصاص حاصل ہے۔ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے صرف سکھ جاٹ کے لوگوں پر مبنی کہانیوں کو ہی اہمیت دی ہو۔بلکہ انھوں نے ہر طبقے، فرقے اور مذہب کی برابر نمائندگی کی ہے۔انھوں نے پنجاب کے دیہات کو خصوصاً اپنے افسانے کا بنیادی موضوع بنا کر پیش کیا۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شہری ماحول کی عکاسی نہ کی ہو۔بلونت سنگھ نے ہندو مسلم، سکھ، امیر، غریب، بچے، بوڑھے، مرد، عورت، خواندہ، ناخواندہ، کسان، فوجی، کلرک، ڈاکو، کمزور، طاقتور، ظالم و جابر، سیاست دان، سرمایہ دار، زمیندار، بھوک، جنس، دیہات، درمیانہ اور متوسط طبقہ، آزادی، حق پرستی، چوری، عشق و محبت، نفسیات، رومانیت وغیرہ سب کو اپنے افسانوں میں گفتگو کا موضوع بنایا ہے۔ان کے افسانوں میں قصبوں کی فضا اور مٹی کی بو باس تو ہے ہی، لیکن فقط کھیت کھلیان یا سرسوں کا پھول ہی نہیں، طور طریقے، رہن سہن، پوجا پاٹھ، شبد کیرتن، میلے ٹھیلے، تیج تہوار، گانا بجانا، رسمیں عقیدے، سبھی کچھ ہے جس سے پوری معاشرت اور ثقافت عبارت ہے۔

بلونت سنگھ کے افسانوں میں منظر نگاری، جذبات نگاری، واقعات نگاری، کردار نگاری، مکالمہ

نگاری اور حقیقت نگاری وغیرہ عروج پر نظر آتی ہے۔ان کے اکثر افسانے طربیہ انجام پر ختم ہوتے ہیں۔ان کے یہاں افسانوں میں معنوی پہلو، فکری عنصر، تخلیقی ہیجان، ادب اور آرٹ کو برتنے کا فنکارانہ حسن، جدت اور ندرت، شگفتگی اور تنوع بھی پائی جاتی ہے۔بیدی نے تقسیم سے چند برس پہلے بلونت سنگھ کے پہلے افسانوی مجموعے پر لکھا تھا کہ ''بلونت سنگھ اپنے موضوع میں تنوع، تحریر میں شگفتگی اور ہر لحظ ایک ایسا نیا پہلو پیش کرتے ہیں کہ پڑھ کر ہماری جمالیاتی حِس کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔'' بیدی صاحب کی رائے ہر اعتبار سے صحیح ثابت ہوئی۔غرض کہ بلونت سنگھ کے افسانوں کو ہر اعتبار اور ہر نوعیت سے شرفِ قبولیت کا درجہ حاصل ہے۔

کتابیات

۱) نیا افسانہ، وقار عظیم، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۳ء

۲) بلونت سنگھ کے بہترین افسانے، گاپی چند نارنگ، ساہتیہ اکاڈمی، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء

۳) آزادی کے بعد اردو افسانہ: ایک انتخاب (جلد اول) مرتبہ: گوپی چند نارنگ، ارتضیٰ کریم، اسلم جمشید پوری، این۔سی۔پی۔یو۔ایل، نومبر ۲۰۰۳ء

۴) بلونت سنگھ: فن اور شخصیت، مُمتاز آرا، تخلیق کا پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء

۵) اردو افسانے کی حمایت میں، شمس الرحمٰن فاروقی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء

۶) کلیات بلونت سنگھ: جلد اول، مرتبہ: جمیل اختر، این۔سی۔پی۔ایل، ۲۰۰۹ء

رسائل

۱) بلونت سنگھ نمبر: ماہنامہ آجکل جلد ۵۳، شمارہ ۶، جنوری ۱۹۹۵ء

◀◀ ● ▶▶

P-98, 4th floor, lane-2,batla house ,jamia nagar, oakhla, new delhi-110025.

نام کتاب : مضامین انور انصاری ترتیب و تقدیم : محمد فرحان دیوان صفحات : ۱۲۸ قیمت : ۱۵۰/روپے ملنے کا پتہ : ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس، دہلی		نام کتاب: اضطراب (افسانے) مصنفہ : ڈاکٹر افشاں ملک صفحات : ۱۷۸ قیمت : ۳۰۰/روپے ملنے کا پتہ: ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس، دہلی

● قیصر نذیر خاور

سازِ زندگی

اُس جیل میں کوٹھی لگے، قدیر کو یہ دسواں مہینہ اور نواں دن تھا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا جس کا اندازہ اس نے اپنی کال کوٹھری کے مُنے سے روشندان میں آتی، گنتی کی ان چند کرنوں سے لگایا۔ وہ بس طلوع آفتاب کے وقت ہی اس کی کوٹھری میں گھڑی دو گھڑی کے لئے در آتی تھیں اور ننگی دیواروں اور فرش پر رینگتی پھر سے تاریکی میں گم ہو جاتی تھیں اور اسے ان کو دیکھنے کے لئے اگلے چوبیس گھنٹے کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ جیل کے اس حصے، جس میں وہ قیدی کوٹھریوں میں بند تھے جنہیں موت کی سزا ہو چکی تھی اور وہ اپنی پھانسی کے منتظر اپنے شب و روز ایک ایسی تنہائی میں گزارتے تھے کہ ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے بھی وہ تنہا تھے، کا وارڈن اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے قدیر کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھمایا۔ قدیر نے اس پر لکھی عبارت کو پڑھنا چاہا لیکن نیم تاریکی اور اپنی دن بدن کمزور ہوتی بینائی کی بنا پر وہ اسے پڑھ نہ سکا۔ وارڈن نے اس کی مشکل کو سمجھتے ہوئے اسے بتایا کہ اس کی طرف سے موت کی سزا کے خلاف اس کی آخری اپیل بھی نامنظور کر دی گئی ہے اور جیسے ہی اس کو پھانسی دیئے جانے کے انتظامات بارے حکم موصول ہوا اس سے اگلی صبح اسے تختہ دار پر لٹکا دیا جائے گا۔

''یہ حکم کب موصول ہوگا؟'' قدیر نے وارڈن کی بات سن کر پوچھا۔

''کسی وقت بھی، شاید کل ہی!'' وارڈن نے جواب دیا، ''اب تم ہمارے لئے ایک ایسے مہمان ہو جس کو کسی وقت بھی رخصت جا سکتا ہے۔ مجھے بتاؤ میں تمہارے لئے کچھ کر سکتا ہوں؟''

''کیا تم مجھ سے میری آخری خواہش پوچھ رہے ہو؟'' قدیر نے اس کے دھندلے جُثے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں وہ تو جیلر صاحب تم سے خود پوچھیں گے اور اسے قلم بند کراتے ہوئے اس کو پورا کریں گے، وہ بھی اگر ان کے بس میں ہوا تو!'' وارڈن بولا، ''یہ تو میں ایسے ہی اپنی طرف سے تم سے پوچھ رہا تھا۔''

وارڈن ایک نرم دل کا مالک انسان تھا اور جیل کے دوسرے 'بند و بستیوں' کے برعکس قیدیوں سے نسبتاً بہتر سلوک روا رکھتا تھا، خاص طور پر جن کو کوٹھی لگ چکی ہو۔

''میں کچھ دیر اس دریا کے بہتے پانی کا نظارہ کرنا چاہتا ہوں جو کہیں نزدیک ہی بہتا ہے۔'' قدیر نے کہا۔

''لیکن یہ تو ناممکن ہے کہ میں تمہیں جیل سے باہر لے کر جا سکوں۔'' وارڈن نے اپنی معذوری ظاہر کی۔

''میں یہ تو نہیں کہہ رہا کہ آپ مجھے جیل سے باہر لے کر جاؤ۔'' قدیر نے سکون سے جواب دیا۔ ''میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ بہتے پانیوں کو جی بھر کے دیکھ لوں جسے میں نے پچھلے نو سالوں سے نہیں دیکھا۔ موت کی سزا ہونے کے بعد جب سے مجھے اس جیل میں لایا گیا ہے، میں ہر رات، جب ہر طرف ہو کا عالم ہوتا ہے، بہتے پانیوں کی آواز سنتا ہوں اور ہر آنے والی رات میری، پانی کی لہروں اور اس کی چھلوں کو دیکھنے کی خواہش میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیا دریا جیل کے بہت قریب سے گزرتا ہے؟''

''ہاں!'' وارڈن نے روشندان والی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''دریا اس دیوار کے پرلی طرف جنگلی جھاڑیوں کے ساتھ سے گزرتا ہے۔''

''تو پھر یہ تو آسان ہے، آپ مجھے کچھ دیر کے لئے اس بیرک کی چھت پر لے جاؤ۔ میں وہیں سے دریا کو دیکھ کر اپنی آرزو پوری کر لوں گا۔'' قدیر نے لجاجت سے کہا۔

''میں ایسا کرنے سے بھی قاصر ہوں۔ کوٹھی لگے قیدیوں کو یوں چھت پر لے جانے کی بھی مناہی ہے۔ وہ کود کر بھاگنے یا 'آپ ہتھیا' کرنے کی کوشش بھی تو کر سکتے ہیں۔'' وارڈن نے ایک بار پھر معذوری کا اظہار کیا، وہ جانے کے لئے مڑا تو قدیر بولا:

''میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں نے ایسا کرنا ہوتا تو قتل کرنے کے بعد میں خود کو پولیس کے حوالے نہ کرتا۔ پولیس کے سامنے میرا پہلا اقبالی بیان ہی عدالتوں کی آخری کاروائی تک ایک ہی رہا ہے، نہ ایک لفظ زیادہ، نہ ایک لفظ کم۔ بہرحال میں آپ کی مجبوری کو بھی سمجھتا ہوں۔''

وارڈن نے گردن گھما کر، بنا کچھ بولے، قدیر کو نظر بھر کر دیکھا۔ اسے قدیر کی بات میں سچائی کی پختگی نظر آئی۔ اس جیل میں گزرے پچھلے دس ماہ کے دوران قدیر کا بطور قیدی اچھا رویہ بھی اس کے ذہن میں گھوم گیا۔ کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔

''میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن کوشش کروں گا کہ کسی طرح تمہاری یہ آرزو پوری کر سکوں۔ ہاں اگر میں ایسا نہ کر سکا تو تم اسے اپنی آخری خواہش کے طور پر بھی تو پورا کروا سکتے ہو!'' یہ کہہ کر اس نے کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور جب وہ باہر نکل کر قفل لگا رہا تھا تو اس نے سنا۔

قدیر کہہ رہا تھا، ''میری آخری خواہش اس سے الگ اور اہم ہے۔ بہتے پانیوں کو دیکھنے کی خواہش نہ بھی پوری ہو تو خیر ہے۔ ویسے مجھے امید ہے کہ آپ میری آرزو ضرور پوری کرو گے۔''

قدیر نے اس دیوار پر جہاں وہ چکنی مٹی کے ڈھیلے سے گنتی لکھ کر دنوں اور مہینوں کا حساب رکھتا تھا، ایک دن کا اور اضافہ کیا اور اس پر' کاٹے' کا نشان بنا دیا۔

رات کے سناٹے میں بہتے پانیوں کی آواز اور چند لمحوں کے لئے در آتی سورج کی کرنیں تو پہلے ہی اس کی ساتھی تھیں اب ان میں امید کی یہ کرن بھی شامل ہوگئی کہ شاید وارڈن اس کی آرزو پوری کر دے۔

اسے زیادہ دن انتظار نہ کرنا پڑا۔ تیسرے روز ہی سہ پہر کے بعد جب دن کی سفیدی میں رات کی سیاہی نے اپنا گھول شروع کیا تو قدیر نے کوٹھری کا قفل کھلنے کی آواز سنی تو چوکنا ہوا۔ شاید یہ رات میرے جیون کی آخری رات ہے، اس نے سوچا، آنے والا غالباً یہی خبر دینے آیا ہے۔ دروازہ کھلا تو وارڈن سامنے تھا۔

''چلو جلدی کرو، اٹھو، میں تمہیں چھت پر لے جاتا ہوں۔ لیکن وعدہ کرو کہ تم کودنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ بہتے دریا کو دیکھنے کے لئے تمہارے پاس کچھ ہی منٹ ہوں گے۔'' وارڈن نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا'' مجھے مغرب کی اذان ہونے سے پہلے، تمہیں اس کوٹھڑی میں دوبارہ مقفل کرنا ہے۔'' وارڈن نے بیڑیوں میں جکڑے قدیر کو سہارا دیا، اسے ہتھکڑی لگائی، اس کی زنجیر اپنی پیٹی سے منسلک کی اور اسے لئے باہر نکل گیا۔

چھت پر پہنچ کر اسے قدیر کو اس طرف لے جانے کی ضرورت پیش نہ آئی جس طرف دریا بہتا تھا۔ قدیر کے قدم بہتے پانیوں کی مانوس آواز کی طرف خود بخود بڑھ رہے تھے۔ بنیرے کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا۔ سامنے اباسین کا پانی اسی سکون سے بہہ رہا تھا جو اس وقت فضا پر بھی طاری تھا۔ وارڈن اس سے چند قدم پیچھے مضبوطی سے زنجیر تھامے کھڑا تھا۔

قدیر کو بہتے دریا میں پانی کے کئی رنگ نظر آنے لگے جن میں ایک رنگ اس کی اپنی زندگی کا بھی تھا..... اس نے اپنے ایک ہمسائے کو اس وقت قتل کر دیا تھا جب اِس ہمسائے نے اُس کی بیوی کو بدکردار کہتے ہوئے اس کی نِندا کی تھی۔ اسے تو مر کر بھی سمجھ نہ آئی ہوگی کہ اس کی بیوی اور وہ الگ کیوں ہوئے تھے۔ قتل کے وقوعے سے تین سال پہلے اس نے اپنی بیوی کو اس بنیاد پر خود سے الگ کر دیا تھا کہ زرینہ نے اس سے کی شادی پر ندامت محسوس کرنا شروع کر دی تھی اور اسے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ اس نے اپنے والدین کی خواہش کے خلاف چالیس سال پہلے قدیر سے شادی کر کے غلط قدم اٹھایا تھا اور قدیر کی اشتراکی سوچ، جس پر اس وقت وہ بھی یقین رکھتی تھی، غلط تھی۔ وہ دھیرے دھیرے اور غیر محسوس طریقے سے مذہب کی طرف رجوع ہوتی گئی تھی۔ قدیر کو اس بات کا پہلا واضح احساس اس وقت ہوا تھا جب زرینہ نے یہ کہہ کر اپنا کمرہ اور بستر الگ کر لیا تھا کہ وہ ایک دہریئے کے ساتھ ایک ہی بستر پر نہیں سو سکتی۔

بہتے پانی نے جب ایک گرے درخت کے تنے سے ٹکرا کر ایک چھل پیدا کی تو اسے یاد آیا کہ انہوں نے

شادی کے بعد سے ہی برابری کی بنیاد پر گھر چلایا تھا۔ اس نے گھر کے کاموں میں زرینہ کا ساتھ دیا تھا جبکہ وہ بھی نوکری کر کے معاشی طور پر گھر چلانے میں اس کی ہمراہی رہی تھی اور اپنے تینوں بچوں کو ملک کے اچھے تعلیمی اداروں میں اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی جو بعد ازاں سب کے سب اعلیٰ روزگار پر لگے ہوئے تھے۔ اسے تب یہ بھی یاد آیا کہ یہ ان کی بڑی بیٹی کے نکاح کا دن تھا۔ قدیر نے لڑکے والوں کے ساتھ معاملات طے ہونے کے بعد نکاح کے سرکاری فارم ٹائپ کروائے تھے جن میں ملک کے عائلی قوانین کے مطابق اس شق کو بھی اس طرح پر کروایا تھا جس سے بیٹی کو طلاق لینے کا حق اسی طرح حاصل ہو سکے جس طرح مرد کو حاصل ہوتا ہے۔ اس شق کو اس طرح سے تحریر کروانے پر زرینہ ہی تھی جس نے اسے غیر شرعی اور غیر اسلامی قرار دے کر اس کی سب سے زیادہ مخالفت کی تھی حالانکہ لڑکے اور اس کے گھر والوں کو یہ حق تفویض کرنے میں کوئی اعتراض نہ تھا۔ ایسا اس وقت بھی ہوا تھا جب ان کی دوسری بیٹی بیاہی گئی تھی۔

بہتے پانیوں کے ساتھ اور بھی بہت سے ایسے ہی واقعات اس کی نظروں کے سامنے سے پھسلتے چلے گئے جو بالآخر اس وقت ختم ہوئے جب قدیر کے لئے زرینہ کو ایک ہی چھت تلے برداشت کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ ان کا بیٹا اپنی ماں کو لے کر علیحدہ ہو گیا تھا اور قدیر تنہا رہ گیا تھا۔

قدیر اباسین کے پانیوں میں اور بہت کچھ بھی تلاشنا چاہتا تھا لیکن اس کے ذہنی تسلسل کو وارڈن کی آواز نے توڑ دیا۔

''چلو، اب واپس جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ مغرب کی اذان کسی بھی لمحے ہوا چاہتی ہے اور اس سے پہلے تمہارا کوٹھری میں ہونا ضروری ہے۔''

ساتھ ہی اسے اپنے اور وارڈن کے درمیان بندھی زنجیر میں تناؤ بھی محسوس ہوا جو اسے پیچھے کھینچ رہی تھی۔

کوٹھری میں پہنچ کر قدیر نے بہتے پانیوں کا نظارہ سامنے پھیلائے رکھا اور اپنی زندگی کے دھارے کے دیگر واقعات کو یاد کرتا رہا جن میں اس کے بچوں کا ماں کی طرح مذہبی ہونا، بنا کسی معاشی و منطقی جواز کے بدیس جا بسنا اور اپنی دھرتی ماں کی خدمت کرنے کی بجائے اس سے کٹ جانا بھی شامل تھا۔ اس نے انہیں بھی اسی طرح خود سے الگ کر دیا تھا جس طرح زرینہ کو خیر باد کہا تھا۔ اس کی بڑی بیٹی جو ایک نامی وکیل بن چکی تھی اور اس کے مقدمے کی پیروی کرنا چاہتی تھی وطن آئی بھی لیکن قدیر نے نہ صرف اُس کی اس پیروی کو رد کیا بلکہ اس سے ملاقات بھی نہ کی۔ اس کے مقدمے کی تمام کاروائی سرکار کی طرف سے مقرر کردہ وکیل نے ہی بھگتائی تھی۔

پھانسی سے ایک روز قبل وارڈن کے ہمراہ جیل پولیس کے دو اہلکار اس کی کوٹھری میں آئے اور اسے ساتھ لئے جیلر کے کمرے میں گئے۔ جیلر نے اسے بتایا کہ یہ اس کی زندگی کا آخری دن ہے۔ اگلے روز پو پھٹنے پر اسے پھانسی دے دی جائے گی اور یہ کہ وہ اپنی آخری خواہش بیان کرے تا کہ اسے پورا کیا جا سکے۔

قدیر نے جیلر سے استدعا کی کہ اس کی ہتھکڑی کھول دی جائے اور اسے کاغذ اور قلم مہیا کیا جائے تا کہ وہ اپنی آخری خواہش تحریر کر سکے۔ جیلر نے اس کی استدعا قبول نہ کی اور بولا۔

''تم بولو، میرا محرر اسے لکھ لے گا اور تم سے انگوٹھا و دستخط کروا لے گا۔''

اس نے جو لکھوایا وہ یہ تھا۔

''میں ایک اشتراکی ہوں، کسی مذہب کا پیروکار نہیں ہوں اور نہ ہی خدا کو مانتا ہوں۔ میری آخری خواہش ہے کہ میرے پاس کسی مولوی، پادری یا مذہبی نمائندے کو نہ بھیجا جائے اور نہ ہی ایسا کوئی مذہبی نمائندہ اس وقت میرا ہمراہی ہو جب مجھے پھانسی کے لئے لے جایا جائے۔

میرے 'کلبوت' کو نہ تو کسی کے حوالے کیا جائے اور نہ ہی کسی مذہبی رسم کے ساتھ جوڑا جائے اور اسے اس وقت تک نذرِ آتش کیا جائے جب تک یہ مکمل طور پر سرمئی راکھ میں تبدیل نہ ہو جائے۔

میرے کلبوت کی اس راکھ کو لاہور کے نواح میں واقع سائفن کے اس مقام پر بہایا جائے جہاں سے پانی 'بی آر بی' نہر میں داخل ہوتا ہے تا کہ یہ کھیتوں میں جا کر میرے 'جنم بھوم' کا حصہ بن سکے۔''

محرر نے یہ سب لکھتے ہوئے کئی بار اس کی طرف اچنبھے سے دیکھا اور بجائے اس سے دستخط کروانے اور انگوٹھا لگوانے کے لکھا بیان جیلر کے سامنے رکھ دیا۔ جیلر، وارڈن اور کمرے میں موجود دیگر اہل کار بھی اُس کے اِس بیان پر حیران تھے۔ جیلر نے وارڈن، جو یہ سوچ رہا تھا کہ کوئی بندہ ایسے کیسے خدا کا منکر ہو سکتا ہے اور خود کو دفن کروانے کی بجائے جلوانے کی خواہش کیونکر کر سکتا ہے، کو اشارہ کیا کہ وہ قدیر کو واپس لے جائے۔

قدیر کو کوٹھری میں پہنچے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ جیل کا ڈاکٹر وارڈن کے ہمراہ اندر داخل ہوا اور اس کا طبی معائنہ کر کے واپس چلا گیا۔ ابھی رات بھیگی نہ تھی کہ اس کی کوٹھری کا قفل پھر کھلا اور وارڈن اندر داخل ہوا۔

''تمہیں صبح پھانسی نہیں دی جا رہی، جیلر صاحب نے اس کی معطّلی کا حکم نامہ حاصل کر لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق تمہارا ذہنی توازن درست نہیں ہے، پہلے اسے درست کرنا ہوگا۔'' وارڈن نے کہا۔

اگلی صبح ہتھکڑی اور بیڑیوں میں جکڑے قدیر کو جیل کی گاڑی میں بٹھایا گیا اور کڑے پہرے میں ذہنی امراض کے ہسپتال کی طرف روانہ کر دیا گیا جہاں سازِ زندگی کی ایک نئی 'دھن' اس کی منتظر تھی۔

◂◂ ● ▸▸

491-B Faisal Town
Lohore 54700 Pakistan
03004241601

● سبین علی

ان ٹیوشن

درد کی لہریں نیلی ہوتی ہیں، سرخ یا پیلی۔ کیا ڈاکٹر پیشینٹ کمیونیکشن میں درد کی شدت کا رنگوں کے ذریعے اظہار کرنا ڈاکٹرز کی مدد کر سکتا ہے۔

دو ڈاکٹر آپس میں بحث کرتے ہوئے کوریڈور سے گزر رہے تھے۔

ان کی بات سن کر میں نے ایک لمحے کے لیے غور کیا اور اپنا رُکا ہوا قلم پھر سے اٹھا لیا۔ کاغذ پر حروف خود بخود پھسلنے لگے۔

درد کی لہریں نیلی ہوتی ہیں یا سرخ؟ لیکن ہمیشہ نہیں، درد کی کئی لہریں ایچ یا بی پینسل، چارکول اور قلم سے بھی جنم لے لیتی ہیں جن میں نہ سرخ رنگ ہوتا ہے نہ نیلا اور نہ ہی پیلاہٹ مگر تاریکی کاغذ پر اپنا بسیرا کرنے سے باز نہیں آتی۔

کچھ ترچھے مڑے پینسل اسکیچ کوڑے دان سے باہر جھانک رہے تھے۔ اس اسکیچ میں موجود عورت کی آنکھیں مجھے خود پر گھورتی محسوس ہو رہی تھیں۔ کچھ دیر قبل ہی کوڑے دان میں نئی پلاسٹک کی تھیلیاں لگائی گئی تھیں اور ان کاغذات کے علاوہ وہاں کچھ نہ تھا۔ ہسپتال کا کچرا عموماً تین الگ طرز کے ڈبوں میں ڈالا جاتا ہے۔ تا کہ اسے مناسب طور پر ٹھکانے لگایا جا سکے۔ وہ نیلے رنگ کی تھیلی والی عام کچرے کی ٹوکری تھی جو وارڈ میں موجود تھی۔ میں نے خاموشی سے وہ خاکے باہر نکالے اور اپنی میز پر پھیلا دیے۔ گائنی وارڈ میں اُس رات زیادہ مریضائیں نہ تھیں۔ چند ڈیلیوریز سی سیکشن کے ساتھ دن کے وقت ہی سینئر ڈاکٹر نے نپٹا دی تھیں۔

جب ان خاکوں کا جائزہ لینے لگی تو ساتھ ہی اسی دن کی تاریخ کے ساتھ ڈسچارج شیٹ، نسخے کی پرچی اور لیبارٹری رپورٹ بھی تھی۔ مجھے اس مریضہ کی بے پروائی پر سخت غصہ آیا۔ بھلا ڈی این سی کے بعد فارمیسی سے دوائیں لینے کی بجائے نسخے کو یوں کچرے میں پھینکنا تھا؟ اگر کوئی پیچیدگی پیدا ہو جائے تو یہی مریض ڈاکٹر کے سر چڑھ دوڑتے ہیں۔

لیکن وہ اسکیچ جو ہسپتال ڈسچارج شیٹ کے ساتھ لپٹے ہوئے تھے، عام سے خاکے نہ تھے۔ بہت

مہارت سے بنے ہر اسکیچ میں ایک ایسی عورت کا سراپا نمایاں تھا جس کی آنکھوں میں درد کی لہریں بہت واضح تھیں۔مختلف زاویوں سے بنائے گئے خاکوں میں دوسری اہم چیز وہ خنجر تھا جو ہر خاکے میں عورت کے پیٹ میں گھونپا گیا تھا۔وہ خاکے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے درد اور خوف کی ملی جلی سرد رو میری ریڑھ کی ہڈی سے ہوتی ہوئی پورے جسم میں سنسناہٹ پیدا کرتی گزر گئی۔

سسٹر عندلیب یہ پیشنٹ کون تھی جس کی آج ڈی این سی ہوئی؟

میں نے وارڈ میں موجود نرس سے دریافت کیا۔

میڈیم وہ ایک ینگ اور خوب صورت لڑکی تھی جس کے ساتھ اس کے ان لاز بھی تھے۔یہ ابارشن انہوں نے خود کروایا ہے۔

لیکن یہاں ڈسچارج شیٹ میں تو مسڈ ابارشن درج کیا گیا ہے۔ایسے ابارشن کرنا اور رپورٹ میں کچھ اور لکھ دینا درست نہیں ہے۔میں نے سسٹر کو گھورتے ہوئے کہا۔

آپ بھی بہت بھولی ہیں..... پرائیویٹ ہسپتال میں بہت کچھ ہوتا ہے۔جو مینجمنٹ کی پالیسی ہے آپ کو اسی کے مطابق چلنا چاہیے میڈم۔

نرس نے مسکرا کر جواب دیا۔لیکن میں اس کی مسکراہٹ نظر انداز کر کے پھر سے ان خاکوں میں کھو چکی تھی۔

اگلی ہی رات نائٹ ڈیوٹی کے دوران بائیس تئیس سال کی ایک خوبصورت لڑکی اپنی ماں کے ساتھ درد سے تڑپتی گائنی وارڈ میں آئی۔اس کا ہاتھ پیٹ کے نچلے حصے پر دھرا تھا ہونٹ نیلے ہو رہے تھے اور رنگت میں پیلاہٹ گھلی ہوئی تھی۔شدت درد سے وہ کھڑی بھی نہ ہو پا رہی تھی۔

سسٹر نے آ کر چپکے سے مجھے کہا، یہ وہی لڑکی ہے جس کی کل ڈین این سی کی گئی ہے۔

اسالہ ادھر آ کر بیڈ پر لیٹ جاؤ۔میں نے چارٹ پر اس کا نام پڑھتے ہوئے نرمی سے کہا۔وہ مریضہ نقاہت زدہ چال چلتی بیڈ پر آ کر لیٹ گئی، اس کے چہرے پر شدید درد کے تاثرات تھے۔میں نے ہاتھوں پر گلوز چڑھاتے ہوئے کہا۔

ہاں اب بتاؤ اسالہ کہاں تکلیف ہے؟

اسالہ نے سر تکیے میں دبا لیا تھا مگر دوسرے کمرے سے مام ڈیڈ کے جھگڑے کی آوازیں اتنی بلند تھی کہ کانوں میں پگھلے سیسے کی مانند اتر رہی تھیں۔شور شرابا ختم ہونے کے کافی دیر بعد تک بھی اس کے دماغ میں سائیں سائیں ہوتی رہی۔انٹیریر ڈیزائنر نے اس کے کمرے کی ہر دیوار پر الگ الگ رنگ کا پینٹ اور

اسی مطابقت سے فرنیچر کی آرائش کی تھی۔اسے لگ رہا تھا کہ یہ سارے رنگ اس کے اردگرد ایک سپنر کی مانند گھوم رہے ہیں اور ان رنگوں کے دائرے میں مقید اس کا سر بری طرح چکرا رہا ہے۔

اسے سفید رنگ بہت پسند تھا۔اس کا بس چلتا تو اس کے کمرے میں سادہ فرنیچر کے ساتھ سفید پینٹ ہوتا۔مگر اس کی ماں نے کبھی اس کی پسند ناپسند کا خیال نہیں رکھا تھا۔وہ ہمیشہ یہی دیکھتیں کہ کونسا برانڈ ان ہے کون سا ڈیزائنر اچھا ہے۔لوگ ان کے انتخاب اور پسند کی داد دیتے نہ تھکتے۔یہ الگ بات ہے کہ اس کے ماں باپ شاید ہی کبھی کسی بات پر متفق ہوئے ہوں۔اور اس لیے والدین کے جھگڑے ان کے گھر کا معمول تھے مگر وہ کبھی بھی اس معمول کی عادی نہ ہو سکی اور ہر نئی لڑائی پر بری طرح پریشان ہو جاتی۔

گہرے نیلے رنگ کے وال کلاک کی چھوٹی سوئی دو کے ہندسے پر پہنچ چکی تھی۔اگلے دن اس کا اکنامکس کا مڈٹرم ٹیسٹ تھا۔وہ یونی ورسٹی میں اپنے ڈیپارٹمنٹ میں گولڈ میڈل کی دوڑ میں شامل تھی مگر اسے میڈلز اور اعزازات سے کبھی دلچسپی نہ رہی تھی۔دلچسپی تھی تو سفید کاغذ سے جس پر وہ آڑھی ترچھی لکیریں کھینچے بیٹھتی تو خود بخود کوئی شبیہ ابھر آتی۔اُس وقت بھی اسالہ نے اپنی سائیڈ ٹیبل سے ایک چارکول اٹھایا اور اسکولر پیرول پیپر پر سیاہ لکیریں خود بخود اس کی انگلیوں سے پھسلنے لگیں۔

یہ کیفیت بچپن سے اس کے ساتھ پروان چڑھی تھی۔وہ کئی بار غائب دماغی کی سی کیفیت میں پینسل سے کوئی اسکیچ بنانے لگ جاتی پھر جو تصویر اس کے سامنے نمودار ہوتی وہ اس کی سوچ اور ارادے میں اُس طرح موجود نہیں ہوتی تھی۔

جب وہ اس کیفیت سے نکل کر مکمل ہوش وحواس کے ساتھ اپنے ہاتھ کے بنے خاکے دیکھتی تو تکلیف میں مبتلا چہرے، ڈریگن، نامانوس زمینوں کے لینڈ اسکیپ، عجیب وغریب پرندے، خوابناک مناظر اور پھندوں میں الجھے جانوروں کے خاکے خود اس کا اپنا دل دہلا دیتے۔اکثر وبیشتر وہ یہ اسکیچ چھپا دیتی اور کسی کو اپنی ڈرائینگ نہ دکھاتی۔

اس کا بچپن مشرق وسطی میں گزرا تھا۔سائیٹ پر جہاں اس کے والد کو رہائش ملی تھی وہاں قرب و جوار میں کسی پاکستانی خاندان کا گھر نہیں تھا۔انٹرنیشنل اسکول میں تعلیم کے دوران اس کی کوئی سہیلی ہم وطن نہ تھی مختلف قومیتوں کے ساتھ گھلتے ملتے اس کے مزاج پسند اور سوچ میں بہت تنوع آ چکا تھا۔او لیولز کے بعد انہیں پاکستان واپس آنا پڑا کالج میں اس کی ماں نے اسے فائن آرٹس کا مضمون نہیں رکھنے دیا۔اس کی بڑی خواہش تھی کہ کسی اچھے سے آرٹ کالج میں داخلہ لے، پینٹنگ اور کیلی گرافی اس کا پہلا شوق تھے مگر اسے اکنامکس اور فنانس پڑھنے پر لگا دیا گیا۔

اکثر و بیشتر وہ اپنے کمرے تک ہی محدود رہتی۔ ماں باپ کو اپنے جھگڑوں سے فرصت نہیں تھی کہ اس کی کم آمیز طبیعت پر غور و فکر کرتے۔ پاکستان آ کر اس کا چھوٹا بھائی جم، انٹرنیٹ اور کار ریسینگ کے مشاغل میں اپنا بیشتر وقت صرف کرنے لگا تو مزید تنہائی اس کی زندگی میں سائیں سائیں کرنے لگی۔

وہ پنڈولم کی مانند کبھی کان پھاڑ دینے والے شور اور کبھی سمندر کی عمیق کھائیوں جیسے گہرے سکوت کے بیچ میں ڈولتی رہتی۔ اس کی پسند بھی ایسی ہی ہو چکی تھی اسے بیک وقت ہیوی میٹل میوزک اور کلاسیکل غزلیں پسند تھیں۔ پنجابی و سرائیکی صوفی شعراء سے لے کر روسی اور جرمن ادیبوں تک کی تصنیفات سے شغف اس کے دل و دماغ میں ایک الگ جہان بسائے ہوئے تھا۔

ہزار ہا طوفان اپنی گہرائیوں میں سمیٹے وہ سطح سمندر کی مانند پرسکوت تھی مگر سکون کو دوام نہیں اور اس کی ذات کے سکوت میں پھینکا جانے والا بڑا کنکر اس کی منگنی کی خبر تھی۔ جانے کب اس کی ماں نے اس کا رشتہ دیکھا باپ نے لڑکے کی ملازمت، اس کی آمدنی اور خاندان کی سرسری جانچ کروائی اور کب ہاں کر دی گئی۔ ایک مہینے کے اندر ہی منگنی کی بجائے شادی کا غوغا اٹھا اور اسالہ ہکا بکا اپنی زندگی کا فیصلہ ہوتے یوں دیکھتی رہی جیسے اس کا ان سب معاملات سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔

وہ بہت روئی اپنی زندگی کے کسی ایک فیصلے میں وہ خود بھی شامل ہونا چاہتی تھی مگر اس کی ایک نہ سنی گئی۔ اس کی ماں سب کو یہ وضاحت دے کر مطمئن کرتی رہی کہ لڑکیاں اپنی شادی پر مائیکے کی جدائی میں رویا ہی کرتی ہیں۔ اور اسالہ ریشم کے تاروں میں پڑی الجھنوں کو سمیٹے ریشم میں لپٹی نئے گھر سدھار گئی۔

کم سن جوڑا نئے خواب نئی امنگیں، دو جسم تو ملے مگر دو روحیں نہ مل پائیں۔ پسند ناپسند، سوچ، خیالات اور طرز زندگی میں اتنا تفاوت تھا کہ اسالہ کو سمجھ نہ آیا کہ سب معاملات میں توازن کیسے برقرار رکھے۔ اس کے سسرال والدین سے قدرے کم مالی حیثیت رکھتے تھے طرز زندگی میں بھی بہت فرق تھا۔ ان لوگوں کے اسالہ کے مائیکے سے وابستہ کئی مالی مفادات ان کی امیدوں کے مطابق پورے نہ ہوئے تھے۔ اس بات کا قلق بہت جلد ان کے رویوں میں بھی جھلکنے لگا تھا۔

لیکن اندیشوں اور وسوسوں کی زمینوں پر وصل کی بارشیں برسیں اور اسی دوران امید کی ایک ننھی کونپل اس کے رحم سے کیا پھوٹی کہ اسالہ کی بے رنگ زندگی میں سبزہ لہلانے لگا اور بھید بھری خاموشیوں کے باوجود دھیما سا تبسم اس کے ہونٹوں پر رقصاں رہنے لگا۔

اس ننھی کونپل کو تصور میں لا کر اس نے فیصلہ کیا کہ لاکھ پتھریلی راہیں قدموں تلے بچھی ہوں وہ اپنے والدین کی مانند جھگڑالو نہیں بلکہ اچھی ماں اور اچھی بیوی بنے گی۔ زن و شو کے بیچ محبت و ذہنی ہم آہنگی

کا پودا دھیرے دھیرے پنپتا ہے۔ اسالہ کو امید تھی کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی کو کامیاب بنا کر ہم آہنگی کے پودے کو اپنی اولاد کے لیے وہ شجر سایہ دار بنا سکے گی جو اسے میسر نہ آ سکا تھا۔ شادی کے دو مہینے بعد اس کا شوہر اپنی ملازمت پر واپس دبئی چلا گیا اور اسالہ کو وہاں بلوا لینے کی تیاری کرنے لگا۔ جب اسے سسرال میں کسی بات پر رنج پہنچتا وہ اپنی ماں کی طرح احتجاج کرنے یا چیخنے چلانے کی بجائے خاموشی سے اپنے کمرے تک محدود ہو جاتی۔

''بابر تمہیں ہر صورت اسالہ کو طلاق دینا ہوگی۔'' اسالہ کا جیٹھ اس کے شوہر کو فون پر سختی سے کہہ رہا تھا۔

''مگر بھائی آخر کیوں؟ کیا برائی ہے اسالہ میں؟'' بابر نے سوال کیا۔

''وہ نفسیاتی مریض ہمارے خاندان کا حصہ نہیں بن سکتی۔''

''مگر بھائی میں تو اسے بالکل ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر آیا تھا وہ نفسیاتی مریض کیسے ہوگئی؟''

پھر طویل بحث کے بعد وہ زچ ہوتے ہوئے کہنے لگا۔

''اچھا اگر نفسیاتی مریض ہے بھی تو اتنی سی بات پر کیوں طلاق دوں اسے؟ جبکہ وہ پریگننیٹ بھی ہے۔ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔''

بابر حیران و پریشان تھا کہ ان چار مہینوں میں ایسا کیا ماجرا ہو گیا جو سارا خاندان اسالہ کے اتنا شدید مخالف ہو چکا ہے۔

بھائی بہنوں کے ساتھ چند دنوں تک بحث تکرار جاری رہی پھر ایک دن اس کے باپ کا فون آیا۔

''دیکھو بابر اسالہ کو طلاق دے دو ہم اسے نہیں رکھ سکتے۔ اس کا باپ بہت چالاک ہے۔ اس کی ماں دھوکے باز ہے۔ بہت سی باتیں ہم سے چھپائی گئیں کئی وعدے پورے نہیں کیے اس کے باپ نے۔''

''مگر بابا اس بات پر میں اسالہ کو طلاق کیوں دوں؟''

بابر حیرت سے پوچھنے لگا۔

''اس لڑکی کو شیزوفرینیا ہے۔ اس کی ماں نے یہ بات ہم سے چھپائی تھی۔''

یہ جواب سن کر بابر ہکا بکا رہ گیا۔

''مگر بابا اس شیزوفرینیا کا مجھے دو مہینوں میں پتا کیوں نہیں چلا؟''

''وہ اس لیے کہ اس کی ماں اسے دوائی کھلا دیتی تھی۔ تمہاری بڑی بھاوج نے اس پر سختی کی مائیکے جانے سے روکا۔ جب اسے بروقت دوا نہ مل سکی تو اس پر شیزوفرینیا کے دورے پڑنے لگے۔ وہ بہت خطرناک عورت ہے۔ تم جانتے ہو تمہاری بڑی بھابھی کئی برسوں بعد امید سے ہیں۔ اس بدبخت اسالہ نے

ایک حاملہ عورت کے خاکے بنا کر اس کے پیٹ میں خنجر گھونپے ہیں۔ وہ خاکے تمہاری بھابی کے ہاتھ لگ گئے۔ تمہارا بھائی سخت غصے میں ہے۔ وہ پاگل نفسیاتی مریضہ ہر وقت اپنے کمرے میں بند رہنے والی، تمہاری بھابھی کے بچے کی جان لینا چاہتی ہے۔ اسے فوراً طلاق بھجواؤ۔''

باپ کا حکم سن کر بابر بھی الجھ گیا۔ پھر پوچھنے لگا:

''بابا میرے بچے کا کیا ہوگا۔ اسالہ بھی تو ماں بننے والی ہے۔ طلاق کے بعد بچے کی کسٹڈی کے مسائل پیدا ہوں گے۔''

''تم فکر نہ کرو اس کا بندوبست ہم کرلیں گے۔'' اس کے باپ نے جواب دیا۔

اور بابر پورے خاندان کے دباؤ کے سامنے ہار گیا۔

اسالہ کو بتائے بغیر چیک اپ کے بہانے ہسپتال لایا گیا اور اس کا حمل ضائع کروا دیا گیا۔

ہسپتال سے ہی اس کی ماں کو فون کیا گیا کہ آ کر اپنی بیٹی کو لے جاؤ اسے بابر نے طلاق بھجوادی ہے۔

مجھے شاید یہاں یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں کہ ان ہسپتالوں میں کیا کچھ ہوسکتا ہے۔

ہسپتال کے کوریڈور سے ابھرنے والی ڈاکٹروں کی آوازیں کب سے ختم ہوچکی تھیں مگر درد کے رنگوں کا ذکر مجھے پھر سے لکھنے کے گہرے موڈ میں لے گیا تھا اور اس معصوم سی لڑکی کا چہرہ بار بار میرے تصورات میں آتا رہا۔

اسالہ بعد میں بھی فالواپ کے لیے میرے پاس کلینک آتی رہی۔ وہ بہت معصوم سی خوش لباس لڑکی تھی۔ اس دوران اس نے خود پر بیتی کہانی کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں میرے گوش گزار کردی تھی۔

جب وہ کسی پرانے واقعے کا ذکر کرتی تو اس کی آنکھوں میں درد کی لہریں اُسی طرح نمایاں ہو جاتیں جیسے خاکوں میں موجود عورت کی تھیں۔

میں پروفیشنل گائینا کولوجسٹ ہونے کے باوجود لکھنے سے بھی شغف رکھتی ہوں اور خوب سمجھتی ہوں کہ کسی آرٹسٹ، مصنف یا شاعر کا تعلیمی پس منظر یا پیشہ کچھ بھی ہو اگر فن اس کو فطرت نے ودیعت کیا ہے تو وہ تخلیقی وفور سے منہ نہیں موڑ پاتا۔ بے شک وہ اپنا فن اور تخلیقات دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہی کیوں نہ رہنے دے۔ لیکن تخلیق کرنا نہیں چھوڑتا۔ کئی بار یہ فن پارے ایک خاص ٹرانس یا آمد کی کیفیت میں جا کر تخلیق ہوتے ہیں۔ کیا یہ محض فنکاروں کے تجربات و مشاہدات ہوتے ہیں یا آمد کی کیفیت کسی اور شے کی بھی عکاس ہوتی ہے؟

مگر میرے لیے اس سوال کا جواب ہمیشہ تشنہ ہی رہا۔

میں بہت دنوں تک سوچتی رہی کہ آخر اسالہ کے ہاتھوں سے بنے خاکے کیا تھے؟

خنجر تو اسی کے رحم میں گھونپا گیا تھا۔ کیا اسالہ کو کہیں سے ادراک ہوا تھا کہ اس کے رحم میں ہی اس کے بچے کو مار دیا جائے گا۔ مگر اسے تو یہ بھی پتا نہ چلا کہ کلینک معائنے کے لیے نہیں بلکہ کھوکھا جاڑنے کے لیے لائی گئی ہے۔

پھر اس کے ہاتھ سے وہ خاکے کیونکر بنے جن کی پاداش میں اس کی جیٹھانی نے اسے طلاق دلوا کر ہی چھوڑی اور وہ اسکیچ ہسپتال کے کاغذات کے ساتھ کچرے میں پھینک گئی۔

کیا تخلیق فطرت کا کوئی کوڈ ورڈ ہے؟

کیا فن وجدان کی کوئی شکل ہے؟

اگر یہ وجدان ہے تو کیا تخلیق اتنی کم تر ہوتی ہے کہ کچرے میں پھینک دی جائے؟

وقت کی گرد میں بھی بڑے بڑے فن پارے دفن ہوجاتے ہیں قصر الاحمر جیسے محل بوسیدہ ہوجاتے ہیں۔ علم و تہذیب اور فن کے گہوارے شہر کھنڈرات کے ڈھیر اور عظیم الشان تہذیبیں کمتر جنگجو اقوام کے گھوڑوں کے ٹاپوں تلے روندی جاتی ہیں۔

آخر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کسی ایک کے لیے بہت اہم تخلیق دوسروں کے لیے محض ردی ہوتی ہے اور انمول انسان کسی دوسرے کے لیے فقط خون کے چند قطرے۔ اولاد کسی کے لیے عمر بھر کی سب سے بڑی تشنہ خواہش اور کسی کے لیے فالتو شئے کی مانند۔ لیکن ان سب کے باوجود فطرت کئی فن پاروں کو وقت کی دست برد سے محفوظ رکھتے ہوئے انہیں قدر دانوں تک بھی پہنچا دیتی ہے۔

سردیوں کی طویل نائٹ شفٹ میں کبھی چند فقرات قلم بند کرنے کے لیے وقت نکال پاتی اور کبھی مریضوں کی مصروفیت میں اسالہ کا چہرہ میرے تصور میں شاکی نظروں کے ساتھ اپنے خاکوں کے تسلسل میں کہانی لکھے جانے کا مطالبہ کرتا رہتا۔ کیا ایک تخلیق کے تسلسل میں دوسری تخلیق کسی اور فنکار سے ممکن ہے۔ اگر ایسا ہے تو آخر کیوں؟ شاید یہ فن پارے بے جان ہوکر بھی کسی نہ کسی سطح پر پیغام رسانی کرتے ہیں۔

اسالہ کو کوئی نفسیاتی مسئلہ تھا یا نہیں اس سے قطع نظر مجھے اس کی دردناک کہانی نے.....نہیں صرف کہانی نہیں..... بلکہ ان خاکوں نے اور اسالہ کی intuition نے اپنا اسیر بنایا ہوا تھا۔

کہانی تقریباً مکمل ہونے کو ہے بس مجھے اس کا اختتامی سرا ہاتھ نہیں آ رہا۔ ٹھہریں ذرا ابھی ایک عورت درد ذہ کے ساتھ ایمرجنسی میں آئی ہے۔

رائٹنگ پیڈ لیبر روم کی میز پر رکھ کر میں نے جلدی سے نیلا گاؤن اور گلوز پہنے۔ مجھے امید تھی نارمل ڈیلیوری ہوگی۔ مگر اس خاتون کو دیکھنے سے قبل ہی انٹر کام پر مجھے ایڈمن آفس میں بلا لیا گیا۔

میں سٹاف نرس کو مریضہ کی فائل پکڑاتے ہوئے جلدی سے ایڈمن آفس پہنچی۔ جہاں ہسپتال کی انتظامیہ نے اپنے مقرر کردہ اہداف حاصل نہ کر سکنے کے باعث مجھے ملازمت سے برطرفی کا نوٹس پکڑا دیا۔ غیر ضروری آپریشن اور غیر قانونی اسقاط پر چند ایک بار میرے دبے دبے احتجاج سامنے آ چکے تھے۔ لیکن بات ملازمت سے برطرفی تک پہنچ جائے گی مجھے یہ اندازہ ہی نہ تھا۔

اس اچانک افتاد پر میں کچھ دلگرفتہ سی اپنا بیگ اور دیگر چیزیں لینے واپس لیبر روم پہنچی۔

وہاں اسٹاف نرس میرے تحریر کردہ صفحات اور کچھ دیگر کاغذات پیلے رنگ کی نشان زدہ کلینکل ویسٹ بن میں پھینک رہی تھی۔ جس میں متعدی بن سکنے والی اشیاء ہی ڈالی جاتی ہیں۔

اوہ نو سسٹر یہ آپ نے کیا کیا؟ اس میں تو میرے اہم کاغذات تھے۔

سوری میڈم مگر ان کاغذات میں کوئی کام کی چیز نہیں تھی۔ میں نے خود چیک کیا تھا، صرف چند ڈرائینگز اور لیڈ پینسل سے لکھی آڑھی ترچھی تحریریں ہی تھیں۔

سسٹر نے بے پروائی سے جواب دیا۔

میں تیزی سے آگے بڑھی کہ اگر پیلی پلاسٹک کی تھیلی صاف ہوئی تو وہ صفحات واپس نکال لوں۔ مگر وہاں سرخ رنگ سے بھرے ٹاولز میرا منہ چڑا رہے تھے۔

درد کی لہریں سرخ بھی ہوتی ہیں؟

کیا تخلیق اتنی کم تر ہوتی ہے کہ کچرے میں پھینک دی جائے۔

اپنے ہی لکھے الفاظ میری آنکھوں کے آگے گھومنے لگے۔

کوڑے دان سے اپنی لکھی کہانی کے صفحات کیسے باہر نکالوں یا اپنی تخلیق کو کچرے میں چھوڑ کر خاموشی سے چلی جاؤں؟ میں اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ اسٹاف نرس نے کڈنی ٹرے میں رکھی ہوئی آنول پیلے رنگ کی نشان زدہ کچرے کی ٹوکری میں ان صفحات کے اوپر ڈال دی۔

◀◀ ● ▶▶

Al-Safa, Dist-Jeddah
Saudi Arabia (U.A.E)
Cell No. 00966564274322

● شمسہ نجم

وہ ایک لمحہ

کہنے کو میری عمر چار سال تھی۔ چھوٹا سا بچہ۔ دنیا کے سرد و گرم سے نا آشنا۔ اس عمر میں تو اتنی عقل بھی نہیں ہوتی کہ ہم اندازہ کر سکیں کہ ہمیں پالنے والے ہمارے ماں باپ کی اتنی بساط بھی ہے کہ ہمیں اچھے طریقے سے پرورش کر سکیں گے یا نہیں۔

اس دن میری ماں سب بہن بھائیوں کو اسکول بھیجنے کے بعد میرا ہاتھ پکڑ کے بازار کی طرف چل دی۔ ہمیں گھر کا کچھ سامان خریدنا تھا اور ماں کو اپنے لیے دوا بھی لینی تھی۔ میری تین بہنیں اور ایک بھائی بہت اچھے اسکولوں میں پڑھ رہے تھے۔ میں بہن بھائیوں میں پانچویں نمبر پہ تھا۔ مجھ سے بس ایک بہن چھوٹی تھی جو صرف دو ماہ کی تھی۔ میری ماں نے میری بہن کو اپنی پشت پر باندھا۔ میرا تعلق جنوبی کوریا (south Korea) سے ہے۔ کوریا میں چھوٹے بچے کو اٹھانے کا یہی رواج ہے۔ بچے کو کمر پر کپڑے کا جھولا بنا کے اس میں ڈال لیتے ہیں اس طرح ماں کے دونوں ہاتھ آزاد ہوتے ہیں دنیاداری کے لیے۔

میں ماں کا ہاتھ پکڑ کر چل رہا تھا۔ دو سو گز کے بعد گلی کا پہلا موڑ تھا۔ وہاں سے ہم دائیں طرف مڑ گئے۔ کونے پر ایک آدمی ٹھیلا لگائے ہوئے بھنے ہوئے کیلے بیچ رہا تھا۔ اس کی ایک خاص میٹھی مہک ہوتی ہے لیکن مجھے ہمیشہ سے یہ مہک پسند نہیں تھی۔ ماں نے میرا دایاں ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ میں نے بائیں ہاتھ کی چاروں انگلیاں ناک پہ رکھ لیں تا کہ مجھے یہ مہک نہ آئے۔ لیکن مہک بہت تیز تھی اور میرے نتھنوں میں گھسی چلی آ رہی تھی۔ ماں کو وہاں پڑوسن مل گئی اور وہ وہیں کھڑے ہو کر پڑوسن سے سلام دعا کرنے لگی۔ بھنے کیلوں کی مہک مجھے پریشان کر رہی تھی۔ اب مجھے خیال آتا ہے لیکن اس وقت مجھے اتنی عقل نہیں تھی اگر شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے ناک بند کرتا تو شاید یہ مہک اتنا پریشان نہ کرتی۔ میں نے ماں کا ہاتھ ہلایا۔ ماں سمجھ گئی اس نے پڑوسن کو خدا حافظ کہا اور ہم آگے چل پڑے۔ دو اور گلیاں پار کرنے کے بعد ہم بازار پہنچ گئے۔ بازار میں چھوٹی موٹی بہت سی دکانیں تھیں۔ ماں نے دوکان سے چینی، ڈبل روٹی اور انڈے خریدے۔ میں نے اچھے بچے کی طرح ماں کی مدد کی اور بارہ انڈوں کا اچھی سی پیکنگ والا ڈبہ ہاتھ میں پکڑ

لیا۔ فٹ پاتھ پر ایک عورت نے بیچنے کے لیے سیب سجائے ہوئے تھے۔ سیب سرخی مائل زرد خوبصورت بڑے بڑے اور رس دار لگ رہے تھے۔ میرا دل چاہا کہ میں سیب کھاؤں۔ میں نے ماں سے کہا۔

''مجھے سیب چاہئے۔''

ماں نے کہا ''چلو آگے چلو جینگ سو (SuJaeng)، بعد میں لے لیں گے ابھی مجھے اور سامان بھی لینا ہے اور اپنی دوا بھی لینی ہے۔''

میں نے کہا ''نہیں مجھے یہ سیب ابھی چاہئے۔'' ماں نے پھر چلنے کو کہا لیکن میں ضدی بچے کی طرح وہیں جم کر کھڑا ہو گیا۔

''نہیں مجھے سیب چاہیئے اگر تم مجھے سیب لے کے نہیں دو گی میں یہ انڈوں کا ڈبہ زمین پہ پھینک کے انڈے توڑ دوں گا۔''

میں نے محسوس کیا میری ماں ایک دم سیدھی ہو کے کھڑی ہو گئی اور میری آنکھوں میں غور سے دیکھنے لگی۔

میں نے پھر کہا۔ ''میں انڈے توڑ دوں گا۔''

میری ماں نے کہا۔ ''اچھا توڑ دو انڈے اگر تم توڑ سکتے ہو۔''

میں نے ڈبہ زور سے زمین پہ پھینک دیا۔ ڈبہ گتے کا تھا۔ سارا ڈبہ گیلا ہو گیا۔ جو اس بات کا ثبوت تھا کہ سارے انڈے ٹوٹ چکے ہیں۔ میری ماں میری آنکھوں میں غور سے دیکھتی رہی۔ اس نے مجھے ایک لفظ نہیں کہا۔ اور پھر اس نے سیب بیچنے والی عورت سے ایک سیب خریدا اور میرے ہاتھ میں دے دیا۔ ماں نے باقی خریداری مکمل کی ساتھ ساتھ انڈے بھی دوبارہ خریدے۔ جب ہم میڈیکل اسٹور کے سامنے سے گزرے تو میں نے ماں سے کہا۔

''ماں تمہاری دوا۔''

ماں نے میری طرف غور سے دیکھا۔ میں نے محسوس کیا میری ماں کی آنکھوں میں پانی تھا لیکن آنسو باہر نہیں آئے اور فوراً ہی وہ آنسو غائب بھی ہو گئے۔ ماں نے ان آنسوؤں کو پی لیا تھا یہ بات مجھے بہت عرصے کے بعد سمجھ میں آئی۔ ماں خاموش رہی۔ ہم نے دوا نہیں لی اور ہم واپس آ گئے۔

پھر تین ماہ بعد میرا داخلہ اسکول میں ہو گیا۔ اور دوسرے بچوں کی طرح روزانہ اسکول جانا میرا بھی معمول ہو گیا۔ میری ماں مجھے اسکول چھوڑتی اور واپس لینے بھی وہی آتی اور ہمیشہ اپنی کمر پہ میری بہن کو اٹھائے ہوئے ہوتی۔ میں ماں کا ہاتھ پکڑ کے ساتھ چلتا تھا۔

میری ماں میرے سب بہن بھائیوں کو اچھے اسکولوں میں پڑھا رہی تھی۔ میرا باپ آرمی میں تھا۔ وہ بہت کم سال میں ایک یا دو بار گھر آتا۔ جنوبی کوریا میں ہر مرد کو کم از کم تین سال تک آرمی جوائن کرنا لازم ہے۔ لیکن میرا باپ ہمیشہ کے لیے اس سے منسلک ہو گیا تھا۔ میری ایک بہن کالج میں اور ایک یونیورسٹی میں تھی۔ باقی بہن بھائی اسکول میں مختلف گریڈز میں تھے۔ ساؤتھ کوریا میں اسکول کے لیے کچھ نہ کچھ فیس بھرنا ہوتی ہے۔ جیسا کہ سارے ترقی پذیر ملکوں کا طریقۂ تعلیم ہے۔ اب تو میں امریکہ میں ہوں یہاں بچوں کی اسکول کی فیس نہیں دینا پڑتی۔ صرف اسی صورت میں فیس دینا پڑتی ہے اگر پرائیویٹ اسکولوں میں پڑھائیں۔ میری ماں سب بچوں کی فیس بھی دیتی تھی پھر سارے بچوں کو روز خرچ کے پیسے بھی دیتی تھی۔ سارے بہن بھائیوں کو صبح اسکول بھیجنے کے بعد مجھے اندازہ تھا کہ میری ماں کے پاس اب پیسے نہیں بچے ہیں۔ اس لیے میں اپنی ماں سے خرچ کے لیے پیسے نہیں مانگتا تھا۔ بعض اوقات بنیادی ضرورت کے خرچ کے لیے بھی مجھے ماں سے پیسوں کے لیے کہتے ہوئے جھجھک آتی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے زمین پر گرا ہوا انڈوں کا ڈبہ اور ماں کی بھیگی آنکھیں آ جاتی تھیں۔ اس نے مجھے انڈے توڑنے کے لیے کچھ بھی نہیں کہا تھا بلکہ دوائی کے پیسوں سے سیب اور انڈے دوبارہ خرید لیے تھے۔ جب مجھے وہ سب یاد آتا تھا تو ہر بار میں خود سے عہد کرتا تھا کہ میں بہت اچھا بچہ بن کے دکھاؤں گا۔ اپنی ماں کو دکھ نہیں دوں گا۔ اور کبھی بھی اس کے دکھوں میں اضافہ نہیں کروں گا۔

میں بہت محنت سے پڑھتا تا کہ میری ماں کو میرے دل لگا کر پڑھنے سے اور میری اسکول کی اچھی رپورٹ دیکھ کر خوشی ہو۔ ساؤتھ کوریا میں چھٹی جماعت میں ایک مقابلے کا امتحان ہوتا ہے۔ جس میں جیتنے والے پہلے دس بچوں کو وظیفہ دیا جاتا ہے۔ تین سو پچاس بچوں نے وظیفے کا امتحان دیا۔ نتیجہ آیا تو میں ان پہلے دس بچوں میں تھا جنہوں نے وظیفہ یعنی اسکالرشپ حاصل کیا تھا۔

جس دن ایوارڈ دیا جانا تھا سب بچوں کے والدین اسکول میں موجود تھے۔ بچوں کے گزرنے کے راستے کے دونوں طرف کرسیوں کی کئی رویہ قطاریں لگائی گئی تھیں اور بچوں کے والدین کو ان کرسیوں پر بٹھایا گیا تھا تا کہ والدین انعام حاصل کرنے والے بچوں کو با آسانی دیکھ سکیں۔ جب میں وہاں سے گزر رہا تھا میرے کانوں میں بہت سے بچوں کے والدین کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''اس بچے نے انعام جیتا ہے۔ یہ ''جینگ سو'' ہے میرے بچے کا دوست۔'' مجھے بہت فخر محسوس ہوا۔ میری ننھی سی گردن تن گئی۔ لیکن مجھے اس سے زیادہ اپنی ماں کا چہرہ دیکھنے کی فکر تھی۔ پھر میں نے دیکھا میری ماں میری دائیں طرف والی پہلی قطار میں گلابی شرٹ میں اپنے سیاہ بالوں کا جوڑا بنائے بیٹھی تھی۔ میری

ماں کے گورے رنگ پر خوشی سے سرخ ہوتے گال بہت نمایاں تھے اور چھوٹی لیکن چمکدار آنکھوں میں جھلکتی خوشی میں صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔اس کے موتیوں جیسے دانت چمک رہے تھے،اس کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔وہ آنکھیں جو اس دن نمی لیے تھیں۔دکھ بھری نمی۔گو آج بھی ان آنکھوں میں پانی تھا لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔نمی کے باوجود مسکراتی ہوئی آنکھیں جیسا کہ میں دیکھنا چاہتا تھا۔میں ماں کے پاس گیا تو اس نے ہمارے ملک کے رواج اور قومی کلچر کے مطابق میرا کندھا تھپتھپایا۔مجھے یک گونہ سکون محسوس ہوا۔

جب میں نویں جماعت میں پہنچا۔میری دو بہنیں یونیورسٹی میں اور بھائی اور ایک بہن کالج میں تھے۔ان کی فیسوں کا خرچ کافی تھا۔پھر یونیورسٹی اور کالج کے لیے کرائے کے پیسے اور ساتھ ہی ساتھ دوپہر کے کھانے (لنچ) کے پیسے بھی دینا ضروری تھے۔سب کو صبح جاتے ہوئے پیسے دینے کے بعد میں سمجھ جاتا تھا کہ ماں کے پاس پیسے نہیں ہیں۔کیونکہ ہمیشہ کی طرح مجھے دینے سے پہلے ہی ماں کے پاس پیسے ختم ہو جاتے تھے۔میں نے ماں سے کہا

"مجھے فیس کے لیے پیسے چاہئیں۔"

ماں کے پاس پیسے نہیں تھے۔ماں نے کہا"اگلے ہفتے میں تمہیں پیسے دے دوں گی۔"

اگلے ہفتے پیسے دوبارہ مانگے تو ماں نے کہا"رک جاؤ،تنخواہ آئے گی تو دے دوں گی۔"

پھر میں نے پیسے نہیں مانگے۔اسکول میں فیس جمع کروانے کے دن اوپر ہو گئے تو ٹیچر نے بار بار جماعت کے دوسرے بچوں کے سامنے کہنا شروع کر دیا۔

"سو (Su) تم فیس کیوں نہیں لائے۔" دوسرا مہینہ شروع ہو گیا۔دوسرے مہینے کے تیسرے ہفتے میں ٹیچر (استانی) نے کہا۔"اب جب تک تم پیسے لے کر نہیں آؤ گے تم روزانہ اسکول کا واش روم صاف کیا کرو گے۔"

میں ایک ہفتے تک اسکول کا غسل خانہ صاف کرتا رہا۔لیکن مجھے پتہ تھا میری ماں کے پاس پیسے نہیں ہیں۔میں نے ماں سے پھر بھی ذکر نہیں کیا۔آخر تنگ آ کر استانی صاحبہ نے کہا۔"اب تم کلاس روم میں نہیں بیٹھ سکتے۔"میں نے اپنا بستہ اٹھایا اور جماعت سے اور پھر اسکول سے باہر آ گیا۔لیکن میں گھر نہیں گیا۔کیونکہ میری ماں کو دکھ ہوتا۔جو مجھے کسی قیمت پر گوارا نہیں تھا۔میں سمندر کے کنارے چلا گیا۔ساحلِ سمندر پر گھومتا رہا۔چھٹی کا وقت ہونے پر میں نے گھر کا رُخ کیا۔پورے چھٹی کے وقت کے حساب سے میں گھر پہنچا۔ماں کو ذرا شک نہیں ہوا۔ایک ہفتے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔روزانہ کلاس سے استانی صاحبہ بھگا دیتیں اور میں ساحلِ سمندر کا رخ کرتا۔ایک ہفتے کی اس ڈھٹائی کو میری استانی نے کافی سنجیدگی سے لیا۔انہوں نے

مجھے کہا۔"کل اگر فیس لے کر نہ آؤ تو اسکول بالکل نہیں آنا۔تمہارا نام اسکول سے کاٹ دیا جائے گا۔"

یہ سن کر میں ساحلِ سمندر پر نہیں گیا۔سیدھا گھر چلا گیا۔ماں کے پاس جا کے ماں کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔اور میں نے ماں کو بتایا۔"اگر میں نے اب فیس جمع نہ کروائی تو کل اسکول سے مجھے نکال دیا جائے گا اور میرا نام کاٹ دیا جائے گا۔" پھر میں نے ایک ایک بات ماں کے گوش گزار کر دی۔ماں نے کہا۔"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"

ماں میرے ساتھ اسکول گئی۔فیس جمع کروائی اور مسئلہ حل ہو گیا۔لیکن انڈے توڑنے کے واقعے نے ہمیشہ مجھے ایک ایسے مقام پر کھڑا رکھا جو میری ماں اور میرے درمیان تعلق اور احساس کا سنگِ میل تھا۔بعد میں میں امریکہ چلا آیا اور یہیں نوکری کر لی۔لیکن ایک چھوٹے سے واقعے نے ساری عمر مجھے اور میری ماں کو ایک مضبوط رسی سے باندھے رکھا۔میں ماں کی ساری مجبوریاں سمجھنے لگا۔چھوٹی عمر میں ہی بہن بھائیوں کی نسبت زیادہ ذمہ دار ہو گیا۔لیکن اپنے اسی احساس ندامت کی وجہ سے میں نے بہت سی تکلیفیں بھی سہیں۔لیکن اس کا سب سے زیادہ مثبت نتیجہ یہ نکلا میری ماں آج میرے پاس رہتی ہے۔دوران ملازمت مجھے اپنی ایک کولیگ خوبصورت اور سمجھ دار کورین لڑکی سے محبت ہو گئی۔ ہمارے ایشین کلچر کے مطابق اسے میری ماں کو ساتھ رکھنے پر کوئی اعتراض نہیں۔میری بیوی کی رضا سے ہم دونوں میاں بیوی ساری تنخواہ اپنی ماں کو دے دیتے ہیں تا کہ وہ جیسے مرضی گھر چلائے اور اسے چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے کبھی ترسنا نہ پڑے۔اب میں خرچ کے لیے پیسے ماں سے بڑے اعتماد سے مانگ لیتا ہوں کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ اس کے پاس پیسے ہیں۔

◀◀ ● ▶▶

1221 W 29 IL Street
Opt #103
Los Angeles CA 90007(USA)

نام رسالہ :سہ ماہی آبشار (ناول صدی نمبر)
مدیر اعزازی : محمد سلیم فواد کندی
قیمت : ۴۰۰/روپے
رابطہ : نیو کالونی، کندیاں، چشمہ بیراج، میانوالی

نام رسالہ: ششماہی ادب وثقافت (مارچ)
مدیر : پروفیسر محمد ظفر الدین
رابطہ :ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلیکیشنز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

● اسماء حسن

فصیلِ ذات

میں ایک ہارا ہوا انسان ہوں!

میرے ہاتھ میں جیت کا علم ضرور ہے، مگر مات کی بیڑیاں میرے قدموں کو جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ کیسی فتح ہے؟ جس نے میری نس نس میں شکست کا زہر گھول دیا۔ میں وہ ہوں، جس نے آسمان کی وسعتوں پر کمند تو ڈالی مگر اونچائی سے کچھ یوں گرایا گیا کہ اٹھنے کی سکت تک نہ رہی۔ میری باتوں کا تضاد مجھے پاگل ثابت کرنے پر تلا ہے۔ مگر نہیں میں پاگل بالکل نہیں! تو پھر میرے کمرے کا گھپ اندھیرا کیوں میرے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے؟ حق بات کہنے کا مداح ایک شخص، آج اپنی ہی ذات کا بوجھ لیے آرامدہ کرسی پر ڈھے سا گیا ہے۔ کسی کروڑ پتی جواری کی طرح جس کی ایک غلط چال اسے کوڑی کوڑی کا محتاج بنا سکتی ہے۔

آج میرے ہاتھوں میں ایک کشکول ہے۔ جس میں کھنکتے چند سکوں کی بازگشت میری متاع حیات ہے۔ میری قیمتی پوشاک میں ایک گداگر تاک لگائے بیٹھا ہے۔

میں نے پچاس سالہ زندگی میں کیا کھویا کیا پایا؟ یہ سوال ذہن کی پرتوں سے متصادم ہوتے ہیں تو دل کے ویران گوشوں سے ہلچل سی اٹھنے لگتی ہے۔ کمرے کے باہر دروازے پر کچھ چہ میگوئیاں سی محسوس ہوئیں اور کچھ سائے بھی دکھائی دیے مگر جلد ہی باہر کا شور بھی تھم گیا اور ماحول پرسکون ہو گیا۔

''پیارے وجاہت! مجھے تم سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ تم پڑھ لکھ کر اپنے باپ دادا کا نام روشن کرو گے اور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو بھی تعلیم کے زینے پر سوار کر کے انہیں اچھا انسان بناؤ گے۔ تم دل لگا کر پڑھنا اور یاد رکھنا زندگی جو سبق سکھاتی چلی جائے اسے ایک گٹھڑی میں باندھتے رہنا۔ ہاں سنو، اس گٹھڑی کو سنبھال کر رکھنا! جب جب ضرورت پڑے اسے کھولنا اور سارے سبق آگے منتقل کرتے رہنا۔''

میں نے بالکل ایسا ہی تو کیا تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے جب میں نے میٹرک کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی تو دادا جی کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک اور لبوں پر ایک تفاخرانہ مسکان تھی۔ دادا جی کی اوٹ میں بیٹھے، اخبار پڑھتے ہوئے ابا جی کا سر بھی فخر سے بلند ہو رہا تھا۔ محلے بھر میں دیسی گھی کے لڈو بانٹے گئے۔ غریبوں پر لنگر کھول دیا گیا اور مزاروں پر بیٹھے حاجت مندوں کی حاجات پوری کی

گئیں۔ اور میں پھولے نہ سما رہا تھا۔ چوک گھنٹہ گھر کی پتلی سی گلی کے ایک قدیم مکان کا لڑکا، کامیابی کا جھنڈا لیے، جب گھر سے باہر نکلتا تو لوگ انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے اپنے بچوں کو طعنے دیتے۔

''دیکھو نالائقو! وہ جا رہا ہے حاجی صاحب کا بیٹا۔ باپ دادا کا نام روشن کر دیا۔ تم لوگ بھی اس جیسے بنو۔ اس سے کچھ سیکھو۔''

تب، میں کچھ اور بھی سینہ تان کر چلنے لگتا۔ بچپن کے دن ہی کچھ ایسے ہوتے ہیں۔ کوئی تعریف کرے تو لگتا ہے ہم زمانہ بھر سے بہتر ہیں۔ پھر میں نے ایف ایس سی کے متحانات میں بھی ضلع بھر میں اول پوزیشن حاصل کی۔ تب بھی دادا جی کی خوشی دیدنی تھی۔ ان وقتوں میں کوئی ایف۔ ایس۔ سی کی ڈگری حاصل کرے اور وہ بھی اول پوزیشن کے ساتھ تو خاندان والوں کے ساتھ ساتھ محلے والے بھی فخر کیا کرتے تھے۔ اخباری رپورٹر گھر آئے تھے۔ چھوٹے بہن بھائی محلے میں دوڑ دوڑ کر لوگوں کو بلا کر لا رہے تھے کہ ''وجاہت بھیا کی تصویر اور انٹرویو اخبار میں آئے گا۔''

ایک معمولی سے مکان کی چھوٹی سی بیٹھک میں میرے سامنے دو چار لوگ کاپی پنسل لیے مجھ سے سوال کر رہے تھے۔ جب ان کے ایک سوال پر میں نے جواب دیا کہ یہ سب میرے دادا جی اور ابا جی کی دعاؤں کا نتیجہ ہے تو ان دونوں کی آنکھوں سے بہتے آنسو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

''سنو وجاہت! یہ کامیابی تمہاری محنت کا حاصل ہے۔ تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ ترقی جتنی بھی حاصل کر لو مگر عجز و انکسار کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ کبھی اپنے بہن بھائیوں کو اکیلا مت چھوڑنا۔ تم بہت سمجھدار ہو اور مجھے تم پر فخر ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر آنے والی مشکلات کا سامنا کامل یقین کے ساتھ کرنا۔ اپنے قدموں کو تھمنے نہ دینا۔ باہمی مشاورت سے فیصلے کرنا کہ مشورہ میں برکت ہے۔ ترقی کی منازل طے کرتے کرتے تھک جاؤ تو کچھ دیر کے لیے آرام کرنا اور پھر آگے بڑھنا۔''

''ہاں دادا جی میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ آپ کے کہے گئے سنہرے حروف کے سہارے ہی تو میں نے زندگی کی ڈگر کو متوازن رکھا مگر میں پھر بھی ہار گیا؟ میں تو پورے کارواں کو ساتھ لے کر چلا تھا۔ مگر میں تہی داماں ہی رہا۔ دیکھیں میرے ہاتھ خالی ہیں۔'' دادا جی کے خط پر ٹپکتے آنسو مجھے میری شکست کا احساس دلا رہے تھے۔ ایف ایس۔ سی کے بعد مجھے انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ وہاں بھی میرے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ طلبا و طالبات کیا، سب اساتذہ کی زبان پر بھی میرا ہی نام تھا۔ ہر سال پوزیشن بورڈ پر وجاہت احمد کا نام سرفہرست دیکھ کر میں پھولے نہ سماتا۔

چھٹیوں میں گھر جانے کی اتنی جلدی ہوا کرتی تھی کہ پاؤں میں پہنی، گھسی پٹی چپل کی پروا کیے بغیر

ہی تیز گام پر سوار ہو جاتا۔ راستے میں چھوٹا سا جنکشن خانیوال پڑتا تھا۔ میں ہمیشہ وہاں اتر کر بہن بھائیوں کے لیے تحفے تحائف لے لیا کرتا تھا۔ چونکہ وہاں سے میرے شہر کا فاصلہ بہت کم رہ جاتا تھا۔ اس لیے میری خوشی دونی ہو جاتی۔ دادا جی کے لیے ہمیشہ کوئی کتاب لیتا، کیونکہ انہیں مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ہم سب بہن بھائیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے خواہاں تھے۔ سب گھر والے مجھے دیکھ کر دیوانے سے ہو جایا کرتے تھے۔ چھوٹے بہن بھائی بھاگ کر جاتے اور اپنے دوستوں کو بلا لاتے اور انہیں بڑے فخر سے کہتے۔

''آ جاؤ وجاہت بھیا آئے ہیں کسی نے کوئی سوال سمجھنا ہے تو سمجھ لو۔ انہیں سب کچھ آتا ہے۔''

اور پھر گھر کے باہر، سچ مچ ایک لمبی قطار لگ جایا کرتی۔ میں سب کو گھر کے برآمدے ہی میں ایک جماعت بنا کر پڑھانا شروع کر دیتا۔ اس زمانے میں تعلیم کا رواج کچھ زیادہ نہ تھا اس لیے محلے میں کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتا تو وہ پورے محلے ہی کا استاد ہوا کرتا تھا۔ میری بھولی بھالی ماں جب یہ دیکھتی تو اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ اولاد کی کامیابی ماں کی آنکھوں میں صاف دکھائی دیا کرتی ہے۔

کیسے میٹھے زمانے تھے جب غیر بھی اپنے ہوا کرتے تھے اور پرائے گھروں کے دروازے بھی سب کے لیے کھلے رہتے تھے!!!

''پیارے وجاہت تم کامیابی کی سیڑھی پر قدم رکھتے چلے جا رہے ہو۔ اب میں جلدی مرنے والا نہیں ہوں۔ تمہاری کامیابیاں مجھے جینے کی نئی امنگ دیتی ہیں۔ بس کبھی خواہشوں کا غلام نہ بننا۔ پاؤں اتنے پسارنا جتنے سمیٹ سکو۔ زبان اتنی کھولنا جتنی سنبھال سکو۔ زندگی کے نشیب و فراز کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا۔ تم حاجی احمد کے بیٹے اور وقار احمد کے پوتے ہو۔ تجھے دھن دولت کی کوئی کمی نہیں بس تو اپنی پڑھائی پر توجہ دینا اور ایک بات یاد رکھنا علم حاصل کرنا تعلیم نہیں۔''

مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ دادا جی گھر میں ہوتے ہوئے مجھے خط کیوں لکھتے رہتے ہیں حتیٰ کہ وہ یہ باتیں مجھے سامنے بٹھا کر بھی کہہ سکتے تھے۔ مگر ان سے یہ سوال کرنے کی ہمت کبھی نہیں ہوئی۔

دادا جی زمین جائیداد کے مالک تھے۔ پیسے کی ریل پیل وراثت میں ملی تھی مگر پھر بھی سادگی ان کا وطیرہ تھی۔ یہی وجہ تھی دھن دولت ہونے کے باوجود ہمارا گھر انتہائی بوسیدہ حالت میں تھا۔ جو پیسہ ہوتا وہ سب بہن بھائیوں کی تعلیم پر خرچ کیا جاتا۔ کوئی کیسا ہی مہمان کیوں نہ آ جائے، اسے اسٹیل کے گلاس میں پانی دینا اور چینی کی پیالی میں چائے پلانا ہمارے گھر کا اصول تھا۔ جس پر کچھ دوست طنز بھی کرتے۔ میں تعلیم کے زینوں پر چڑھتا چلا گیا۔ چھوٹے بہن بھائیوں کو بھی اسی سیڑھی پر قدم رکھوا دیا۔ ان کے ہر پل کا خیال رکھا۔ پڑھائی میں ان کا استاد رہا اور گھر میں ان کا وکیل۔ جب کبھی ابا جی سے کوئی بات منوانی ہوتی تو سب

بہن بھائی مجھے آگے کر کے خود میرے پیچھے چھپ جاتے۔ میرا بات کرنے کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ ابا جی میری کوئی بات رد نہ کرتے۔ حالانکہ ان کی بارعب شخصیت کے سامنے بات کرنا گویا کسی شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔ مگر شاید مجھے یہ جرأت میری تعلیم نے دی تھی کہ میں انتہائی پراعتماد لہجے میں سبھی امور پر ان سے بات چیت کر لیا کرتا تھا۔

میں نے انجینئرنگ مکمل ہوتے ساتھ ہی ایک سرکاری ادارے میں نوکری کر لی۔ گھر، گاڑی اچھی تنخواہ، اعلیٰ عہدہ سب کچھ میرے پاس تھا۔ قابل ترین آفیسرز بھی میری ذہانت اور شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ پاتے۔ مجھے لوگ سنتے اور حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے۔ میں دفتری امور پر بات کروں یا گھریلو معاملات کو سلجھانے کے لیے کسی پنچائیت میں بولوں، لوگ میری بات کو ٹو کنا گناہ سمجھتے تھے۔ اللہ کی ذات نے مجھے گفتگو کرنے کا کچھ ایسا ہنر عطا کیا تھا کہ لوگ میرے گرویدہ ہوتے چلے جاتے۔ ادارے کی طرف سے امریکہ ایک ٹریننگ پر جانا پڑا۔ اس دن گھر والوں کی خوشی دیکھنے والی تھی۔ پورے محلے کو پتا تھا کہ میں امریکہ جا رہا ہوں۔ دادا جی کی طبیعت ان دنوں کچھ ناساز تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں نہیں جاؤں گا مگر وہ نہ مانے کہ اتنا اچھا موقع بار بار نہیں ملتا۔ میں بیرون ملک روانہ ہوا اور وہاں پر بھی بہت سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا کر لوٹا۔ جب واپس آیا تو دادا جی اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ ان وقتوں میں ٹیلی فون تک رسائی اتنی آسانی سے نہیں ہوا کرتی تھی کہ پیغام پہنچا دیا جاتا۔ یہ صدمہ میرے لیے کسی جان لیوا عذاب سے کم نہ تھا۔ جس ہاتھ کی انگلی پکڑ کر میں نے چلنا سیکھا تھا اور جو انگلیاں خط لکھ لکھ کر مجھے جینے کے گر سکھاتیں تھیں۔ آج وہی ہستی اس دار فانی سے کوچ کر گئی تھی۔ لیکن یہ زندگی ہے آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ تلخیوں کے زہر تو پینے پڑتے ہیں۔ پھر زمانے کا چلن بدلتا گیا اور میری ترقی بھی آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگی۔

میں سرکاری نوکری چھوڑ کر ایک ''ملٹی نیشنل کمپنی'' میں بھرتی ہو گیا۔ جو فیصلہ میں کر دیا کرتا تھا ابا جی سمیت گھر کا کوئی فرد اس پر سر اٹھانے کا روادار نہ تھا۔ اب گھر کا سربراہ ابا جی کے جگہ میں ہی تھا۔ کبھی کسی معاملے کو سلجھانا ہوتا تو ابا جی میرے ایک مرتبہ کے کہے پر مان جاتے۔ پھر وقت گزرتا چلا گیا۔ میرے غیر ملکی دورے بڑھنے لگے۔ میں ہر ماہ بیرون ملک سفر کرنے لگا۔ چھوٹے بھائی بھی بے انتہاء ذہین تھے۔ انہوں نے بھی تعلیم مکمل کی اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو گئے۔ چار چار بچوں کے باپ بننے پر بھی کبھی انہوں نے میرے آگے سر نہ اٹھایا۔ ان کی بیویوں کی آپس میں ناچاقیوں پر بھی انہیں بٹھا کر خوب سنایا کرتا تھا۔ وہ بھی سر کو جنبش تک نہ دیتیں اور ''جی بھیا جی'' کہہ کر اٹھ جاتیں۔ میں اپنی وضاحتوں پر فخر محسوس کرتا کہ میں قائل کرنے میں کیسا ماہر ہوں۔ میرا غصہ ایسا تھا کہ کسی کی کبھی زبان نہ کھلتی تھی۔

کمرہ تاریک ہونے کے ساتھ ساتھ میرے باطن کے اندھیرے کو بھی بڑھا رہا تھا۔ در و دیوار پر پھیلتے رات کے بھیانک سائے میرے قد سے اونچے معلوم ہو رہے تھے۔ میرے اندر کی خاموشی کی بازگشت صرف مجھے سنائی دے رہی تھی۔ صد افسوس یہ کیسا خوفناک دن تھا کچھ دیر پہلے ہی تو میں بہت بڑی کامیابی کا پیغام لیے گھر لوٹا تھا۔ آج مجھے ایک نامور کمپنی کے چیئر مین کا عہدہ سونپا گیا تھا۔ میری خوشی سنبھالے نہ سنبھل رہی تھی۔ میری اس خوشی کو منانے کے لیے کھانے کی میز پر مزیدار پکوان کے ساتھ ابا جی سمیت میرا پورا کنبہ بیٹھا تھا۔ حسب معمول میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''آج میری زندگی کا سب سے اہم دن ہے اور دادا جی کی یاد بہت ستا رہی ہے۔ میں نے زندگی انہی کے اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے گزاری ہے۔ کوشش کی ہے تم سب لوگوں کو وہ سب کچھ دے سکوں جس کی تم سب کو خواہش ہے۔ آج میں تم سب سے ایک تحفہ چاہتا ہوں۔ تم لوگ جو میرے بارے میں سوچتے ہو وہ سچ سچ بتاؤ گے۔''

بھرم اور تفاخر کی فصیل اتنی بلند تھی کہ میں ان سب کے چہروں کے تاثرات دیکھے بغیر ہی نتیجہ اخذ کیے بیٹھا تھا۔ حسب توقع سب نے میرے ہنر کی تعریفیں کیں۔ مجھے سراہا اور شکریہ ادا کیا۔ مگر ایک آواز ان سب سے مختلف تھی۔

''سچ سننا اتنا آسان نہیں ہوتا وجاہت بھیا۔''

چھوٹے بھائی کی بیوی نئے زمانے کے چلن کی مداح لڑکی تھی۔ اس کے تیور اور نوک جھونک مجھے ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ وہ اس سے قبل بھی کچھ ایسی باتیں کہہ جایا کرتی تھی کہ دل خون کے آنسو رونے لگتا مگر کبھی تو میں خاموش ہو جاتا اور کبھی اسے قائل کر لیتا تھا۔ اس کی شادی کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ شاید اسی لیے اسے میری تکریم و مرتبہ کا بخوبی اندازہ ہوا ہی نہیں تھا۔ وہ تکریم جو میرے اندر کچھ ایسے گھر کر چکی تھی کہ میری آواز دوسروں سے ہمیشہ اونچی رہی۔ نئی نویلی دلہن کی سوچ پر ابھی گھر والوں کی سوچ کا رنگ چڑھنا باقی تھا۔ اسی لیے وہ سب کچھ کہہ گئی جسے کہنے کے لیے کسی کی زبان کبھی کھلی ہی نہ تھی۔ سب کے چہروں کے رنگ زرد پڑ گئے۔ بھائی نے اسے خاموش رہنے کو کہا مگر آج میں نے ہی تو اسے بولنے کی اجازت دی تھی۔ شاید یہ اجازت پہلے کبھی دی ہی نہیں گئی تھی۔

''آپ قابل احترام ہیں وجاہت بھیا مگر آپ اپنی خواہشات کے غلام ہیں۔ آپ محض تعریف کے خواہاں ہیں آپ کو دوسروں کو نیچا دکھا کر تسکین ملتی ہے۔ آپ کو گھمنڈ ہے کہ آپ جیسی گویائی کسی کو عطا نہیں کی گئی۔ اس لیے آپ سوال بھی کرتے ہیں اور جواب بھی خود دے کر فیصلہ صادر کر دیتے ہیں۔ آپ کو غرور

ہے تو اس بات کا کہ آپ نے اپنے بہن بھائیوں کو علم سکھایا۔ لیکن افسوس آپ نے وہ علم خود حاصل ہی نہیں کیا۔ آپ کو گمان ہے کہ آپ بولتے ہیں تو صرف سچ بولتے ہیں مگر نہیں وجاہت بھیا۔ محض خود نمائی کے شوق نے آپ کو آپ ہی کے حصارِ ذات میں مقید کر دیا۔ آپ اپنی ہی ذات کے گہرے کنوئیں میں گرتے چلے گئے۔ یہ سب لوگ آپ کے ڈر کے آگے سر جھکائے ہوئے ہیں نہ کہ آپ کی صلاحیتوں کے سامنے۔ آج سے پہلے آپ نے کتنی مرتبہ ان سب سے کسی معاملے میں رائے مانگی؟ سچ کہنا اتنا مشکل نہیں وجاہت بھیا جتنا سچ سہنا کٹھن ہے۔ آپ نے دنیا تو فتح کی مگر رشتوں کے احساسات سمجھنے میں ہار گئے۔''

اس سے آگے اس نے کیا کہا، مجھے کچھ سنائی نہیں دیا صرف لفظ ''ہار'' میرے کانوں میں گونج کر کاری ضرب لگا رہا تھا۔ آج میں کرسی پر ڈھے گیا۔ تب سے ایک مردہ وجود کی مانند خالی دیواروں کو گھور رہا ہوں۔ غصے سے ادھر ادھر ہاتھ مارتے ہوئے ایک پرانی ڈائری ملی۔ اس میں سے ایک خط نکلا۔ لکھائی جانی پہچانی لگی۔

''پیارے وجاہت۔ جب تم امریکہ سے آؤ گے تو شاید مجھے زندہ نہیں پاؤ گے۔ آج میرا یہ آخری خط ہوگا۔ میری باتوں کو دھیان سے سننا۔ اپنی کامرانیوں پر کبھی گھمنڈ نہ کرنا۔ کسی کو ہیچ نہ سمجھنا۔ دوسروں کو زیادہ سننا اور خود کم بولنا۔ کسی کے جذبات کو مجروح مت کرنا۔ رشتوں کے تقدس کو پامال ہونے سے بچانے کے لیے انہیں سینچنا پڑتا ہے۔ اس کی کونپلیں کسی نوزائیدہ بچے کی طرح ہوتی ہیں جسے سختی سے پکڑو گے تو پروان چڑھنے سے پہلے ہی ٹوٹ جائیں گی۔ ان جذبوں کو تصنع اور بناوٹ سے پاک رکھنا ورنہ یہ بند مٹھی سے ریت کی مانند پھسلتے چلے جائیں گے اور جب مٹھی کھولو گے تو خالی ملے گی۔ یہ سب روحانی بیماریاں ہیں جو دل و دماغ کو آہستہ آہستہ رگیدتی ہیں اور پھر دیمک کی طرح چاٹتی رہتی ہیں جب تک کہ زندگی کی ڈور ٹوٹ نہ جائے۔ تعلیم یافتہ انسان وہ ہے جو کتابوں سے پہلے رشتوں کے چہرے پڑھے۔ جوان کے دلوں کی آواز سنے۔''

میں پھٹی پھٹی آنکھیں لیے دادا جی کے خط کو دیکھتا رہا۔ شاید یہ اسی لیے میرے ہاتھ نہیں لگا کہ فصیل کو ٹوٹنا تھا۔

میں مانتا ہوں کہ میں ایک ہارا ہوا انسان ہوں۔

لیکن کیا قصوروار صرف میں ہوں یا پھر میرے وہ رشتے بھی جو میری غلط باتوں کی اندھی تقلید کرتے رہے؟

◀◀ ● ▶▶

House no 96 A, Room 1,
Tai po Tsai on Clear Water bay road, kowloon
Hong kong,

● انجم قدوائی

وجود کا سایہ

اور اس دن میں اپنے آپ سے ملا۔ سڑک پر اکیلا لڑکھڑاتا ہوا۔ چہرے پر آنسوؤں کے دھبّے۔ میلا یونی فارم۔ اور تب تک میں اپنی کار سے ٹکرا کر گر چکا تھا۔

کچھ دیر تک میں اپنے آپ کو کار کی پچھلی سیٹ پر اوندھا لیٹا سسکیاں لیتے دیکھا کیا۔ اور تب میرا جینے کو جی چاہنے لگا۔

آیئے میں آپ کو شروع سے بتاتا ہوں۔

تیز نیلی چنگھاڑتی ہوئی آواز سماعت کو دہکا رہی تھی۔ میں بستہ زمین پر وہیں زینہ کے پاس پھینک کر، پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔ گھنٹی بجانے کی ہمّت نہیں ہو رہی تھی۔ گھر کے اندر چیخ پکار اور برتن پھینکنے کا سلسلہ جاری تھا۔ زور کی بھوک لگ رہی تھی، نیند بھی آ رہی تھی مگر گھر جانے کی ہمّت نہیں تھی۔ یہ روز کا معمول تھا۔ سر جھکا کر نیچے کے زینے کی طرف نظر ڈالی تو دیکھا، وہ چہرہ اوپر کئے کھڑی تھی، اس کے چہرے پر تشویش تھی۔ گول نرم چہرہ دو چھوٹی چھوٹی پونیاں بنائے صاف شفّاف گلابی فراک پہنے ہوئے۔ شاید ابھی نہا کے آئی تھی۔ اس نے اپنا ننھا سا ہاتھ اٹھا کر مجھے بلایا۔ مگر میں نے جھنجھلا کر نظریں پھیر لیں۔ نیند سے پلکیں بھاری ہو رہی تھی اس لیے دیوار سے ٹک گیا تھا۔

چند لمحوں بعد اس کا نرم سا ہاتھ اپنے کاندھے پر محسوس ہوا۔

''چلو آؤ میرے ساتھ.....'' اس نے میرا بستہ اپنے کاندھے پر ٹانگ رکھا تھا میں آہستہ قدموں سے غنودگی کے عالم میں اس کے پیچھے چلنے لگا۔

صاف ستھرا چھوٹا سا فلیٹ، محبّتوں کی خوشبو سے معمور..... مجھے اپنے میلے کچیلے کپڑوں سے بڑی کوفت ہوئی۔

''تم منہ ہاتھ دھولو..... میں کھانا لگاتی ہوں'' اس کی امّی نے میرے بکھرے بال اپنی انگلیوں سے سنوارتے ہوئے کہا۔ میں کھانا کھا کر وہیں فرش پر سو گیا۔ وہ وہیں پر اسکول کا کام کرتی رہی۔

شام کو گھر میں داخل ہوا تو سب بے فکری سے اپنے اپنے کاموں میں مصروف نظر آئے۔ بھیّا نے کمپیوٹر سے نظر اُٹھا کر ذرا کی ذرا مجھے دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

ماں نے جھاڑن لینے کے لئے اسٹور کا دروازہ کھولا اور پھر زور سے بند کیا۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے اور بھیّا کے مشترکہ کمرے میں آیا جوتے اتار کر ایک طرف رکھّے۔ نہانے کے لئے باتھ روم میں گھس گیا۔

شاور کی ننھی ننھی بوندیں جسم کی گرد تھکن اور ذہن کی جھنجھلاہٹ صاف کرتی رہیں۔

اور چند لمحوں کے لئے وہ شام میری اپنی ہو گئی.....

مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میرے گھر کا ماحول ایسا کیوں تھا؟ ماں کسی بوتیک میں کام کرتی تھی پاپا کا اپنا بزنس تھا، گھر بھی اپنا تھا۔ وہ دونوں بھائی ٹھیک ٹھاک پڑھ بھی رہے تھے۔ بظاہر کوئی کمی نہیں نظر آتی تھی۔ میرا کچّا ذہن یہ سوچنے سے قاصر تھا کہ لڑائی جھگڑے کی وجہ کیا تھی..... میں چاہتا تھا میرا گھر بھی ارم کے گھر جیسا ہو جائے، صاف ستھرا موتی کی طرح چمکتا دمکتا۔ جہاں اس کی امّی روز تازے پھول سجاتی تھیں اور ہمیشہ مسکرا کر ویل کم کرتی تھیں۔ اس کے گھر پر کھانے بھی بہت معمولی ہوتے، کبھی کبھی سلائس جیم کے ساتھ ایک کیلا..... مگر خوشی خوشی کھا کر تسکین ملتی تھی۔ ارم کی امّی کبھی مجھے اپنے ہاتھ سے بھی کھانا کھلا دیتی تھیں، سادے سے دال چاول..... وہیں بغیر کارپٹ کے فرش پر پنکھے کے نیچے سکون کی نیند سو جاتا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا، سفید اور گلابی فرش۔ ایک نرم سی مہک۔

اس کی امّی آہستہ آہستہ اپنا کام کرتیں کہ وہ جاگ نہ جائے۔

نیند بھر کے اٹھتا تو تر و تازہ ہوتا۔ ارم کے ساتھ بیٹھ کر اوٹین کا گلاس ختم کر کے کالونی کے بچّوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے نہ جانے کب شام اتر آتی۔ اپنے گھر جانے کا خوف اس کے دل میں ذرد سیّال بن کر دوڑنے لگتا۔

اس دن پھر کھانے کی میز پر ڈیڈی چیخ کر ماں کو ڈانٹتے رہے اور کئی بار ماں چلاّ چلاّ کر اپنا غصّہ اتارتی رہی۔ میرا پلّے میں کھانا اٹک رہا تھا، بھیّا میری طرف ہی دیکھ رہے تھے انھوں نے پنیر کا پیالہ میری جانب سرکایا۔

''یہ لو تمہیں تو بہت پسند ہے نا.....؟''

بے دلی سے بڑھا ہوا ہاتھ راستے میں ہی رہ گیا، ڈیڈی نے پیالہ لے لیا اور کھینچ کر زمین پر دے مارا۔

''نہ نمک کا پتہ اور نہ مصالے کا..... یہ کتّے کا راتب بنا کر رکھا ہے میرے اور میرے بچّوں کے سامنے..... جاہل عورت کم از کم ایک وقت کا کھانا تو پیٹ بھر کھلا دیا کر.....''

ہم حیران فرش پر بکھرے سرخ سالن اور پنیر کے براؤن ٹکڑوں کو تک رہے تھے..... بھوک چمک اٹھی تھی مگر اب کھانے کی میز پر کیا تھا وہ نظر نہیں آ رہا تھا..... میں اٹھ کر تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ مٹھّی میں آدھی روٹی دبی ہوئی تھی۔ اس کو منہ میں ڈال کر جلدی جلدی نگلنے لگا، آنسو بہہ رہے تھے سسکیاں حلق میں ٹوٹ رہی تھیں۔ بھوک کی شدّت سے نڈھال نہ جانے کب سو گیا۔

صبح بھی کھانے کے لئے بھی ماں نے کچھ نہیں پکایا، اپنے گنی یا کس سے کچھ روپے نکال کر اسکول

کے لئے باہر آ گیا۔

سڑک پر ٹھیلے سے ایک سینڈوچ لیا اور وہیں جلدی جلدی کھا لیا۔ سڑک کے کنارے بنے ہوئے ہینڈ پمپ سے پانی پی کر کچھ سکون ہوا۔ کپڑوں پر نگاہ کی..... یونی فارم بہت میلا اور دھبّے دار تھا۔

اسکول جانے کی ہمّت نہیں ہوئی..... دل میں اک دھواں سا اٹھ رہا تھا..... کہاں جاؤں؟

کالونی کے پیچھے چوکیدار کے کوارٹر میں اس کی بیوی کپڑے الگنی پر ڈال رہی تھی، مجھے دیکھ کر مسکرائی تو میں آگے بڑھ آیا اور برامدے میں پڑی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''کا ہوا بٹوا؟؟ اسکول سے بھاگ آئے ہو کا؟؟؟''

میں کچھ بول نہیں سکا بس خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

وہ میرے لئے اندر سے ایک لسّی کا گلاس لے آئی۔ میں گلاس تھام کر جلدی جلدی لسّی پینے لگا..... اور وہیں پلنگ پر لیٹ گیا۔ وہ حیران تھی پھر ایک چادر لیکر آ گئی۔

''رُک جاؤ بھیّا..... تنی چادر بچھائے دئی.....''

''نہیں رہنے دو'' چادر اس کے ہاتھ سے لے کر سرہانے رکھ لی اور گہری نیند سو گیا۔ جانے کب تک سوتا رہا۔ اٹھا تو شام ہو رہی تھی۔ چوکیدار کرسی پر بیٹھا حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

بستہ اٹھا کر بغیر کچھ کہے میں گھر کی جانب چل پڑا۔

زینہ پر وہ پریشان کھڑی تھی۔

''تم کہاں تھے دن بھر؟؟؟''

اس کے لہجہ میں فکر بول رہی تھی۔

''کچھ تو بولو۔ اسکول کیوں نہیں آئے.....؟''

میں نے سر اٹھا کر زخمی نظروں سے اسے دیکھا.....

''تھوڑی دیر کے لئے تمہارے گھر آ جاؤں؟؟''

اس نے آگے بڑھ کر تپتا ہوا ہاتھ تھام لیا اور اپنے گھر لے آئی۔

وہاں اس کے پاس بیٹھ کر میں اپنے طریقے سے اپنے دُکھ سناتا رہا..... وہ اس کا چہرہ اپنے تولیہ سے صاف کر کے آئسکریم نکال لائی۔ پھر اپنی تصویروں بھری کتابیں دکھاتی رہی اور اس نے ایک ڈائری کھول کر ایک ننھا سا تتلی کا پر دکھایا..... کئی رنگوں سے سجا وہ پر۔ بیحد خوبصورت تھا۔ نظروں میں پسندیدگی دیکھ کر اس نے ایک گلابی لفافے مین وہ پر رکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔

''یہ تمہارے لئے ہے۔ اب مت رونا۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔''

اور وہ پر میری زندگی کا قیمتی اثاثہ بن گیا۔

تعلیمی مدارج طے کرتا رہا۔ ہوسٹل بھی رہا اور عزیزوں کے ساتھ بھی مگر وہ پر میرے ساتھ ساتھ رہا۔ زندگی کئی برس آگے بڑھ آئی۔ دہلی میں ایک اچھا فلیٹ لے کر میں واپس اپنوں سے ملنے بھی گیا، سوچا تھا اس گلابی پر کی طرح اپنی زندگی بھی گلابی ہو جائے گی مگر..... وہاں بھی قسمت سے ہار گیا۔

میں نے جھک کر بالکونی میں رکھّے اپنے پیار سے لگائے ہوئے پھولوں کو دیکھا، گہرے ہرے کنارے پیلے پڑ گئے تھے..... گرد و غبار سے پودے نڈھال اور بے رونق ہو چکے تھے۔ میں تڑپ اٹھا..... پانی کا پائپ لے کر سارے پودوں کو شفّاف کرنے میں جٹ گیا۔ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اس گل داؤدی کے پودے کو لے کر میں زار و قطار رو رہا تھا۔

''سوری دوست..... ویری سوری..... میں بہت خود غرض ہو گیا تم کو بھول گیا تھا..... اپنے غموں میں ایسا جکڑ گیا کہ تمہارا احساس بھی نہ کر سکا..... میرے دوستو.....'' ایک ایک پودے سے معافیاں مانگ رہا تھا کوئی مجھے دیکھتا تو پاگل ہی سمجھتا۔

مگر میں جانتا تھا کہ میں پاگل نہیں ہوں۔ یہ پھول پودے یہ بے زبان ہمیشہ میری اُداسی دور کرتے رہے اور اب میں ان کو بھول کیسے گیا؟ اسکا غم ساری دنیا پر محیط کیوں ہو گیا.....

ارم کی شادی ہو گئی تھی بس یہ خبر برداشت کرنا میرے لئے سخت مشکل بن گئی تھی۔ سارے خواب ایک چھناکے سے ٹوٹ کر ادھر ادھر بکھر گئے تھے.....

کمرے میں آ کر میز پر رکھّی ڈائیری کھولی تو ہتھیلی پر ننھا سا گلابی پر کپکپانے لگا۔

آنسو بے آواز گرتے رہے۔ تھوڑی دیریوں ہی کمرے میں بے مقصد گھومتا رہا۔ شام کمرے کے باہر ٹہل رہی تھی۔ کھڑکی بند کر کے پردے گراتے ہی اے سی کی ٹھنڈک اثر انداز ہونے لگی اور میں بے خبر سو گیا۔

خوابوں میں ارم کا گھر، اس کے گھر کا سکون اور اس کی ماں کی شفقت مجھے بہلاتے رہے۔

صبح روز سے زیادہ روشن تھی۔ ہلکا اجالا پھیل رہا تھا تب ہی وہ اٹھ کر باہر نکل آیا سرسبز پودے خوشی سے جھوم رہے تھے، فضا میں خنکی باقی تھی۔ گل داؤدی کے پتّے گہرے ہرے ہو گئے تھے اور اُن پتّوں سے ننھی سی گلابی کلی شرما کر جھانک رہی تھی۔

میری ساری کلفت دور ہونے لگی..... سارا دکھ سارا غصّہ ساری کوفت ایک ایک کر کے رخصت ہوئے..... میں مسکراتا ہوا گھٹنوں کے بل وہیں بیٹھ گیا۔

''تھینکس یار.....'' میں نے پیار سے ان پتّوں پر ہاتھ پھیرا۔ سامنے کی بالکونی میں دیکھا تو بھیا جی ایکسرسائز کرتے نظر آئے۔ مجھے دیکھتے ہی مسکرائے اور خوشدلی سے بولے۔

''ہیلو جی۔۔۔کہاں رہے اتنے دن؟ بڑے دنوں بعد شکل دکھائی ہے۔''انھیں کیا پتہ کہ میں اس کمرے میں رہ کر بھی یہاں نہیں تھا۔

''بس ایسے ہی جناب.....آؤں گا،ملوں گا کسی دن.....ایک کام بھی تھا آپ سے۔''

''ہاں جی بولو.....آپ جیسے پڑوسیوں کے لئے تو جان بھی حاضر ہے۔حکم کرو۔''

''ارے نہیں صاحب.....اپنی جان ہی نہیں سنبھلتی.....''میں ہنس پڑا۔

''اب کہیں جاؤں گا تو میرے پودوں کی دیکھ بھال آپ کے سپرد.....آپ کی بالکونی میں رکھ دوں گا.....اگر آپ کو بُرا نہ لگے۔''

''تُسی فکر ہی نہ کرو۔یہ تو اپنے بچّوں جیسے ہیں۔اور آپ کے تو ہمارے گھر مہمان ہوئے نا۔ہماری تو بالکونی سج جائے گی جی۔''انھوں نے حسب عادت زوردار قہقہہ لگایا۔

میرے دل کا بوجھ اتر گیا۔

ان بے کراں خیالات کے سمندر میں تیرتے ہوئے مجھے یہ اندازہ بھی نہ ہوا کہ میرے ہاتھ اسٹیرنگ پر بہک رہے ہیں۔اچانک ایک جھٹکے سے میں نے گاڑی روک دی سڑک پر لوگ جمع ہونے لگے تھے۔میں گھبرا کر نیچے اتر آیا۔ایک بچہ اگلے پہیئے کے پاس اوندھا پڑا ہوا تھا۔ایک خوف ناک خیال نے مجھ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا میں نے کانپتے ہاتھوں سے اس بچّے کو سیدھا کیا،اس کو کچھ خاص چوٹ نہیں آئی تھی وہ شاید خوف سے گر گیا تھا۔اسے سہارا دیکر گاڑی کے اندر بیٹھانے تک میں نہیں سمجھ سکا کہ میں کیا کروں گا۔

بچّے کے گھٹنے پر دوا لگا کر میں نے اسے پانی پلایا۔

''کہاں جاؤ گے میں چھوڑ دیتا ہوں۔''

وہ سہمی نظروں سے مجھے تکنے لگا.....پھر دھیرے سے بولا.....''کہیں۔نہیں۔کوئی گھر نہیں ہے میرا۔کہاں جاؤں گا۔مجھے پتہ نہیں۔''

میرے سامنے میرا بچپن پوری جزیات کے ساتھ سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

بچّے نے بتایا اس کے ماں باپ حادثے کا شکار ہو گئے۔چاچا نے گھر پر قبضہ کر کے اسے نکال باہر کیا۔

وہ دھکّے کھاتا ہوا بھوکا پیاسا نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔اور اب۔

اب میری باری تھی۔مجھے محسوس ہوا میں ایک بار پھر اس درد کے سمندر کو پار کرنے نکلا ہوں۔میں نے اپنا محبّت بھرا ہاتھ بچّے کے سر پر رکھ دیا اور اب ہم دونوں گہرے دوستوں کی طرح زندگی سے نپٹنے کے لئے تیّار تھے۔

◀◀ ● ▶▶

F. No. 1 Zakariya Market, Aligarh UP.

● خالد قیوم تنولی

نصیب کی بات

ہم دونوں نے بغاوت کی۔

اور ذات پات کی پست تفریق پر تین پتھر پھینکے۔

اور سماج کی بے رحم فصیلوں کو روندا اور جھوٹی عظمتوں کو اپنے پائے حقارت سے ٹھوکر ماری۔

ہم دونوں اپنے اپنے قبیلوں کے خون آشام انتقام سے بچ کر بھاگے اور صبح کی نمود سے پہلے اس اجنبی مقام پر پہنچے جہاں ہمیں نئی روایت کو جنم دینا تھا۔نئے سماج کی تعمیر کرنا تھی۔اور یہ ہونا ناگزیر تھا ورنہ ہمارا شمار منافقین میں ہوتا۔اس بے آب و گیاہ مقام پر ہم نے ایک قبر کھودی اور اس میں اپنے اندھے ماضی کو دفن کیا۔اور مٹی کی ڈھیری پر اپنی مشترکہ فتح کا جھنڈا گاڑ دیا۔

وہ ایک بڑی چٹان پر بیٹھ گئی اور اپنا پسینہ پونچھنے لگی۔میں اس کے قریب کھڑا رہا اور اپنا پسینہ پونچھتا رہا۔

اس کی نظر مجھ پر اور میری نظر حدِ افق پر ٹھہری تھی۔

اب نئے خوابوں کی آبیاری کو جن نئے اسباب کی حاجت ہوتی ہے ان کے حصول کے لیے میں نے کمر ہمت باندھی۔تادیر قائم رہنے والی سانسوں کا زادِ سفر لیا اور روانہ ہونے سے قبل اس کے نازک کاندھوں پر اپنی وفا سے پیوستہ رہنے کی امید اوڑھا دی۔اس کے لب کپکپانے لگے۔

پھر میں چلا اور ایک بار بھی پلٹ کر اسے نہ دیکھا مبادا میں حوصلہ ہار جاؤں۔

میں گردشِ دوراں اور غمِ روزگار میں یوں پھنسا کہ زندگی اپنے سارے ادھورے کام لے کر میرے قدموں سے لپٹ گئی اور تفکرات کے بھوسے کے ڈھیر میں میری ذات سوئی کی مانند کھو گئی۔

وقت کے ہاتھوں نے میری پیشانی پر ان گنت عبارتیں لکھ دیں۔لمحے مٹھی میں دبی ریت کی طرح سرکتے رہے۔

اصحاب کہف کی سی نیند سے جاگا تو یاد آیا کہ میں تو ایک ہانڈی جلتے چولہے پر چھوڑ آیا تھا۔

بس.....اس خیال کا آنا تھا کہ جیسے میرے پَر نکل آئے ہوں۔برہنہ پا بھاگا۔

جب وہاں پہنچا تو دیکھا.....نہ وہ تھی اور نہ ہی پتھر کی سل۔ وہاں ایک مزار تھا۔ اور مزار کے اندر ایک قبر جس پر رنگ برنگے کپڑوں اور پھولوں کی چادریں.....اور ان چادروں پر نذر کے سنہری اور قرمزی زیورات اور رائج الوقت سکے پڑے تھے۔ اگربتیوں کی خوشبودار لپٹیں تھیں۔ مزار کی مجاور عورتیں بڑی لگن اور عقیدت کے ساتھ جھاڑ پونچھ میں مگن تھیں۔

میری نظر اٹھی اور در مزار کی محراب پر نصب پتھر کی ایک سل پر کندہ اس شعر پر ٹھہر گئی:

گلِ مراد سرِ دشتِ نامرادی کھل
رخِ نگارِ وفا مخملوں سے پیدا ہو

مزار سے باہر میں نے ایک بوڑھی مجاور سے پوچھا۔ ''بہن! یہ مزار کس محترم ہستی کا ہے؟''

جواب ملا: ''یہ مائی بھاگی کا مزار ہے.....سوئے بھاگ جگانے والی.....بڑی پہنچ والی اور بہت بابرکت ہستی ہے.....مدتوں ایک ہی جگہ بیٹھی رہیں.....بڑی سخت چلہ کشی کی۔ بڑا کشٹ سہا۔ نہ کبھی کچھ کھایا نہ پیا۔ دھوپ، بارش، برفباری اور تند ہواؤں کے ستم سہے.....سب کچھ جھیلا.....اور اسی حالت میں اس دار فنا سے دار بقا کو سدھار گئیں۔ جہاں عمر بھر قرار پکڑا وہیں مزار بھی بن گیا۔ یہ بڑے کرم کے فیصلے اور بڑے نصیب کی بات ہے۔ ان بھید بھاؤ کو اللہ والے ہی جانے ہیں۔ ہم تم جیسے گناہگاروں کی سمجھ سے باہر کے معاملے ہیں بھیا.....یہاں اب بدنصیبوں کے نصیب جاگتے ہیں۔''

اتنا سننا تھا کہ میں بے تابانہ آگے بڑھا اور اس سے پہلے کہ مزار کی دہلیز سے اندر قدم رکھتا۔ وہی بوڑھی مجاور زور سے چلائی: ''کہاں چلے ہو بھیا؟''

دفعتاً بہت سے آنسوؤں سے میری نظر دھندلا گئی اور میری آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی.....کچھ ثانیے بعد میں رک رک کر بولا: ''اندر.....معافی مانگنے.....''

''مگر اندر تم نہیں جا سکتے.....''

متواتر بہتے ہوئے آنسوؤں سے میری سفید داڑھی تر ہو گئی اور میں نے حیرت سے پوچھا: ''کیوں.....؟''

بوڑھی مجاور اس بار قدرے نرم لہجے میں بولی: ''اس لیے کہ مائی صاحبہ کی وصیت کے مطابق مزار میں مردوں کا داخلہ منع ہے۔''

یہ سن کر میرے پاؤں تلے زمیں رہی اور نہ سر پر آسمان۔

◀◀ ● ▶▶

18-G/834 Milad Road
Wah Cantt 47040 (Pakistan)03154828119

● خافان ساجد

فیتا

کسی دن صبح سویرے آپ باؤ محلے جائیں تو ممکن ہے آپ کو درمیانی عمر اور صاف رنگ کا ایک پستہ قد آدمی دکھائی دے جو تیز قدموں سے چلتا ہوا ہاتھی چوک کی طرف جا رہا ہوگا۔ اس کی چھوٹی سی کھچڑی داڑھی ہے۔ اس کے جسم پر عموماً مٹیالے رنگ کی شلوار قمیص' پاؤں میں پشاوری چپل اور سر پر نماز والی ٹوپی ہوتی ہے۔ ہاتھ میں موٹے دانوں کی تسبیح' جس کے دانے وہ یوں کھینچ کھینچ کر الگ کرتا ہے جیسے وہ دانے نہ ہوں' رسی میں پروئی ہوئی خشک انجیریں ہوں جنہیں کھانا مقصود ہے۔ وہ بلند آواز میں سبحان اللہ کا ورد کرتا ہے' اور سبحان اللہ پڑھتے ہوئے حا کو بہت لمبا کھینچتا ہے۔ بظاہر یہ آدمی نارمل لگتا ہے۔ پہلی نگاہ میں آپ اسے کوئی پنج وقتہ نمازی سمجھیں گے جو جامعیہ اسلامیہ کشمیر روڈ میں فجر کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد صبح کی سیر کرنے نکلا ہے۔ آپ اسے سلام کریں گے تو جواب دے گا۔ مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائیں گے تو ہاتھ ملائے گا۔ مگر اس دوران شومی بخت کی ماری کوئی بلی اسے نظر آ گئی تو اس کے بدن میں یک دم بجلی بھر جائے گی۔ وہ آپ کا ہاتھ جھٹک کر زمین سے کوئی پتھر روڑا اٹھائے گا اور منہ سے مغلظات کی بوچھاڑ کرتا ہوا بلی کو مارنے لے لئے لپکے گا۔

''بلی کدنی۔ تیری بہن کو لات! بلی حرام کھانی تیری ماں کو لات! تو ہی تھی مروانے والی۔ بیڈ کریکٹر' ماں کلہوڑی' ٹھہر جا تیری۔۔''

اس سے آپ پر یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ وہ آدمی ہوش مند نہیں' پاگل ہے۔

علاقے کی بلیاں بھی اس سے خوب واقف ہیں۔ جونہی اسے آتا دیکھتی ہیں' دم دبا کر وہاں سے بھاگ جاتی ہیں۔

شروع شروع میں یہ بہت غصہ کیا کرتا تھا۔ سڑک سے گزرنے والی ہر گاڑی' موٹر سائیکل' سائیکل اور پیدل انسان کو پتھر مارتا۔ اونچی آواز میں گالیاں بکتا۔ آسمان کی طرف منہ کر کے اللہ میاں سے شکوے کرتا اور کفریہ کلمے منہ سے نکالا کرتا۔ ایک دن جامعیہ اسلامیہ کے ایک حافظ صاحب نے اسے پکڑ کر دم کیا اور پیار سے سمجھایا:

''اللہ تعالیٰ کو ایسا نہیں بولتے۔ سخت گناہ ملتا ہے۔ وہ پاک ہستی ہے۔ سبحان اللہ کہتے ہیں۔ بولو سبحان اللہ۔ سبحان اللہ!''

وہ دن اور آج کا دن اس کی زبان پر سبحان اللہ کا ورد ہی رہتا ہے۔ اب وہ کسی آدمی کو کچھ نہیں کہتا۔ اللہ سے بھی شکوے نہیں کرتا۔ بس بلی کو دیکھتے ہی اس کا میٹر گھوم جاتا ہے۔

باؤ محلے میں ہماری آبائی گھر ہے' یوں میں اسے عرصہ دراز سے جانتا ہوں۔ اس کا نام فیتا ہے۔ یہ اس کا اصل نام نہیں ہے۔ اصل نام توفیق احمد ہے۔ فیتا نک نیم ہے جو ہم دوستوں نے رکھا تھا۔ اس کی وجہ آپ کو آگے چل کر خود بخود معلوم ہو جائے گی۔

لگ بھگ پچیس سال پہلے ہم دونوں سرسید کالج میں پڑھتے تھے۔ وہ میرا ہم جماعت تھا۔ بہت ذہین اور محنتی مگر شریر لڑکا تھا۔ اس کے والد وزارت دفاع میں سیکشن آفیسر تھے۔ اسے جنون کی حد تک آرمی میں کمیشن حاصل کرنے کا شوق تھا' مگر کبھی ابتدائی ٹیسٹ بھی پاس نہ کر سکا۔ ہر بار اس کا چھوٹا قد رکاوٹ بن جاتا۔ اس نے قد بڑھانے کے لئے بہت جتن کئے۔ اشتہاری حکیموں کے نسخے آزمائے' منوں دودھ پیا اور لٹکنے کی ورزشیں کیں۔ قد بڑھانے کا ایسا خبط اس کے سر پر سوار رہتا کہ کپڑے کی پیمائش کرنے والا فیتا ہر وقت پتلون کی جیب میں رکھتا۔ جب اور جہاں موقع ملتا کسی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جاتا اور دوستوں سے درخواست کرتا کہ کوئی نہایت احتیاط سے اس کا قد ناپ دے۔ جو دوست بالکل درست قد بتاتا' اس سے لڑ پڑتا کہ تم نے ٹھیک نہیں ناپا۔ جو اس کا دل رکھنے کے لئے ایک آدھ انچ بڑھا دیتا اسے گلے لگا لیتا اور خوش ہو کر کہتا' انشاء اللہ اگلے ٹیسٹ تک قد مطلوبہ معیار کو چھو لے گا' پھر دیکھتا ہوں مجھے لفٹین بننے سے کون روکتا ہے۔ مگر یہ حسرت اس کے دل ہی میں رہ گئی' کیونکہ قد بڑھنا تھا نہ بڑھا۔ البتہ مجھ سمیت اس کے کئی کلاس فیلو منتخب ہو کر پی ایم اے جا پہنچے۔

رفیق جسے سارے دوست از راہ مذاق فیتا کہا کرتے' اپنی للک پوری کرنے کے لئے کیڈٹوں جیسی ہیئر کٹ کروا کر پھرنے لگا۔ انہی کی طرح ڈریس اپ ہوتا۔ سنیچر کی شام بینک روڈ پر گلکھڑ پلازہ اور سیروز سینما کے اطراف کیڈٹوں کی ٹولیاں دکھائی دیتیں۔ وہ ان سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں گپ شپ لگایا کرتا۔ کوئی اکیلا دکیلا جونیئر کیڈٹ ہتھے چڑھتا تو خود کو سینئر ظاہر کر کے' اسے جھاڑ پلا کر انجانی خوشی محسوس کرتا۔ خود اعتمادی اس میں اس قدر تھی کہ بے دھڑک فوجی یونٹوں اور میسوں میں داخل ہو جاتا۔ سنتری اسے افسر سمجھ کر جھجک کے مارے تعارف کروانے کو بھی نہ کہتے۔ بعض سادہ لوح ایڑھیاں بجا کر سلیوٹ تک کر گزرتے' جس کا قاعدے کے مطابق باوقار انداز میں جواب دیا کرتا۔ تب ملک میں امن وامان کا

دور دورہ تھا۔ دہشت گردی اور انتہا پسندی کا نام ونشان نہیں تھا۔ اس لئے سیکیورٹی کے ادارے بھی کسی سے زیادہ پوچھ پڑتال نہیں کرتے تھے۔

اب تو سال نو کی تقریبات منعقد کرنے پر مذہبی حلقے بہت واویلہ اور ہنگامہ مچا دیتے ہیں' اس دور میں سال نو پہ باقاعدہ جشن کا سماں ہوتا مگر کوئی معترض نہیں ہوتا تھا۔ مجھے سال نو کا ایک جشن نہیں بھولتا۔ میں نے فیتے کے ساتھ اس میں شرکت کی تھی۔ راولپنڈی کلب میں شہر بھر کے شوقین مزاج امراء' سول اور فوجی افسر' ان کی بیگمات اور نوجوان لڑکے اور لڑکیاں پرانے سال کو الوداع کہنے اور نئے سال کے استقبال کے لئے کلب میں جمع تھے۔ ہم نے وہاں بہت سے گورے اور گوریاں بھی دیکھیں۔ فوجی بینڈ طرب انگیز دھنیں چھیڑ رہے تھے۔ بار میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ چند لوگ کرسیوں پر قابض تھے' باقی کھڑے کھڑے من پسند مشروبات کی چسکیاں لے رہے تھے۔ فلور پر جوڑے ناچ رہے تھے اور جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا رقص اور موسیقی میں تیزی آ رہی تھی۔ ہم ہال میں داخل ہوئے تو بمشکل آخری کونے میں دروازے کے ساتھ اسٹولوں پر جگہ ملی۔ ہمارے بالکل آگے بلوریں آنکھوں اور سنہرے بالوں والی ایک نہایت پرکشش امریکی دوشیزہ ہماری طرف پیٹھ کئے' اسٹول پر ٹکی' موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس کے پہلو میں اس کا ساتھی ہاتھ میں بیئر کی بوتل پکڑے کین کی گدے دار کرسی میں دھنسا ہوا تھا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بوتل سے ایک چسکی لگا لیتا۔ امریکی دوشیزہ نے منی اسکرٹ پہنا ہوا تھا۔ اوپر عجیب ڈیزائن کی شرٹ تھی جس میں سے گردن سے نیچے آدھی پشت اور کمر واضح طور پر برہنہ نظر آ رہی تھی۔ اس کی گلابی مائل سفید جلد اتنی ملائم تھی کہ دیکھنے والے کی نظر پھسلے۔ ہم دونوں ہی پر اس کے حسن کا سحر طاری تھا۔ کچھ دیر بعد فیتے نے عجیب حرکت کی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا اور گوری کی پیٹھ کو چھو لیا۔ کمر پر ہاتھ کا لمس محسوس کر کے وہ ذرا کسمسائی اور اپنا اسٹول تھوڑا آگے گھسیٹ لیا۔ فیتے نے بھی اپنی کرسی آگے کھسکا لی۔ گوری یہ بھانپ کر گردن موڑ کر مسکرائی مگر کہا کچھ نہیں۔ فیتے کا حوصلہ مزید بڑھا۔ اب وہ اس کی کمر پر نہایت آہستگی سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ میوزک کے شور اور ہلے گلے کے ماحول میں سوائے میرے' کوئی اس جانب متوجہ نہیں تھا۔ میں اندر سے ڈر رہا تھا کہ گوری مشتعل ہو گئی تو ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو گا۔ مگر میں نے گوری کے بدن میں کسمساہٹ اور ہلکا ارتعاش محسوس کیا۔ بظاہر وہ مساس انجوائے کرنے لگی تھی۔ رفتہ رفتہ فیتے کے جسم میں بھی جوار بھاٹے کی سی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ اس کی سانس تیز اور چہرہ متغیر ہو رہا تھا۔ دو تین منٹ بعد اس کے منہ سے ہلکی سی سسکاری نکلی اور ہاتھ ساکن ہو گیا۔ قدر توقف کے بعد وہ خجل سا ہو کر اٹھا' بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کھڑی کر کے مجھے واش روم جانے کا شارہ کیا اور باہر نکل گیا۔ گوری کے ساتھی کو کچھ کچھ شبہ ہو چکا تھا' اس نے

گھور کر ہماری طرف دیکھا اور گوری سے پوچھا: 'اینی تھنگ رانگ؟'' (کیا کوئی مسئلہ ہے؟)

گوری نے آہستگی سے کچھ کہا جو میرے پلے نہیں پڑا۔ گورے نے میری طرف منہ کر کے تیز لہجے میں پوچھا:

''وائی آر یو ٹیزنگ مائی گرل فرینڈ؟'' (تم میری دوست کو تنگ کیوں کر رہے ہو؟)

گوری نے جلدی سے مداخلت کی:

''ناٹ دس مین۔۔'' (یہ آدمی نہیں۔)

گوری کی کلین چٹ نے میری گلوخلاصی تو کروادی مگر اب میں فیتے کے لئے فکرمند تھا۔ اس کا یہ جرم بظاہر ناقابل معافی معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی نالائق مانجھی کی مانند گوری کی کشتی طوفان میں چھوڑ کر' خود کنارے جا لگا تھا۔

میں نے معذرت خواہانہ انداز میں گوری سے کہا:

''یقین کرو' میرا دوست سرتاپا جنٹل مین ہے۔ نئے سال کی خوشی میں تمہارے دوست کی طرح وہ بھی ذرا ترنگ میں تھا۔ اس لئے تم جیسی حسین لڑکی کو دیکھ کر جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا۔ تم اسے نوجوان سمجھ کر معاف کر دو۔۔''

میری بات سن کر گوری کو ہنسی آ گئی۔ اس نے اپنے دوست کی طرف سفارشی نظروں سے دیکھا تو وہ خاموش ہو گیا۔

میں موقع پا کر وہاں سے کھسکا اور لابی میں جا کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر بعد فیتا باتھ روم سے نکلا تو میں نے اس کا بازو پکڑا اور باہر چلنے کو کہا۔ ساری بات سننے کے باوجود اسے معاملے کی سنگینی کا احساس نہیں تھا۔ ضد کرنے لگا کہ واپس ہال میں جانا ہے۔ بڑی مشکل سے میں اسے کلب سے باہر لایا۔

اس واقعہ کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ فیتا سدرہ نامی ایک کشمیری لڑکی پر عاشق ہو گیا اور عاشق بھی ایسا کہ جانو مجنوں کی روح اس میں حلول کر گئی ہے۔ انسانی نفسیات کی بوالعجبی ملاحظہ ہو' نارسائی کو کیسے چور دروازے سجھاتی ہے۔ ریلوے گارڈ کی بلوریں آنکھوں اور سنہرے بالوں والی گوری چٹی لڑکی' اس گوری سے مشابہت رکھتی تھی جو سال نو کی تقریب میں فیتے کے جذبات برانگیختہ کرنے کا باعث بنی تھی۔

فیتا چھٹی کے وقت سی بی کالج کے گیٹ پر پایا جاتا۔ سدرہ دیگر طالبات کے سنگ تانگے میں سوار ہوتی تو موٹر سائیکل پیچھے لگا لیتا اور باحفاظت گھر پہنچا کر واپس آتا۔ شام کے وقت وہ بینک روڈ کے آخری سرے پر واقع ریلوے کوارٹروں کے سامنے' فروٹ کی دکانوں پر آم' کیلے اور خربوزے کے بھاؤ پوچھتا دکھائی

دیتا۔ لڑکیاں تاڑ گئی تھیں کہ سدرہ ہی اس کی نگاہوں کا مرکز ہے۔ جونہی اس پر نگاہ پڑتی' وہ کہنیاں مار کر سدرہ کو متوجہ کرتیں اور اس سے میٹھے میٹھے مذاق کرتیں۔ رفتہ رفتہ سدرہ کے دل میں بھی محبت کی کونپل پھوٹ پڑی۔

کالج سے واپس آ کر سدرہ گھر سے بہت کم باہر نکلتی تھی۔ شاپنگ پر جانا ہوتا تو والدہ ساتھ ہوتی یا چھوٹا بھائی۔ اس کا والد سخت گیر آدمی تھا۔ وہ اکثر تلقین کرتا کہ زمانہ برا ہے۔ جوان بچیوں کو اکیلے بازار نہیں جانا چاہئے۔ لوفر لفنگے تاک میں رہتے ہیں۔ تمام تر سختی کے باوصف ایک شام دونوں کو ملاقات کا موقع مل ہی گیا۔ اس کا اہتمام سدرہ کی ایک تیز طرار سہیلی نے کیا تھا جو کسی طرح اس کی والدہ سے اجازت لے کر اسے شاپنگ کے بہانے نزدیکی چائنیز ریستوران میں لے آئی تھی۔ دونوں میں روایتی عہد و پیمان ہوئے۔ ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی گئیں۔ فیتے نے اسے پرفیوم کا تحفہ دیا۔ سدرہ نے سادگی سے کہا:

''مجھے تو کوئی تحفہ خریدنے کا موقع ہی نہیں ملا۔''

فیتے نے جذباتی انداز میں کہا:

''تم ملنے چلی آئیں' میرے لئے اس ملاقات سے بڑا تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے؟''

یہ اور بہت سی دیگر باتیں مجھے فیتے نے خود بتائی تھیں جب میں اکیڈمی سے ویک اینڈ گزارنے گھر آیا تھا۔

''میں سدرہ کے بغیر ایک پل نہیں گزار سکتا۔ میرے بس میں ہو تو فوراً سے پہلے اس سے شادی کر لوں۔''

اس کا چہرہ جذبات کی شدت سے تمتما رہا تھا۔

''اتنی جلدی تمہاری اس سے شادی کیسے ہو سکتی ہے؟ ابھی تم نے گریجویشن بھی مکمل نہیں کی۔ ملازمت پر لگو گے یا کوئی کاروبار سیٹ کرو گے تو اس کا ہاتھ مانگنے کے قابل ہو گے۔''

''کہتے تو تم ٹھیک ہو' مگر مجھ سے اتنا انتظار نہیں ہو گا۔ یار کیا بتاؤں واقعی اس کے بغیر ایک منٹ مجھے ایک صدی کے برابر لگتا ہے۔''

اس ملاقات کے لگ بھگ ایک ماہ بعد مجھے خبر ملی کہ فیتا کہیں غائب ہو گیا ہے۔ پولیس اس کی تلاش میں ہے۔ اس پر الزام تھا کہ وہ رات کے وقت ایک ریلوے کوارٹر کی دیوار پھاند کر چوری کی نیت سے اندر کود اتھا' مگر مکینوں کی آنکھ کھل گئی۔ چور چور کا شور مچا تو راہ فرار اختیار کی۔ لیکن بھاگتے ہوئے اس کا سٹوڈنٹ کارڈ جو کالج کی طرف سے ملا تھا' وہیں گر گیا۔ یوں اس کی شناخت ہو گئی۔۔

مگر مجھے اس کہانی پر یقین نہیں آیا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ فیتا رات کی تاریکی میں چوری چھپے سدرہ سے ملنے گیا تھا۔ ہفتے کی ایک شام میں اکیڈمی کی لائبریری میں بیٹھا تھا کہ ڈیوٹی ویٹر نے آ کر اطلاع دی:

''صاب جی تساں نے گیسٹ آئے ان۔'' (سر آپ کے مہمان آئے ہیں۔)

میں نے اس کے ہاتھ سے چٹ پکڑی۔ مہمان کے خانے میں توفیق احمد لکھا تھا۔

میں اکیڈمی کے کیفے ٹیریا پہنچا۔ سامنے صوفے پر فیتا میرا منتظر تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ایک نعرہ مستانہ لگایا اور اٹھ کر بغل گیر ہو گیا۔ کیفے میں موجود کئی سینئر کیڈٹ مڑ مڑ کر ہمیں دیکھنے لگے۔ میں نے چائے سموسے کا آرڈر دیا۔ فیتے نے بتایا کہ وہ پولیس سے چھپ کر ایبٹ آباد میں اپنے ماموں کے گھر رہ رہا ہے' جو بلوچ سینٹر میں صوبیدار میجر ہیں۔

''میں جلد ہی واپس چلا جاؤں گا۔ ماموں نے ایک کرنل صاحب کے توسط سے ریلوے کے بڑے افسر کی سفارش ڈلوائی ہے اور پولیس کی مٹھی بھی گرم کی ہے۔ معاملہ رفع دفع ہو گیا ہے۔''

اس نے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''سدرہ کے گھر کی دیوار کیوں پھاندی تھی؟'' میں نے سوال کیا۔

''اس سے ملنے کے لئے۔ وہ لوگ گرمیوں میں صحن میں نصب پنکھے کے نیچے سوتے تھے۔ اس رات اس کا باپ ڈیوٹی پر تھا' اس لئے میں نے اسے بتا دیا کہ ملنے آؤں گا۔ اس کی ماں اور چھوٹا بھائی ایک چارپائی پر گہری نیند سو رہے تھے۔ دوسری چارپائی پر جو قدرے ہٹ کر برآمدے کے قریب بچھی تھی' سدرہ جاگتے ہوئے میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں دبے پاؤں چلتا ہوا سدرہ تک پہنچا۔ ابھی ہم نے سرگوشیوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت بھرے چند کلمات ہی ادا کئے تھے کہ ایک بلی نے رنگ میں بھنگ ڈال دی۔۔''

''بلی نے؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

''ہاں ایک حرام خور بلی نے۔'' اس نے یوں دانت کچکچائے جیسے خیال ہی خیال میں اس بلی کو کچا چبا رہا ہو۔

''پنکھے کے پول اور برآمدے کے ستون کے درمیان تار پر چھینکا لٹکا ہوا تھا۔ اس میں دودھ کی دیگچی تھی۔ بلی دودھ پینے کے لئے چھکے پر کودی تو تار ٹوٹ گئی اور چھینکا دیگچی سمیت چھنا کے سے پکی اینٹوں کے فرش پر جا گرا۔ موٹی تازی بلی میرے سامنے بھاگ کر دیوار پر چڑھی اور دوسری طرف کود گئی۔ چھینکا اور دیگچی گرنے سے سدرہ کی ماں کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بدحواس ہو کر چیخنے چلانے لگی۔ چھوٹا بھائی بھی چیخیں مارنے لگا۔ میں نے دڑکی لگائی اور دیوار پھلانگ کر پرلی طرف کود گیا۔ پیچھے چور' چور کا شور مچ گیا۔''

میں نے کہا:

''تم تو کہتے تھے کہ سدرہ سے شادی کرنی ہے۔ پھر ایسی حرکت کیوں کی؟ اب کس منہ سے رشتہ مانگو گے' خوامخواہ اپنا کیس خراب کر لیا۔''

''بس یار۔ کیا کروں۔ کبھی کبھار میری عقل بالکل ماری جاتی ہے۔ یاد کرو وہ گوری والا واقعہ۔۔!'' وہ ہنسا۔

''بھئی وہ گورے تھے۔ ان سے معافی مل گئی' مگر ہمارے لوگ تو ایسی باتوں کو عزت اور غیرت کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔''

''یار ڈراؤ تو نہیں۔''

''میں ایک سماجی حقیقت بیان کر رہا ہوں۔''

''اللہ خیر کرے گا۔'' وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

اس ملاقات کے بعد وہ واپس پنڈی چلا گیا۔

تین مہینے بعد میں ٹرم بریک پر گیا تو ایک افسوس ناک خبر میری منتظر تھی۔

فیتا پاگل ہو چکا تھا!

میں اسے دیکھنے ملٹری اسپتال کے ذہنی امراض کے وارڈ گیا۔ وہ باہر لان میں نیلے کرتے پاجامے میں ملبوس ایک سنگی بینچ پر بیٹھا خلا میں گھور رہا تھا۔ میں نے سلام کیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس نے اپنا ہاتھ ڈھیلے ڈھالے انداز میں میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اس کا ہاتھ انتہائی سرد تھا۔

اس کی خالی خالی نظریں بتا رہی تھیں کہ وہ مجھے نہیں پہچانتا۔ اس کی والدہ پاس ہی بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر رونے لگیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ سدرہ کے باپ نے اس کا نکاح گاؤں میں مقیم اپنے اجڈ اور گنوار بھتیجے سے زبردستی پڑھوا کر اس کی رخصتی کر دی تھی۔ شکی مزاج شوہر اسے بدکرداری کے طعنے دیتا اور مارتا پیٹتا رہتا۔ دل برداشتہ سدرہ نے چوہے مار گولیاں کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

''میرا بیٹا سدرہ کی شادی اور موت کا صدمہ نہیں سہہ سکا۔'' وہ سسکتے ہوئے بولیں ''بیچارے کا دماغ الٹ گیا۔''

میں قریب بیٹھ کر انہیں دم دلاسا دینے لگا۔

اسی اثناء میں ایک بلی کہیں سے نمودار ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی فیتا چیخا' بینچ سے اٹھ کر زمین سے پتھر اٹھایا اور بلی کو مارنے دوڑا۔ اس کے منہ سے گالیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی:

''بلی کدنی' تیری بہن کو لات! تیری ماں کو لات! تو ہی تھی مروانے والی۔ بہن کلہوڑی' بیڈ کریکٹر۔''

◀◀ ● ▶▶

H. No. 263, St 23 Sec C
Askari 14, Rawalpindi, Pakistan

● عشرت ظہیر

محبت بھی بدلتی ہے.....

وہ اوپر ٹیرس پر پہنچا اور اس نے دیکھا،..... ایک لڑکی کھلی چھت کی منڈیر پر چڑھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ تیزی کے ساتھ اس کی طرف لپکا، اس سے قبل کہ وہ خود کو نیچے گرا دیتی، اس نے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

چند ثانئے کے بعد لڑکی اس کے قدموں کے پاس زمین پر بیٹھی، اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے رو رہی تھی۔

وہ خاموش کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔

کئی حیران کن لمحے گزر گئے اور وہ روتی رہی۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

پھر فہد نے اُسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا۔

''اب ہم نیچے چل رہے ہیں۔ خود پر قابو رکھو، ورنہ تماشہ بن جاؤ گی۔''

بمشکل اس نے خود پر قابو پایا۔ فہد اسے ساتھ لے کر دھیرے دھیرے زینہ اترنے لگا۔ سیڑھیاں اتر کر وہ بلڈنگ سے باہر آئے، اور پارکنگ شیڈ کی طرف بڑھے۔ اپنی گاڑی کے پاس پہنچ کر، اگلی سیٹ کا گیٹ کھولتے ہوئے فہد نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا، وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی روانہ ہوئی۔

کچھ دیر وہ خاموش رہی۔ پھر اس نے گلوگیر آواز میں کہا ''آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟''

''پولیس اسٹیشن۔ میں پولیس آفیسر ہوں۔ آپ نے خودکشی کرنے کی کوشش کی ہے..... یہ میرے فرض منصبی میں داخل ہے۔''

دفعتاً وہ پھر رونے لگی۔

فہد چند لمحے کچھ سوچتا رہا، پھر اس نے کہا۔

''اچھا، ایسا کرتے ہیں، یہاں سے تھوڑی دوری پر ایک اچھا ریسٹورنٹ ہے، وہاں چلتے ہیں، کافی پیتے ہیں، پھر طے کریں گے، کیا کرنا ہے۔''

وہ خاموش رہی۔

گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے، اس نے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے۔''

''نورس۔''

''پیارا نام ہے، بالکل تمہاری طرح۔''

اس نے فہد کی طرح طرف دیکھا، بولی کچھ بھی نہیں۔

ٹریفک کے اژدہام میں سبک رفتاری سے سڑک پر گاڑی دوڑتی رہی۔ اس کی ڈرائیونگ میں سکون اور طمانیت کا انوکھا اور دلکش انداز جھلک رہا تھا۔

''نورس.....'' فہد نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''تم دیکھ رہی ہو، سڑک پر بھاگتی دوڑتی گاڑیاں..... بائیک..... اور فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے لوگ..... یہ اژدہام..... یہ ٹریفک کانسٹیبل..... یہ زندگی کی ہلچل..... زندگی کتنی خوبصورت ہے..... لیکن تم نے اس زندگی کو ختم کرنے کا جانے کیوں فیصلہ کیا.....''

اچانک اس نے گاڑی سائیڈ کر کے روک دی اور کہا۔

''یہ چلڈرن پارک ہے۔ چلو کچھ دیر یہاں، چہل قدمی کرتے ہیں۔''

نورس نے اسے حیرت سے دیکھا اور خاموش رہی۔

پھر وہ گاڑی سے اتر کر پارک میں داخل ہوئے۔ وہاں انہوں نے بچوں کے ہنگامے کو دیکھا اور محسوس کیا۔ کچھ بچے سلائیڈر بورڈ پر پھسل رہے تھے۔ کچھ بچے، ایک طرف باسکٹ بال کے کھیل میں مصروف تھے۔ کچھ یونہی ایک دوسرے کے آگے پیچھے بھاگ دوڑ اور اچھل کود میں مشغول تھے۔ ان بچوں کے مختلف گروپس اور ان کی حرکتوں کو دیکھ کر اس نے سوچا۔

زندگی ہمیشہ رواں دواں رہتی ہے۔

نورس نے استعجاب کے ساتھ فہد کے چہرے پر ایک گہری نظر ڈالی۔ فہد نے محسوس کیا کہ نورس کے چہرے پر اب پہلے جیسا تناؤ نہیں رہا۔ وہ دھیرے دھیرے اس طرف بڑھا، جہاں ایک غبارہ والا کھڑا تھا۔ اس نے بہت سارے غبارے خریدے، کچھ غبارے، اس نے پاس کھڑے بچوں کے ہاتھوں میں پکڑا دئے، اور چند غبارے فضا میں چھوڑ دئے..... اور باقی اس نے نورس کی طرف بڑھا دیئے۔ وہ مبہوت تھی۔ پھر اس نے فہد کے اشارے پر، ان غباروں کو اضطراری طور پر ہوا میں چھوڑ دیا۔ چند لمحے فضا میں اڑتے غباروں کو وہ دیکھتے رہے۔ پھر پارک کے بڑے گیٹ سے باہر آ گئے اور گاڑی میں بیٹھ کر چل پڑے۔

تھوڑی دیر بعد وہ ریسٹورنٹ کے ایک گوشے میں بیٹھے تھے۔

فہد نے پوچھا۔

''نورس۔کیا تم اس ریسٹورنٹ میں کبھی پہلے آئی ہو۔''

''نہیں''

''یہ ساؤتھ انڈین ڈیشیز کے لیے مشہور ہے.....اڈلی.....ڈوسا.....سانبھر بڑا.....تم کیا لوگی؟''

''نہیں.....مجھے خواہش نہیں۔''

''میں کافی لوں گا۔تمہارے لئے آئس کریم منگاؤں؟''

نورس نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

فہد اٹھ کر کاؤنٹر پر چلا گیا۔اس نے ٹوکن لیا اور بیرا کے حوالہ کر کے واپس آ کر بیٹھ گیا۔

ریسٹورنٹ میں مدھم سروں میں موسیقی کی آواز گونج رہی تھی.....اس موسیقی کی لے کے ساتھ، اتنے سارے لوگوں کی ایک ساتھ باتیں کرنے کی آوازیں شامل ہو کر، ایک عجیب سی، لیکن خوشگوار بھنبھناہٹ فضا میں گھلی ہوئی تھی۔یہ آوازیں.....اور کھانے کی اشیاء کی اشتہا انگیز مہک فضا میں محلول ہو رہی تھی۔گویا یہ ایک انوکھی دنیا تھی، اور زندگی کا بے حد حسین پڑاؤ ہے جیسے.....یہاں وقت ٹھہر سا گیا تھا۔

اسی وقت بیرے نے ان کے ٹیبل پر کافی اور آئس کریم لا کر سجا دیا۔

فہد نے دھیرے سے اس کی طرف آئس کریم بڑھایا اور کافی کا بڑا سا مگ اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا۔

وہ کافی سے شغل کرتا رہا، اور آئس کریم پگھلتی رہی۔

اس نے چند لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔

''ہاں تو یہ معاملہ کیا تھا؟''

وہ خاموش رہی۔

''میں نے پوچھا، تم نے یہ قدم کیوں اٹھایا؟'' اس نے استفسار کیا۔

چند ثانئے کی خاموشی کے بعد نورس گویا ہوئی۔

''مجھے لگا، اس زندگی کی بساط میں ہار گئی ہوں۔''

''پوری بات بتاؤ۔''

وہ خاموش رہی۔

''تم رہتی کہاں ہو؟''

''ثمن پورا میں۔''

''اوہ.....تو تم نے اتنی دور سے یہاں آ کر جان دینے کی سوچی.....خوب.....''

پھر اس نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے نورس کو دیکھا۔جس کے سامنے رکھی آئس کریم پگھل رہی تھی۔وہ سوچنے لگا' یہ لڑکی کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔اس کے انداز میں ایٹی کیٹ اور کلچر کی دلکشی ہے۔

پھر ایک طویل اور تکلیف دہ خاموشی طاری ہو گئی۔وہ کافی کی چسکیاں لیتا رہا، اور اب نورس وقفے وقفے سے آئس کریم سے شغل کر رہی تھی.....معاً فہد نے خاموشی توڑتے ہو کہا۔

''تو آپ نے کیا سوچا؟''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔''

''تو پھر چلیں۔''

''کہاں؟''

''آپ کو، آپ کے گھر چھوڑ دیتا ہوں۔اکیلے تو جانے نہیں دوں گا۔''

وہ ریسٹورنٹ سے نکل کر باہر آئے، گاڑی میں بیٹھے اور گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔

اس وقفہ میں نورس اپنے آپ پر قابو پا چکی تھی۔فہد کی شخصیت، اور اس کے ڈرائیونگ کے انداز، اور اس کے لب ولہجہ کی متانت، اور نرم گوئی نے اس کے تناؤ اور ڈیپریشن کو کافی حد تک زائل کر دیا تھا۔کچھ دیر بعد، وہ نورس کے مکان پر پہنچ گئے، یہ ایک بنگلہ نما خوبصورت عمارت تھی۔پائیں باغ کی تراش خراش، سجاوٹ ان کی خوش سلیقگی اور بہترین ذوق کی گواہ تھی۔گاڑی پارک کرتے کرتے فہد نے کہا۔

اتنی خوبصورت اور دل پذیر جگہ چھوڑ کر تم نے جانے کیوں انجانی.....ان دیکھی دنیا میں جانا پسند کیا۔

ڈرائینگ روم میں نورس کی ممی سے فہد کا سامنا ہو گیا۔

انہوں نے نورس کو دیکھا اور اس کی سراسیمگی کو محسوس کیا، اور ایک باوردی پولیس آفیسر.....

انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

''کچھ ہوا ہے کیا؟''

''نہیں۔کچھ نہیں۔یہ سلامت ہیں۔'' فہد نے دھیرے سے کہا۔

''آپ حوصلہ رکھیں ایک پریشانی ٹل گئی۔دراصل انہوں نے ڈسٹرکٹ کورٹ کی نئی عمارت کی پانچویں منزل سے خود کو گرا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔''

''اوہ کریزی.....'' انہوں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ اور دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا کر دھم سے صوفے پر گر گئیں۔

کئی تکلیف دہ لمحے گزر گئے۔

چند دنوں کے بعد فہد پھر نورس کے بنگلے میں داخل ہوا۔ پہلی دفعہ ہال کی زیبائش اس کے شعور سے پرے رہی۔ آج اس نے غور کیا۔ اور ڈرائینگ روم کی سجاوٹ کو دیکھا۔ یہ وال ٹو وال کارپیٹ سے مزین تھا۔ دیواروں پر دیدہ زیب پینٹنگس آویزاں تھیں..... ابھی وہ ایک پینٹنگ کے رنگ وروغن کے پس منظر میں جھلکتی اور بکھری ہوئی لکیروں میں آرٹسٹ کی اڑان پر غور کر رہا تھا کہ نورس ڈرائینگ روم میں داخل ہوئی۔

''ہیلو''

''ہیلو..... کیسی ہیں آپ؟'' اس نے نورس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھی ہوں۔ آپ بیٹھیں، مما ابھی آتی ہیں۔''

نورس بھی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ سوچنے لگی یہ پولیس والوں کی طرح کھڑوس تو نہیں ہے۔ اس کی شائستگی اور نرم گوئی، اس کی شخصیت کو پرکشش بناتی ہے..... پہلی ملاقات کے وقت حالات سنگین تھے، اس وقت اُسے نورس نے گویا دیکھا ہی نہیں۔ اس وقت تو وہ محض ایک پولیس آفیسر تھا..... اور اب، ایک پروقار شخص..... جادوئی شخصیت کا مالک تھا ..... جس نے اس کے دماغ سے سارے نقوش کو مٹا دیا، اور اُسے ایک شیش محل بنا دیا جس میں ہر زاوئے سے اس کی تصویر نظر آ رہی ہے۔ لیکن یہ عمل غالباً یک طرفہ نہیں ہے، بلکہ اپنے طور پر وہ خود اسی ادھیڑ بن سے گزر رہا ہے۔ اور تو اور اس نے ساجد کے وجود کو یک لخت مٹا دیا، جو اس کی زندگی میں آیا تھا، اور کچھ عرصے بعد اُسے بیچ منجدھار میں اچانک چھوڑ کر چلا گیا ..... جذبوں کی ہم آہنگی کے احساس کے ساتھ وہ لاج سے شرابور ہو گئی..... گویا گلاب کی نازک اور لطیف پنکھڑیوں کو سا ری رات شبنم کے قطرے بھگوتے رہے ہوں..... اور غیر محسوس طور پر، وہ خود کو کھوتی جا رہی ہے..... اسی وقت اس کی ممی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں اور وہ اپنے بکھرتے، ریزہ ریزہ ہوتے وجود کو سمیٹ کر وہاں سے اٹھ گئی.....

''..... بیٹا، ہم پر تمہارا بڑا کرم ہے۔'' انہوں نے بیٹھتے بیٹھتے کہا۔

''نہیں ایسا نہ کہیں۔ بس یہ میرے ذریعے ہونا تھا۔''

''اچھا اپنے بارے میں بتاؤ۔''

''میں یہاں ملازمت کے سلسلے میں ہوں۔ میں نور گنج کا رہنے والا ہوں۔ یہ مضافاتی علاقہ ہے۔''

''نور گنج..... جانتی ہوں..... ہم وہیں کے ہیں..... تمہارے پاپا کیا کرتے ہیں، کیا نام ہے۔؟''

''وہ فوج میں تھے۔ ریاض الدین نام ہے۔''

''اوہ..... تو تم ریاض کے بیٹے ہو۔ میں جانتی ہوں۔ کیا اتفاق ہے۔ نورس کے پاپا بھی فوج میں تھے۔ وہ تمہارے پاپا کو جانتے ہیں۔ اکثر فوجی زندگی کے تذکرہ میں ان کا نام آتا ہے..... ان دنوں وہ ملک سے باہر ہیں۔ یہاں ہوتے تو زندگی کا ناسٹلجیا تازہ اور پرلطف ہو جاتا..... زمانہ ہوا..... ہم نے گاؤں چھوڑ دیا۔ اپنے پرائے سب چھوٹ گئے۔ اور یہاں اس شہر میں، اور شہر کے ہنگامے میں ہم نے خود کو کھو دیا..... اف..... وادیوں، گھاٹیوں اور سبزہ زاروں سے ڈھکا ہوا..... کتنا خوبصورت علاقہ تھا، ہمارا نور گنج۔''

اس انکشاف نے فہد کے لئے وہاں آنے جانے کی غیر محسوس چاہت کو اور بھی ہوا دے دی۔ اور وہ گاہے بگاہے، وہاں جانے لگا۔ لیکن نورس کے لئے، اس کی آمد و رفت ایک عجیب اور نامعلوم الجھن کی صورت تھی۔ وہ فہد کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اُسے دیکھ کر اُسے اپنا وجود پگھلتا ہوا محسوس ہوتا..... اُسے لگتا، اس کے اندر کوئی شے تیزی سے کروٹیں لے رہی ہے..... تہہ در تہہ پرتیں کھلتی جا رہی ہیں.....

وہ ٹیرس پر پڑی ایزی چیئر پر لیٹی تھی کہ ملازمہ نے آ کر اطلاع دی، فہد آئے ہیں۔

''اف..... یہ حضرت پھر نازل ہو گئے۔'' اس نے سوچا اور ملازمہ سے کہا۔

''چلو..... میں آتی ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد وہ ڈرائینگ روم میں داخل ہوئی اور فہد کی طرف دیکھ کر ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا.....

''ہیلو۔''

''ہیلو..... کیا بات ہے، چہرہ دھواں دھواں ہو رہا ہے۔''

''کچھ نہیں ٹیرس پر بیٹھے بیٹھے جھپکی آ گئی تھی۔ آپ آج وردی میں تشریف لائے ہیں؟''

''میں پولیس اسٹیشن سے ہی آ رہا ہوں۔ دراصل ہمیں خبر ملی تھی کہ اسٹار مال سے خود کو گرا کر ایک لڑکی نے خودکشی کر لی۔ اب وہ میرا ایریا تو ہے نہیں، اور وہ علاقہ بھی مخالف سمت میں ہے..... تو سوچا..... آپ کو گھر پر دیکھ کر اطمینان کر لوں..... تھینکس گاڈ..... وہ آپ نہیں.....''

نورس کے چہرے پر بل پڑ گئے۔ اس کے اندر کوئی شے تیزی سے ابلنے لگی۔ ظالم..... بیٹھا کس طرح مسکرا رہا ہے..... کھڑوس.....

غصہ اور صدمہ نے اس کی ہئیت بگاڑ دی تھی، اور اس کی زبان گنگ ہو گئی۔

اُسی وقت مما ڈرائینگ روم میں داخل ہوئیں۔

''او..... بیٹا فہد، تم کب آئے؟''

''ابھی۔ ابھی''

اچھا کیا، تم آ گئے۔ نورس تو اب تک تناؤ کے گھیرے میں ہے۔ اور میں بھی اس صدمہ سے کہاں

نکل پائی ہوں۔تم آتے ہوتو، اچھا لگتا ہے۔ بیٹا نورس.....چائے.....''

''دراصل میں کل اپنے مضافاتی گاؤں نورگنج جارہا ہوں۔ وہاں میرے کزن کا ریسپشن ہے، آپ جانتی ہیں، نورگنج کتنی خوبصورت جگہ ہے۔ پژمردگی دور کرنے میں معاون ہوگا.....آپ مناسب سمجھیں تو نورس کو ساتھ کردیں.....آپ بھی چلنا چاہیں تو ہمیں خوشی ہوگی.....'' اس نے کہا اور انویٹیشن کارڈ ان کی طرف بڑھایا۔

''اوہ.....یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔لیکن افسوس میں تو نہیں جاپاؤں گی.....چند سماجی کارکن کے ساتھ ہماری میٹنگ طے ہے.....ہاں اگر نورس جانا چاہے تو جاسکتی ہے.....''

اور یوں، اس وقت وہ فہد کے ساتھ نورگنج کے سفر پر تھی۔فہد ٹیڑھی میڑھی بل کھاتی کولتار کی سڑک پر مہارت کے ساتھ گاڑی ڈرائیو کررہا تھا۔اس کی ڈرائیونگ میں ایک طمانیت بخش سکون، محافظت اور فرحت کا احساس شامل تھا۔سڑک کی ایک جانب اونچے اونچے پہاڑوں کے سلسلے تھے اور دوسری طرف خطرناک گھاٹیاں.....کار میں بیٹھی نورس گھاٹی میں نیچے دور آخری سرے تک دیکھنے کی کوشش کررہی تھی، جہاں پیڑ پودے اور ان کی ہریالی نے ایک خوشنما منظر کو خلق کیا ہوا تھا۔قدرت کے ان نظاروں اور دلفریب فضا میں کھو کر نورس چند روز قبل کے سوہان روح اور تکلیف دہ واقعے کو فراموش کردینا چاہتی تھی مگر وہ اس کا ایسا قدم تھا، جس نے اس کے وجود کو عفریت کی طرح جکڑ رکھا تھا۔

اس نے پُراسرار گھنے جنگلوں اور خوبصورت کوہساروں کے سلسلے کو دیکھا اور سوچا، یہ سحر آگیں نظارے بھی میرے اندر لطف وانبساط کی بجائے ایک عجیب سی یاسیت اور حزن کی کیفیت طاری کئے دے رہے ہیں۔

وہ اس اذیت ناک احساس سے چھٹکارا چاہتی ہے۔کار کی اے سی بند تھی اور کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔اس نے اپنا ہاتھ باہر نکال کر فضا کی نمی کو اپنے اندر سمیٹ لینا چاہا۔کھیتوں کی بھیگی بھیگی مٹی کی سوندھی خوشبو اور آسمان کی نیلاہٹ، اس کے دل پر دستک دے رہی تھی۔ یہ زندگی بداماں کہسار اور گونجتی ہوئی سی وادیاں، اس کے وجود میں دھیرے دھیرے محلول ہونے لگی.....

پھر ایک جھٹکے سے گاڑی رک گئی۔اور معاً گاڑی کے دونوں جانب کے شیشے آہستگی سے بند ہونے لگے، اس نے اپنا ہاتھ تیزی سے اندر کرلیا، اور خشمگیں نگاہوں سے فہد کی طرف دیکھا۔کہا کچھ نہیں۔فہد نے سامنے سڑک کی طرف اشارہ کیا۔نورس نے دیکھا۔سامنے سڑک پر بندروں کا ایک قافلہ تھا۔جو جنگل کی ایک جانب سے دوسری جانب سڑک پار کرتے ہوئے جارہا تھا۔اتنے سارے بندر، اس کے رگ وپے میں سراسیمگی سی دوڑ گئی اور وہ اضطراری طور پر فہد کی طرف کھسک آئی۔ چند منٹوں تک بندروں کا قافلہ گزرتا رہا اور کار کھڑی رہی، اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔فہد نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھ گئے۔

نورس خاموشی سے اُسے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔اسٹیرنگ پر اس کے ہاتھ اس طرح حرکت کررہے تھے، گویا وہ کسی محبوب شے سے کھیل رہا ہے.....سکون، طمانیت اور محافظت کا ایک انوکھا احساس نورس کے دل میں جاں گزیں ہونے لگا.....پھر اس نے سوچا.....میں کیوں، اس کے بارے میں سوچ رہی ہوں.....اس نے اپنے خیالوں کے بہاؤ پر قابو پانے کی کوشش کی اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو بالوں میں پھنسا کر ایک جھٹکا دیا، اور دوسرے ہی لمحے، اس کے جوڑے کی شکل میں گندھے ہوئے بال کھل کر اس کے شانوں پر بکھر گئے۔

''کیوں.....کیا کوئی پریشانی ہے۔سر میں درد ہے؟'' فہد نے کہا۔''ابھی تھوڑا سفر باقی ہے۔ لیکن ہم جلد ہی ایک ڈھابے تک پہنچیں گے، وہاں چائے لیتے ہیں۔''

اس نے فہد کی طرف دیکھا، بولی ''کچھ نہیں۔''

تھوڑی دیر بعد، وہ ڈھابے میں بیٹھے چائے سپ کررہے تھے۔

پھر ایک بائیک آکر وہاں رکی۔

نورس نے دیکھا، ایک خوبصورت کپل اس بائیک سے اتر کر ایک گوشے کے ٹیبل کی طرف بڑھنے لگا۔اچانک اس کے اندر اُداسی چھانے لگی، اس نے سوچا، اس کے اندر یہ کوئی ویران اور خاموش اسپاٹ ہے، جو اکثر ابھر آتا ہے۔نووارد کپل، گوشے میں پڑی چیئر پر بیٹھ چکے تھے اور ایک دوسرے کو چاہت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے محوِ گفتگو تھے۔وہ محبت میں سرشار، دنیا ومافیہا سے بے خبر تھے۔نورس نے سوچا یہ محبت کیا شے ہے؟ یہ کتنی لذت انگیز ہے؟ لطف وانبساط، اس کپل کے ہر انداز سے ظاہر تھا۔لیکن یہ عجیب کیفیتوں میں گھلی.....یہ محبت بڑی اذیت ناک شے ہے.....اس کی لذت اور انبساط ایک سراب ہے.....یہ کل ختم ہوجائے گی، اور یہ لڑکی تنہائیوں کے غار میں پڑی سسکتی رہے گی.....کیا میں اسے فریب زیست سے آگاہ کردوں؟ پھر اُسے لگا یہ سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کوئی اجنبی نہ تھی یہ تو وہ خود تھی.....اس کے رگ وپے میں چاہت اور امنگوں کے پرندے قلانچے بھرنے لگے.....پھر دوسرے ہی لمحہ اُسے لگا، اس کے خوابوں، آرزوؤں اور امنگوں کی قلانچیں بھرتے پرندے کو کسی نے قید کرلیا ہے۔کیسی پرواز؟ وہ ریت کے ڈھیر پر کھڑی ہے.....

''کیا سوچ رہی ہو'' اچانک فہد نے اُسے دیکھتے ہوئے کیا۔

''تھنگ میچ، ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے؟''

نورگنج پہنچنے کے بعد فہد نے اسے اپنی کزنس سے متعارف کرایا اور کہا۔

''انہیں ان کا کمرہ دکھاؤ'' اور پھر نورس سے مخاطب ہوکر کہا۔''تیار ہوکر آؤ، ریسپشن پارٹی میں چلتے ہیں۔''

جس وقت وہ ریسپشن ہال میں داخل ہوئے، پارٹی پورے عروج پر تھی۔ہال میں لوگ الگ

الگ گروپس میں بٹے ہوئے خوش گپیاں کر رہے تھے۔لوگوں کے شور وغل،طرح طرح کی خوشبوؤں کی لپٹیں،اور جگمگاتے جھلملاتے ملبوسات میں سجے ہوئے جسم.....ایک عجیب سحر آگیں ماحول تھا.....نورس نے محسوس کیا،شہر سے دور،اس مضافاتی علاقہ میں،یہ دلکش پارٹی.....یہ اپنے آپ میں ایک انوکھی بات تھی۔ یہ کوئی کارپوریٹ پارٹی تو نہ تھی،مگر کارپوریٹ پارٹیوں کے سے ٹھسے اور نخرے کا انداز نمایاں تھا۔تھوڑی ہی دیر میں نورس،افسردگی اور یاسیت کے دائرے سے نکل آئی اور پوری طرح پارٹی کے رنگ میں گھل گئی۔

فہد کی کوشش تھی کہ وہ نورس کے قریب رہے۔لیکن نورس.....ایسے ہر موقع پر،اس سے پرے کھسک جاتی،نورس کو فہد کی قربت ایک عجیب سی ہلچل اور اتھل پتھل سے ہمکنار کرتی۔لمحہ بہ لمحہ اس کے خیالات،فہد کے بارے میں بدلتے جاتے تھے.....اُسے لگتا،یہ کھڑوس آدمی اس کا پیچھا کیوں کئے جاتا ہے؟اگلے ہی ساعت وہ سوچتی،اس کی شخصیت کتنی جاذبِ نظر اور پروقار ہے۔اس کے ٹھہر ٹھہر کر بولنے کا انداز کتنا دلنشیں ہے۔یہ بے تکلفی پر آمادہ نظر نہیں آتا،مگر شائستگی اور تہذیب کی حدوں میں گفتگو کا سلیقہ مخاطب کو مسحور کر دیتا ہے۔

پھر وہ ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے۔یہاں مدھم روشنی میں،اشتہا انگیز خوشبوؤں کا جال سا پھیلا تھا۔

نورس نے چاروں طرف دیکھا،خوش سلیقگی اور ہنرمندی کے ساتھ کھانے کی اشیا ہال کے چاروں طرف اسٹال بنا کر سجائی گئی تھیں۔ایک طرف کٹے ہوئے پھل،سینڈوچ،نوڈلس اس سے متصل دوسری طرف،چاٹ،گول گپّا.....پھر کولڈ ڈرنکس،آئس کریم.....چائے،کافی.....اور جانے کیا کیا.....

ان اسٹالس کے اُپوزٹ پر اٹھا.....باقرخوانی.....بریانی.....کباب،کوفتہ،قورمہ.....تنجن.....اور بہت کچھ.....دور ایک گوشے میں موٹے موٹے حروف میں لکھا دکھائی دے رہا تھا.....ویج..... جانے وہاں،کیا کیا سجا تھا.....اور لوگوں کو اشتہا اور ذائقہ سے لطف اٹھانے پر مائل کر رہا تھا.....

اچانک فہد اس کے قریب آکر بولا۔

''تم یوں گھوم رہی ہو.....کچھ لیتی کیوں نہیں۔''

''ہاں،سوچ رہی ہوں،کیا لوں؟''

فہد نے پاس ہی کے ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''پلیز ہیئر اے سیٹ۔''میں تمہارے لئے کچھ لاتا ہوں۔''

نورس بیٹھ گئی،اور فہد کو تیزی سے کاؤنٹر طرف جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔اس کی ایک ایک رگ چاہت میں بدلتی جا رہی تھی۔اس کے اندر سرمئی دھندسی گھلتی جا رہی تھی۔کیا اس کے خوابوں،آرزوؤں اور امنگوں کو پھر پر لگ گئے؟ ایک بار اس کا اعتبار ریزہ ریزہ ہو چکا تھا.....پھر وہ کیوں،اس فضائے بسیط میں اڑنے کی چاہت پال رہی ہے؟

اچانک فہد ہاتھ میں پلیٹ لئے اس کے سامنے آگیا۔اس نے دیکھا،اس کے پلیٹ میں طرح طرح کی چیزیں سجی ہیں۔اس نے ہاٹ اینڈ کرسپی اٹھالیا اور فہد کو غور سے دیکھنے لگی۔یہ میرے وجود پر کیوں چھا گیا ہے.....اف،میں اس سے بھاگ نہیں سکتی .....''دفعتاً ایک لڑکی،اپنی تمام تر رعنائیوں اور شوخیوں کے ساتھ اس کے ٹیبل کے پاس آکر رکی اور فہد کو مخاطب کر کے بولی۔

''ہائے ہینڈسم۔''

''ہائے.....ہاؤ آر یو؟''

''آبسولیٹلی فائن۔''

پھر اس نے نورس کی طرف دیکھا۔فہد نے ان کا تعارف کرایا۔اس نے نورس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کہا۔

''ہائے۔''

''ہائے۔''

وہ نورس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دیر تک لئے رہی۔پھر دھیرے سے کہا۔

''آئی ایم گلیڈ ٹو میٹ یو۔''

نورس کچھ نہ کہہ سکی۔صرف مسکرا کر رہ گئی۔پھر اچانک نو وارد لڑکی نے فہد کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اتنے دنوں بعد پکڑ میں آئے ہو.....چلو.....تمہارے ساتھ گزرے وقتوں کی یاد تازہ کرتی ہوں۔''

پھر اس نے نورس کی طرف دیکھا،مسکرائی اور دھیرے سے اپنے سر کو خم کیا اور کہا۔

''سوری.....ہم بہت دنوں بعد ملے ہیں.....اس لئے.....''پھر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر فہد کو وہاں سے لے کر چلی گئی۔

اس کے قریب ہی ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی ساتھ آئے اور ساتھ بیٹھ گئے،جو لباس انداز اور اپنی باتوں سے کسی کالج یا یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹ اور تقاضائے عمر کے لحاظ سے ایک جان دو قالب معلوم ہوتے تھے۔وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے کھو سے گئے تھے۔گویا وہاں ان کے سوا اور کچھ نہ ہو.....اتھاہ سناٹا..... جیسے وقت ٹھہر گیا ہو.....اور وہ.....اس پل کو پوری طرح جی رہے تھے۔

.....اور نورس سوچ رہی تھی محبت میں کوئی ماضی ہوتا ہے نہ مستقبل،حال کے چند لمحے،چند دن اور چند سال محض!

محبت بھی بدلتی ہے،شبستانوں کا کیا ہوگا.....!

◀◀ ● ▶▶

"MALAZ"
New Colony, New Karimganj
Gaya -823001(Bihar)Cell No. 9801527481

● جوادحسنین بشر

بدن میں ڈھلا چاند

وہ میرے سامنے بیٹھی ہے، اُس کا ڈھلا ڈھلا اور روشن تر چہرہ میری نگاہوں کو تھامے ہوئے ہے، میں فرش پر گھٹنے ٹیکے، اُس کی نرم ملائم گدیلی رانوں پر ہاتھ رکھے، اُس کے روبرو ہوں، میں نے ذرا دیر کو کھلی اور کشادہ کھڑکی پر نظر دوڑائی ہے، پورے چاند کی رات اپنے لبوں پر ایک دلنواز مسکان لیے کمرے میں جھانک رہی ہے، اور نرم لطیف اور تازہ ہَوا کے جھونکے، میری جان کی مہکتی سانسوں کو اپنے پَروں پر اٹھائے کمرے میں دیوانہ وار رقصاں ہیں اور ماحول کو معطر کیے دے رہے ہیں،

''منظر کس قدر رومانوی ہے''، میں نے کھڑکی سے نظریں ہٹائے بنا اسے مخاطب کیا ہے، وہ میرے معنی خیز لہجے پر، پوری طرح سے مسکرائی ہے، اُس کے دہن سے موتی اڑ کر، دیکھتے ہی دیکھتے، باہر چاند کے آس پاس، سرمئی مدھم نیلگوں رات کے پردے پر ستارے بن کر چمکنے دمکنے لگیں ہیں۔

میں نے پھر سے اپنی بے تاب نگاہیں اُس کے مسکراتے شفاف گلابی چہرے پر پھیلا دی ہیں، اُس پر سیاہ رنگ کس قدر جچتا ہے، پہلی بار جب میں نے اُسے دیکھا تھا تو وہ سیاہ لباس ہی پہنے ہوئے تھی۔

''اور سرخ رنگ بھی؟'' وہ ایک دم مدھر آواز میں بولی، جیسے اُس نے میرے دل کی بات سُن لی ہو، وہ پھر بولی۔

''ابھی کچھ دیر بعد آپ مجھے سرخ رنگ ہی پہنانے والے ہیں ناں؟''

''میں اپنے ہاتھوں سے پہناؤں گا۔'' میں نے تصدیق کی۔

اور پھر میرے ہاتھ پھسلتے ہوئے، اُس کی نرم ملائم گدیلی رانوں کے آغاز پر ٹھہر گئے ہیں، چاند سیاہ بادلوں کے پیرہن میں چھپا ہوا ہے، اچانک چاند سرمئی مدھم نیلگوں رات کے پردے سے اتر کر میری جان کے بدن میں ڈھل گیا ہے، رات کے پردے پر صرف اُس کے داغ رہ گئے ہیں، اب گویا بدن میں ڈھلا چاند میرے سامنے بیٹھا ہے، بے داغ، سیاہ بادلوں کے پیرہن میں ملبوس، اس فرق کے ساتھ کہ اب اُس کے گرداگرد چاندنی کے ہالے میں ہلکا گلابی رنگ بھی نمایاں ہے۔

میری انگلیاں دونوں جانب سے، سیاہ پیرہن کے تکونی خیمہ دروازوں سے اندر کھسک رہی ہیں، اور پیرہن کسی پردے کی طرح اوپر اور اوپر اٹھتا چلا جا رہا ہے، بدن میں ڈھلے چاند کا اوپری نصف اپنی تمام تر شفافیت، بے داغی اور پُرنوری سمیت میری نگاہوں پر آشکار ہو رہا ہے۔ بدن کے لطیف حاشیوں کے حصار میں، سڈول پن میں ڈوبے، تمام نشیب، تمام فراز، ہمیشہ کی طرح میری نگاہوں کو خیرہ کیے دے رہے ہیں۔

اور پھر زیریں نصف، بادلوں کے پیرہن کے درمیان جیسے شگاف سا پڑ گیا ہو، اور پھر شگاف کے دونوں کنارے باری باری کھسکتے، اترتے، دور ہٹتے ہٹتے جیسے رات میں کہیں تحلیل ہو گئے ہیں، بدن میں ڈھلا پورا چاند میرے سامنے ہے، میری نگاہوں کو تھامے ہوئے۔

لمحات ٹھہر سے گئے ہیں۔ جذبات اور احساسات بھیگنے لگے ہیں، تم کس قدر خوبصورت ہو! میرے وجود نے سرگوشی کی ہے، صرف آپ کے لیے، اُس نے پلکوں سے پیغام دیا ہو جیسے۔

ماحول میں خنکی ہے، اُسے ٹھنڈ نہ لگ جائے، مجھے اپنا کام کر لینا چاہیے، میں جانتا ہوں، یوں ہلنے جلنے سے اُسے تکلیف ہوتی ہے، بازو اور ٹانگیں اور کمر، لیکن یہ ضروری ہے، اور مجھے ہی کرنا ہے، کوئی اور کیوں کرے بھلا، میں اِسے فرض سمجھتا ہوں، اُس نے میرے اندر کی خود کلامی سُن لی ہو جیسے، اُس کی آنکھوں میں تشکر جھلکنے لگا ہے۔

میں پوری توجہ اور احتیاط سے اُسے چھو رہا ہوں، بس تھوڑی دیر، تھوڑا سا اوپر، ذرا اِس طرف، ہاں، بس ہو گیا، آہ، اُس کے ہونٹوں سے سسکاری سی بلند ہوئی ہے، میں جھجک سا جاتا ہوں ایسے میں، لیکن مجھے اپنا کام کرنا ہے، یس مائی لَو، مائی ڈیئر، ہو گیا، دیٹس گڈ گرل۔

میں نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر جھانکا ہے، چاند سرمئی مدھم نیلگوں رات کے پردے پر پھر سے جا ٹھہرا ہے، میری جان میرے سامنے بیٹھی ہے، وہیل چیئر پر، میں فرش پر گھٹنے ٹیکے اُس کے روبرو ہوں، میرے ہاتھ اُس کے زانوؤں پر پشت کے بل رکھے ہیں، اور اُس کے نرم و نازک ہاتھ میری ہتھیلیوں پر سجے ہیں، سرخ رنگ اُس پر کس قدر جچ رہا ہے۔

''اب خوش؟'' اُس نے ایک دم چہک کر پوچھا ہے، جیسے پھر سے میرے دل کی بات سُن لی ہو۔

''ہاں! بہت خوش۔''

''سچ میں؟'' وہ گنگنائی ہے۔

''ہاں ناں!'' میں نے آنکھ ماری ہے۔

کب تک میرا بوجھ اٹھاؤ گے، یونہی اپنے ہاتھوں سے میرے کپڑے بدلتے رہو گے، مجھے کھلاؤ

پلاؤ گے، میں شاید کبھی ٹھیک نہیں ہو پاؤں گی، میرا یہ مفلوج پن شاید کبھی ٹھیک نہ ہو، اُس کے اداس لہجے میں بلا کی سوالیہ کاٹ ہے۔

''ایسا مت کہو! تم ٹھیک ہو جاؤ گی، اور کیا کہا؟ میں کب تک ایسا کروں گا؟ وہ کھڑکی سے باہر چاند دیکھ رہی ہو؟ رات کے پردے پر مسکراتا چاند، اور اُس کے آس پاس ستارے، میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ میری نگاہیں اس منظر سے ہٹیں تو تمہارا دھلا دھلا اور روشن تر چہرہ، میری نگاہوں کو دیر تک تھامے رکھنے کے لیے میرے سامنے موجود نہ ہو، کبھی بھی نہیں چاہوں گا میں ایسا، یہ مجھے ہی کرنا ہے، کوئی اور کیوں کرے بھلا؟ میں اسے فرض سمجھتا ہوں۔''

میں نے اُس کے چہرے کو ہاتھوں میں تھام لیا ہے اور اپنا چہرہ اُس کے چہرے کے قریب لے جا کر ہمیشہ کی طرح اُس کے ماتھے پر اپنے پیار کا لمس ثبت دیا ہے جیسا کہ اُسے پسند ہے۔

''میرا خوف دور کرنے کا شکریہ!'' اُس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے نظر بھر کر دیکھا ہے، اور میری آنکھوں کے کناروں پر بھی جیسے موتی سے چمکنے لگے ہیں۔

◂◂ ● ▸▸

PCSIR Head Officer
G-5/2 Islamabad (Pakistan)
03315047398

اقبال حسن آزاد
کے
دو نئے افسانوی مجموعے
پرٹریٹ
اور
اوس کے موتی
بہت جلد منظرِ عام پر

● **شاہین کاظمی**

جواز

صبح کے نم آلود دھندلکے میں اُس کے سیمیں بدن کا سحر میرے رگ و پے میں اُتر رہا تھا۔ دور اُفق پر ڈوبتے ہوئے ستارہء سحری نے ایک نظر مجھے دیکھا اور بادل اوڑھ لیا۔ مشرقی اُفق پر لالی پھوٹ رہی تھی۔ نرم روی سے چلتی ہوا اُس کے برہنہ شانوں پر ڈھلکی بالوں کی لٹوں سے سرگوشیاں کرنے لگی۔ کسی نے آگے بڑھ کر جلتی مشعل اُس کے دودھیا پاؤں کے پاس رکھی تو میرے خوابیدہ بدن میں شعلے جاگ اُٹھے۔ میری نارنجی انگلیوں نے دھیرے سے اُس کا لبادہ چھوا تو اُس نے کسمسا کر چبوترے کے عین وسط میں گڑے چوبی ستون کی طرف دیکھا اور بے بسی سے سر جھکا لیا۔ اُس کے ہونٹ سختی سے بند تھے لیکن سیاہ آنکھوں سے گہرا حزن و ملال جھلک رہا تھا۔ اُس کے بدن سے اٹھنے والی وحشی مہک مجھے بے قرار کیے دے رہی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ میں نے اِس سے قبل کسی حسین بدن کو کبھی چھوا نہیں تھا۔ اب تک نہ جانے کتنے ہی مبہوت کر دینے والے حسن میری لپٹوں میں راکھ ہوئے تھے۔ اُن کی سانسیں میری حدتوں میں گھل کر سیمے کی آنکھ میں اَن مٹ نقوش بناتی رہیں۔ لیکن مجھے کہنے دیجیے اُس کا حسن شاید زمینی نہیں تھا۔ ملیح رخساروں سے جھلکتی گلابیاں، رسیلے ہونٹ اور رات کے فسوں جیسی سیاہ آنکھیں۔ اُسے بنانے والے نے بڑی فرصت اور لگن سے بنایا تھا۔ سانچے میں ڈھلا وہ دلنشیں سراپا کسی بھی زاہد کا زُہد توڑ سکتا تھا۔ وہ بری طرح کسمسا رہی تھی۔ اُس کے منہ سے نکلنے والی چیخ نما سسکاری نے میرے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو ہوا دے دی۔ میری لپلپاتی زبانیں بے تابی سے اُس کے پاؤں چاٹنے لگیں۔ اُس کے بدن میں شدید کپکپاہٹ تھی۔ سسکیاں چیخوں میں ڈھل رہی تھیں۔

مجھے یہ بتانا یاد نہیں رہا کہ اُس مہ جبین کو اُس کی مرضی کے خلاف میرے ساتھ مقید کیا گیا تھا۔ کسی وحشی ہرنی کی طرح اُس کی آنکھوں میں پھیلا ہوا خوف، تیز رفتاری سے دھڑکتا ہوا دل اور آسمان کا سینہ شق کرتی چیخیں۔

سرکش حسن کا اسیر کرنے کا اپنا مزہ ہوتا ہے۔ وہ بھی ایسی ہی تھی۔ اُس کے کسے ہوئے بدن میں بلا کی کشش تھی جو میری وحشیانہ پیش قدمی سے جھلس رہا تھا، پگھل رہا تھا۔ میری حدت نے اُس کی ہڈیوں کو چھوا تو اُس کی چیخیں اُس کے حلق میں دم توڑنے لگیں لیکن میری سفاک انگلیاں اُس کا سراپا ٹٹولتی رہیں۔ مشرقی اُفق سے لہو پھوٹ رہا تھا۔ سبک روی سے بہتی ہوا ہم دونوں کا بدن چھو کر جانے کون سی کہانیاں کہہ رہی تھی۔

کھلیانوں اور کچے راستوں پر قطرہ قطرہ گرتی اوس نے اپنا دامن سمیٹا اور صبح کے دھندلکے میں گم

ہونے لگی۔تمام ترنمی کے باوجود کچے راستوں پر دھول سی اٹھ رہی تھی۔ میں نے اپنے مدہم پڑتے شعلوں کے اُس پار دیکھا۔ ملگجے اندھیرے میں مہیب سائے ہمارے چاروں طرف منڈلا رہے تھے۔ اُس کی المناک چیخیں اور میرے بھڑکنے کی تیز آواز آس پاس ہونے والی دھیمی دھیمی سرگوشیاں نگل رہی تھی۔ اِس زمینی گناہ وثواب کا فلسفہ میری سمجھ میں کبھی بھی نہیں آیا۔اپنی اپنی خواہشوں کے بھاری حصیر سے شل ہوتے ہر انسان کا اپنا فلسفہ اور اپنی منطق تھی۔ اپنے اپنے سچ تھے۔انھیں نام نہاد سچائیوں نے آفاقی سچائیاں چاٹ ڈالیں۔ بنی آدم پر قابیلی جبلت حاوی ہوئی تو دائرہ در دائرہ بٹتے بٹتے وہ اپنی شناخت بھی کھو بیٹھا۔

میں ازل سے اِس کائنات کا حصہ ہوں.....ایک اہم حصہ۔ جزا وسزا کا فلسفہ میرے وجود کے بغیر ادھورا ہے۔میرا غیض وغضب ہمیشہ سے بنی آدم پر حاوی رہا۔گزرتے موسموں میں کئی موسم ایسے بھی تھی جب میں نے بنی آدم کو اپنے سامنے سجدہ ریز بھی پایا جبکہ اُس کی تعظیم میں سرنگوں نہ کرنے والا بھی مجھ ہی سے تھا۔اپنی تمام تر ناری صفات سمیت..... ہے نا عجیب بات؟

میں سفاک سہی لیکن میرا سلوک ہر ایک کے ساتھ یکساں رہا ہے۔ بنی آدم کی سی منافقت میری سرشت میں موجود نہیں۔ میں نے اپنی دسترس میں آنے والے ہر حسن کو اُس کی جبر ورضا سے الگ کر کے بلا امتیاز اپنی وحشتوں میں راکھ کیا۔سو آج بھی اُس کے رگ وپے میں جاگتی ناقابلِ بیان اذیت اور لمحہ لمحہ ٹوٹتی سانسوں سے اٹھنے والے تمام تر اضطراب کے باوجود میری شعلہ روزبانیں اُس کے بدن کے ہر حصے کو دیوانہ وار چھو رہی تھیں۔اُس کی چیخیں میری سماعت میں گھل کر میرے جنون میں جہنم دہکانے لگیں۔ میرے شعلے اُس کی چیخوں کے ساتھ آسمان چھو رہے تھے۔ مجھے اپنے جذبوں کے آگے بند باندھنا کبھی بھی اچھا نہیں لگا۔وصل میں وحشت نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے۔وصل تو جسم وجان ایک ہونے کا نام ہے.....درمیانی حجاب اٹھنے کا نام.....فاصلوں کے مٹنے کا نام۔سو میں نے چاہا کہ وہ مکمل طور پر مجھ میں سما جائے۔سانسوں کے ساتھ ساتھ اُس کی آواز بھی ٹوٹ رہی تھی۔وہ بے دم ہونے لگی۔ مجھے معلوم تھا ایسا ہونا ہے۔ مجھے اپنی شدتوں، اپنی وحشتوں کا اندازہ تھا اور بہت اچھی طرح تھا۔ میں نے کبھی بھی زہد کا دعویٰ کیا نہ اپنی پارسائی کی قسمیں کھائیں۔رحمدلی روزِ ازل سے میرا وصف تھا نہ منافقت۔سو مجھے اپنے جذبوں کی عریانی پر ہرگز شرمندگی نہ تھی۔ میری سلگتی انگلیاں اُس کے جسم کے ہر حصے کا طواف کرتی رہیں۔اُس کی ٹوٹتی سانسیں گواہ تھیں کہ اپنی تمام تر وحشتوں سمیت آج بھی کامیابی میرا ہی مقدر تھی۔ مجھے خود پسند کہہ لیں مگر حقیقت یہی ہے۔اُس کے بدن سے پگھلتی کھال اور خون کا ملغوبہ میرے شعلوں پر گرنے لگا۔اُس کی ہڈیاں چٹخ چٹخ کر راکھ بننے لگیں۔لیکن میری وحشتیں عروج پر تھیں۔ میں نے سمے کی طرف دیکھا۔قصبے کے باقی خوابیدہ گھروں کی طرح دم سادھے ہمارے وصل کے الوہی لمحات کو آنکھوں میں پتلیوں میں قید کئے وہ بھی جیسے تھم سا گیا تھا۔

وقت سے زیادہ سفاک کوئی نہیں لیکن کسی کو اپنے سے زیادہ سفاک پا کر وہ یونہی ساکت وجامد ہو

جاتا ہے۔ یہ میرا مشاہدہ تھا۔ میں نے اپنی سفاکیت کے آگے اِسے یونہی ٹھٹھکتے ہوئے، بے بس ہوتے دیکھا۔اُس کی انگلیاں انتہائی سرعت سے چلتیں اور معاملہ قلم بند کرتی جاتیں۔ مجھے وقت کی اِس کارروائی پر اکثر حیرت بھی ہوتی۔ کتنے ہیں جو اِس کا لکھا پڑھتے ہیں؟ سمجھتے ہیں؟ اُس کی کتاب ایک ہی جیسے مناظر سے بھری پڑی ہے۔سرکتے دائروں میں یکساں مناظر آئینوں میں قید عکس کی طرح لاتعداد بار آمنے سامنے آئے۔لیکن پلٹ کر کوئی نہیں دیکھتا۔اور اِس کی انگلیاں ہیں کہ بس.....

مشرقی اُفق کے اُس پار سرمئی دھندلکے کے اُس طرف اجالے نے اپنی مُندی مُندی آنکھوں سے ہمیں دیکھا۔ جامِ وصل کے آخری قطرے میرے حلق سے اُتر رہے تھے۔اُس کا ساحر بدن میری آغوش میں آخری تھرتھراہٹ کے بعد ساکت تھا۔نشہ آور گولائیاں، مہکتے لب اور لَو دیتے رخسار کچھ بھی تو میری وحشتوں سے محفوظ نہ رہ سکا تھا۔میرے بھڑکتے شعلے سرد پڑنے لگے۔ میں نے آخری بار اُس کی طرف دیکھا اور ایک گہری سانس لے کر اُس کی آخری دلدوز چیخ اپنے اندر جذب کرتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ کچے راستوں پر بچھی دھند سورج کا لمس پا کر سمٹنے لگی۔ سامنے بینرے پر مرغ پوری طاقت سے چلایا۔خوابیدہ قصبے میں ہلچل ہونے لگی۔مجھ پر راہِ وصل کی تھکن طاری تھی۔

ٹھٹھری ہوئی زرد دھوپ گلیوں میں بکھری تو جانے کب سے دم سادھے لوگ جیسے ہوش میں آنے لگے۔سرگوشیاں بڑبڑاہٹوں میں بدل گئیں۔ پروہت نے آگے بڑھ کر میرے سرد ہوتے شعلوں میں جلتے جسم کی راکھ کو دیکھا اور چبوترے پر جا کھڑا ہوا۔

”شاید آسمان ہم سے ناراض ہے اسی لئے آفات کا مسلسل نزول ہو رہا ہے۔پچھلے تین ماہ میں آگ کی نذر کی جانے والی یہ چوتھی لڑکی تھی جو اپنے شیطانی چلن سے معاشرتی امن تباہ کر رہی تھی۔ دیوتا ہم پر رحم کریں۔“

وہ مجمع سے مخاطب تھا۔ میرے آخری ننھے سے شعلے نے سرد پڑتی راکھ سے سر اٹھایا پروہت کی بات سنی اور پھر سے راکھ میں دبک گیا۔اپنے ہر عمل کا من چاہا جواز تلاشنا ازل سے بنی آدم کا وطیرہ ہے۔ میں نے اپنے اردگرد کھڑے لوگوں کو دیکھا۔اپنے چہروں پر اپنی اپنی مکروہ سچائیاں چپکائے وہ یقیناً اِس بات سے بے خبر تھے کہ ایک نہ ایک دن اُن سب کو کسی نہ کسی رنگ میں میری وحشتوں کی زد میں آنا ہے۔سبک روی سے کھلیانوں کی اُور بہتی ہوا میں گوشت کی سڑاند رچی ہوئی تھی۔

◂◂ ● ▸▸

Arnegger Strasse 10
9204, Andwil SG, Switzerland
004179284275

● محمد جمیل اختر

ایک الجھی ہوئی کہانی

''لو آج میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں یہ کہانی سو سال پرانی ہے۔''

''سو سال؟''

''ہاں تقریباً سو سال۔''

''نہیں بھئی ہم نہیں سنتے اتنی پرانی کہانی، دنیا چاند پر پہنچ چکی ہے اور تم ہمیں سو سال پرانی کہانیاں سنا رہے ہو۔''

''کچھ کہانیاں کبھی پرانی نہیں ہوتیں، وہ وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں اور سدا جوان رہتی ہیں، جب تک انسان کے دکھ سکھ ایک سے ہیں کہانیاں ایک سی ہی رہیں گی۔''

''نہیں تم ہمیں کوئی نئی کہانی سناؤ بالکل نئی بلکہ آج کی کہانی سناؤ۔''

''آج کی کہانی؟''

''ہاں آج کی کہانی، ہمیں کوئی ایسی کہانی سناؤ کہ کچھ وقت گزرے اِس ہسپتال میں لگتا ہے وقت ٹھہر گیا ہے سو کوئی قصہ سناؤ دوست لیکن آج کا قصہ۔''

''آج تو کوئی خاص بات نہیں ہوئی ہاں بس ایک فون آیا تھا کہ شبیر نے اپنی بیوی سلمٰی کو طلاق دے دی ہے۔''

''اوہ اچھا تو تم ہمیں اسی شبیر کی کہانی سناؤ۔''

''شبیر کی کوئی خاص کہانی نہیں ہے وہ میرا بچپن کا دوست ہے اور ایک ساتھ پڑھتے، اور کھیلتے رہے ہیں جیسا کہ میں نے کہا کہ اُس کی کوئی خاص کہانی نہیں ہے بس یہ کہ جب ہم میٹرک میں تھے تو اُسے سلمٰی سے محبت ہوگئی اور ہم دونوں گاؤں کے راستوں پر سلمٰی کی ایک جھلک دیکھنے کی خاطر گھنٹوں انتظار کرتے تھے، تم اِس قصے کو چھوڑو میں تمہیں سو سال پہلے کی کہانی سناتا ہوں اور تم دیکھو گے کہ کس طرح ایک دولت مند ایک غریب کی عزتِ نفس کو مجروح کرتا ہے، یہ تب کی بات ہے جب ہمارے گاؤں میں دریائے سندھ پر پُل بن رہا تھا۔''

''نہیں نہیں رکو بھئی ہمیں بتاؤ شبیر کی کہانی میں آگے کیا ہوا؟''

''قصہ مختصر یہ کہ شبیر چونکہ گاؤں کے ایک کھاتے پیتے زمیندار کا بیٹا تھا سو جب اُس کے گھر والے اُس کا رشتہ لے کر سلمٰی کے گھر گئے تو سلمٰی کے گھر والے انکار نہ کر سکے اور انہوں نے سلمٰی سے پوچھے بغیر شادی کے لئے ہاں کر دی .....تو میں کہہ رہا تھا کہ جب ہمارے گاؤں میں پُل بن رہا تھا تو بہت سے آفیسرز دور دور سے ہمارے گاوں آئے تھے جب کہ مزدوروں میں زیادہ تر لوگ مقامی تھے۔اور اِن مزدوروں میں کرمو بھی شامل تھا جو کے گاؤں کا سب سے غریب آدمی تھا۔''

''لیکن جب شبیر کو سلمٰی سے محبت تھی تو طلاق کیسے ہوگئی، بات کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔''

''اصل میں یہ بات لوگوں میں مشہور ہے کہ شادی کی پہلی ہی رات سلمٰی نے شبیر کو کہہ دیا تھا کہ مجھے تم سے نفرت ہے اور یہ شادی میری مرضی کے خلاف ہوئی ہے۔''

''اوہ اچھا تو پھر کیا ہوا؟''

''کس کا کرمو کا؟''

''نہیں بھئی شبیر کا؟''

''شبیر زمیندار خون تھا بھلا یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ اُس کی بیوی کسی اور سے محبت کرے سو وہ روز سلمٰی کو پیٹتا اور کہتا مجھے بتاؤ تمہیں کس سے محبت ہے، پر سلمٰی عجیب عورت تھی اُس نے چھ ماہ تک شبیر کو نہیں بتایا کہ اُسے کس سے محبت ہے۔''

''اچھا پھر؟''

''پُل پر کام کرنے والے ایک صاحب کے پاس بہت قیمتی گھڑی تھی جو کہ انہوں نے ولایت سے لی تھی، ایک دن کیا ہوا کہ وہ صبح اٹھے تو ان کی گھڑی غائب تھی انہوں نے سارے مزدوروں کو بلایا، مزدور سارے ہی غریب تھے لیکن کرمو کی حالت سب سے زیادہ پتلی تھی اور اُس سے ایک دن پہلے ہی اُس نے صاب سے اپنے حالات کا رونا رو کر تنخواہ بڑھانے کی گزارش کی تھی سو صاحب کو شک ہوگیا کہ چور یقیناً کرمو ہی ہے سو انہوں نے کرمو کو کہا کے وہ انہیں ان کے گھڑی واپس کر دے ورنہ وہ کوڑے مار مار کر گھڑی نکلوا لیں گے۔''

''لیکن ہم تو شبیر اور سلمٰی کے بارے پوچھ رہے ہیں''

''ارے بھئی چھوڑو بھی سلمٰی اور شبیر کو، ہوا کچھ یوں تھا کہ چھ ماہ بعد سلمٰی نے ایک روز شبیر سے کہا کے اُسے شبیر کے دوست یعنی مجھ سے محبت ہے۔''

''اوہ یعنی تم بھی اِس کہانی کا حصہ ہو؟''

''نہیں نہیں میں تمہیں دوسرا قصہ سناتا ہوں کہ جب کرمو پر الزام لگا تو اُس نے بہت قسمیں کھائیں ،اور کہا کہ وہ غریب ضرور ہے لیکن چور نہیں، پر تمہیں تو پتا ہے غریب آدمی کے لیے یہ ثابت کرنا کتنا مشکل ہے کہ

وہ سچ بول رہا ہے سو کسی نے بھی کرمو کی بات کا یقین نہیں کیا اور صاحب نے ایک لمبا کوڑا منگایا اور وہ کرمو کو مارتے جاتے تھے اور کہتے تھے کمبخت چور، بتا دے میری گھڑی کہاں ہے، ارد گرد کھڑے باقی مزدور بھی کرمو پر آوزے کسے جا رہے تھے کہ چوری کا انجام برا ہی ہوتا ہے، اب نکال دے گھڑی، کوئی دسویں بار جب صاحب نے کوڑا مارا تو کوڑا ان کے ہاتھ سے گر گیا جسے اٹھانے کے لے وہ جھکے تو گھڑی انکی اپنی جیب سے نکل کر نیچے گر گئی ،صاحب کبھی کرمو کو اور کبھی گھڑی کو دیکھتے اور کرمو نے صاحب کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے ایک غریب کو ایک امیر کو دیکھنا چاہیے لیکن یکدم اُسے خیال آیا کہ کہیں نوکری ہی نہ چلی جائے وہ اُٹھا اور صاحب سے کہا۔

''صاب! مبارک ہو گھڑی مل گئی.....رشید، فقیرو، گورو یہ دیکھو صاب کی گھڑی مل گئی.....''

''اوہ ہو یہ تو بہت دکھی کہانی ہے لیکن وہ شبیر کا کیا ہوا؟''

''جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ میں اس کہانی کا حصہ ہوں اور سلمٰی کو مجھ سے محبت ہے، سو ایک روز میں گھر کے باہر ہی کھڑا تھا کہ شبیر آ گیا اُس نے کہا۔

''میں تو تمہیں اپنا جگری دوست سمجھتا تھا مجھے کیا معلوم تھا تم ایسے نکلو گے۔''

''کیا ہوا دوست مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔'' میں نے پوچھا

''اب اتنے بھولے نہ بنو مجھے سلمٰی نے سب کچھ بتا دیا ہے۔''

اور یہ کہہ کر اُس نے مجھ پر گولی چلا دی جو میری ٹانگ پر لگی، سو تب سے میں تم لوگوں کے ساتھ اس وارڈ میں علاج کی غرض سے داخل ہوں.....''

''اوہ اچھا تو یہ ہے تمہارے زخم کی کہانی، لیکن تم تو کہہ رہے تھے کہ یہ گولی تمہیں پستول کی صفائی کے دوران لگی تھی۔''

''تو کیا پہلی ہی ملاقات میں سب کچھ بتا دیتا۔''

''ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔''

''لیکن پھر شبیر نے سلمٰی کو آج کیوں طلاق دی؟''

''سنا ہے کل رات وہ سارے زیور لے کر انور کے ساتھ بھاگ رہی تھی، لیکن دونوں پکڑے گئے اور شبیر نے سلمٰی کو طلاق دے دی.....''

''بھئی یہ انور کون ہے اب۔''

''انور سلمٰی کا پڑوسی.....''

◀◀ ● ▶▶

DPN 123-B, Street Number 4, Dhok Ponu, Sadiq Abad, Rawalpindi
Phone Number : 03325268952

- **امکانات**
- **ڈاکٹر اویناش امن**

قلی گاڑی

شادی کسی بھی لڑکی کی زندگی کا سب سے اہم پڑاؤ ہوتا ہے۔ایک ایسا پڑاؤ جہاں آ کر زندگی کی سمت اور رفتار دونوں بدل جاتی ہے۔شادی کی ایک رات کسی عام متوسط گھرانے کی لڑکی کی پوری زندگی کا فیصلہ کر دیتی ہے اور اگلے کچھ دنوں کے بعد میری بھی زندگی پوری طرح بدل جانے والی تھی۔شادی کے لمحے ماں باپ کے لیے جہاں ایک جانب مسرت اور سکون کے باعث ہوتے ہیں وہیں تمام طرح کے خدشات اور اندیشوں کو بھی راہ دیتے ہیں۔ہائے اس فیصلے کی گھڑی میں آج میرے ساتھ نہ تو میرے بابو جی ہیں جنہوں نے میرے پیدا ہوتے ہی اس دن کی تیاری میں خود کو اس طرح منہمک کر لیا تھا کہ اپنی تمام خوشیوں سے بے نیاز ہو گئے اور میرے بھیا جن سے میں سنگیتا دیدی کا دوپٹہ اوڑھ کر جھوٹ موٹ کی دلہن بن کر لپٹ کر روتی اور وہ سچ مچ رونے لگ جاتے۔

آج بابو جی کو ہم سے بچھڑے تین سال ہو گئے اور اب بھیا نے بھی ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔صبح والی قلی گاڑی کا وقت ہوتے ہی ماں کے بے جان ہاتھوں میں نہ جانے کہاں سے حرکت آ جاتی ہے اور میں چاہ کر بھی خود کو نیند میں بھلا نہیں پاتی۔قلی گاڑی کی سیٹی ہم لوگوں کی زندگی میں اس طرح پیوست ہو گئی ہے کہ ہم سیٹی بجنے سے پہلے ہی آج بھی چونک کر اٹھ جاتے ہیں۔

رام پور میں جب ریلوے کارخانہ کھلا تو آس پاس کے گاؤں کے لوگوں کو بڑی تعداد میں روزگار ملا۔زیادہ سے زیادہ لوگ کھیتی چھوڑ کر کرکھنیا (کارخانے والے) ہونے لگے۔مڈل پاس، میٹرک پاس، جو پڑھنا لکھنا نہیں بھی جانتے تھے وہ بھی کارخانہ جا کر کلینیر میں بحال ہو جاتے۔پھر کھلاسی بن جاتے، پھر سیکنڈ فائرمین پھر فائرمین پھر اسسٹنٹ ڈرائیور اور اسی طرح ترقی پاتے، ڈرائیور بن کر ریٹائر ہو جاتے۔اس طرح ان کی روزی روٹی کا مسئلہ تو حل ہو ہی رہا تھا ساتھ ہی سماج میں عزت کی نظروں سے بھی دیکھے جاتے تھے۔ہمارا گاؤں شہر سے بمشکل تین چار کوس ہوتے ہوئے بھی کوئی خوشحال اور ترقی یافتہ گاؤں نہ تھا۔زیادہ تر کسانوں کے پاس زمین کے بہت ہی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے اور ان کا بھی بیشتر حصہ جلاّ تھا۔ایک فصلی زمین ہونے کے سبب فقط اس کی کمائی سے کام چلانا جوئے شیر لانے کے مصداق تھا۔لہٰذا بابو جی بھی گاؤں کے تمام کرکھنیوں کی طرح ایک کرکھنیا بن چکے تھے۔ان کرکھنیوں کو وقت پر کارخانے لانے اور گھر

پہنچانے کے لیے ریلوے نے تین سمتوں میں تین ریل گاڑیاں چلا رکھی تھیں جنہیں عام بول چال کی زبان میں قلی گاڑی کہا جاتا تھا۔ یہ گاڑیاں ریلوے یارڈ سے کھلتیں اور رام پور سے پانچ اسٹیشن آگے تک سبھی اسٹیشنوں، گمٹیوں، ہالٹوں، پلیوں پر رکتے ہوئے زیادہ سے زیادہ کرکھنیوں کو سمیٹے ہوئے واپس رام پور یارڈ میں آ لگتیں۔ ہمارا گاؤں رام پور کے بعد قلی گاڑی کے پہلے ہی اسٹاپیج پر تھا۔ بابو جی قلی گاڑی سے ہی روز ڈیوٹی پر جاتے اور اسی سے لوٹ آتے۔ صبح والی قلی گاڑی جاتے وقت ہر اسٹاپیج پر سیٹی بجاتی ہوئی نکلتی تا کہ لوگ تیار ہو جائیں اور واپسی میں وقت پر گاڑی پکڑ سکیں۔ ہمارا گاؤں چونکہ رام پور کے بعد ہی تھا اس وجہ سے بابو جی اور ماں کو تیاری کے لیے اچھا خاصا وقت مل جاتا تھا۔ شروع شروع میں تو ماں گاڑی کی سیٹی سن کر نیند سے جاگتیں بعد میں وہ منہ اندھیرے اٹھنے کی اس قدر عادی ہو گئیں کہ انہیں جگانے کے لیے قلی گاڑی کی سیٹی کی ضرورت نہ رہی۔ میری ماں مذہبی خیالات والی خاتون تھیں۔ وہ چڑیوں کے جگنے سے پہلے کھاٹ چھوڑ کر اٹھ جاتیں جب ہم تینوں بھائی بہن نیند میں بے سدھ پڑے رہتے۔ ماں کا کہنا تھا کہ بغیر اسنان کئے چوکا میں گھسنے سے ان دیوتا ناراض ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ سب سے پہلے کنوئیں پر جا کر منہ اندھیرے ہی ان کے لفظوں میں دیہہ پر دولوٹا پانی ڈھال لیتی پھر بابو جی کے لیے چار کھٹال والے اونچے سے لنچ باکس میں کھانا پیک کر ایک بڑے تھرمس میں کنٹھ تک لبالب چائے بھر کر دے دیتی۔ اس کام میں ماں کو بمشکل نصف گھنٹہ لگتا۔ یہی بابو جی کا دن بھر کا کھانا ہوتا۔ وہ اٹھتے داتن کرتے، نہا کر اپنی خاکی رنگ کی ڈریس پہن کر ٹفن اور تھرمس ایک جھولے میں ڈال کر گاڑی پکڑنے نکل جاتے۔ روزانہ کا یہی معمول تھا۔ ہفتے میں ایک دن چھٹی ہوتی مگر چھٹی کا دن کون سا ہوگا یہ طے نہیں تھا۔ یہ ڈیوٹی پر منحصر تھا۔ بابو جی جب ترقی پاتے پاتے ڈرائیور ہو گئے تو انہیں رام پور اسٹیشن سے سٹے ریلوے کوارٹروں میں سے ایک کوارٹر مل گیا۔ سبب تھا کہ وہ بھی دیگر ڈرائیوروں کی طرح ہی کبھی بھی ڈیوٹی پر طلب کئے جا سکیں، مگر عمر کا بیشتر حصہ گاؤں میں گزارنے کے بعد بابو جی کا دل رام پور کے کوارٹر میں کہاں لگنے والا تھا؟ وہ حسب معمول گھر پر ہی رہے اور وہیں سے پہلے کی طرح ہی ڈیوٹی کرتے رہے۔ اس کے لیے انہوں نے آفس کے پیون رام بھروس کو اپنے بھروسے میں لے لیا تھا۔ جب کبھی بابو جی کی ڈیوٹی لگتی تو رام بھروس ڈیوٹی رجسٹر جسے وہ "کتاب" کہتا تھا لے کر سائیکل سے ہمارے گھر آ جاتا اور بابو جی کتاب پر سائن کر کے اس کے ساتھ ہی ڈیوٹی پر چلے جاتے۔

پوس کی ایک اندھیری رات، کپکپا دینے والی ٹھنڈک اور اوپر سے رہ رہ کر ہلکی بوندا باندی۔ ہم سب رضائیوں میں دبک کر گہری نیند میں اس قدر بے خبر تھے کہ ہمیں معلوم ہی نہیں ہوا کہ آدھی رات کے وقت دروازہ کتنی دفعہ کتنی زور سے کھٹکھٹایا جا چکا ہے۔ آخرکار ماں کی ہی نیند سب سے پہلے کھلی۔ انہوں نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا۔ سامنے رام بھروس تھا۔

"ہجور کتاب ہے۔"

اس وقت؟ اب تک بابو جی بھی بیدار ہو کر باہر نکل آئے تھے۔

بنڈیل کا انجن لیلکھ میں پھیل ہو گیا ہے۔ انجن لے کے جانا ہوگا کہتے ہوئے رام بھروس نے رجسٹر آگے کر دیا اور قلم کھول کر بابو جی کے ہاتھوں میں پکڑا دیا جہاں بابو جی نے دستخط کر دئے۔ بابو جی جانتے تھے کہ کتاب آ گئی تو ڈیوٹی پر جانا ہی ہے ورنہ نوکری ختم۔

ماں نے بالٹی اوگھین (پانی کھینچنے والی رسی) اٹھایا تو بابو جی نے ٹوکا۔

اتنا ٹائم نہیں ہے۔ کھالی چائے بنا کے دے دو۔

بس دولوٹا..... ماں کہاں ماننے والی تھیں وہ تو بغیر اسنان کے چوکا میں گھسنا بھی پاپ سمجھتی تھیں۔

رام بھروس دروازے پر گھورا کے پاس بیٹھ گیا جس میں اب بمشکل ہی کوئی آگ بچی تھی۔ وہ وہیں پڑی ایک چھونکی سے گھورا کو الٹنے پلٹنے لگا کہ شاید سلگتا ٹکڑا اندر دبا ہوا اور بابو جی کپڑے پہننے لگے کہ تبھی سر..... چھپاک اور پھر دھم۔ ہم سبھی کنوئیں پر دوڑے۔ بالٹی رسی سمیت کنوئیں میں جا گری تھی۔ ماں نیچے گری بری طرح کانپ رہی تھی۔ انہیں اٹھا کر اندر لایا گیا، فوراً آگ جلائی گئی، ماں کو کمبلوں رضائیوں سے توپ دیا گیا، بھیا ماں کے تلوے رگڑنے لگا، میں ہتھیلی رگڑنے لگی۔ صبح ماں کو ریلوے اسپتال رام پور میں بھرتی کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے بتایا۔

سردی کی وجہ سے فالج کا زبردست اٹیک ہو گیا ہے تقریباً پورے بدن کو فالج مار گیا ہے انہیں علاج کے لیے پٹنہ لے جائیے۔ پٹنہ لے جانے کے بعد بھی نتیجہ کچھ الگ نہ تھا۔ اب ماں بستر پہ تھی۔ نہ ہل سکتی تھی نہ بول سکتی تھی۔ بس ان کی آنکھیں خاموش خلا کو تکتی رہتیں اور آنکھوں سے آنسو جاری رہتے جس سے وہ اپنے دل کا حال بیاں کرنے کی ناکام کوشش کرتیں۔ ماں کی بیماری نے ہماری دنیا ہی بدل دی۔ ہمیشہ ہشاش بشاش اور خوش مزاج رہنے والے بابو جی اب گم سم رہنے لگے۔ ماں والی ساری ذمہ داریاں اب میرے سر آ لگیں۔ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کرتی مگر میرے ننھے ہاتھ ماں کے ہاتھوں کی جگہ بھلا کیا لیتے۔ بابو جی کا روٹین خراب ہونے لگا۔ میں چاہ کر بھی ان کا چار تلوں والا ٹفن تیار نہیں کر پاتی۔ چھوٹا بھائی تو خیر چھوٹا ہی تھا۔ ایسے میں بابو جی کی ساری امیدیں بڑے بھیا کی جانب آ لگیں۔ بھیا کے لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی بابو جی نے ان کی شادی برہلیا میں کر دی، اس امید کے ساتھ کہ بہو آ جانے پر گھر کے کاموں میں خاص طور پر مجھے مدد ملے گی۔ بابو جی کی طلب کا تقریباً آدھا حصہ تو ماں کی دوا دارو میں ہی خرچ ہو جاتا تھا۔ بھیا کی شادی کے بعد مزید خرچ بڑھا اور روز بہ روز ہماری مالی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ اب تو گھر کا خرچ بھی بمشکل ہی جل پاتا تھا۔ گاؤں والے چہ میگوئیاں کرتے۔ "شمبھو شرن کو دیکھو گھر میں سانڈ پال رکھا ہے..... بیٹے کی اتنی عمر نکل آئی، کوئی کام ہونہہ، دھام کراوے۔ کوئی طعنے مارتا۔ کہتا تھا بنوں گا تو بی ڈی او ہی بنوں گا، اب چپراسیو بنے تو غنیمت۔ کوئی کہتا اب فارورڈ کو نوکری ملتی ہی کہاں ہے؟ دلی ولی چل جاتا تو کچھ کما کے لاتا۔ باپ کی روٹی خود تو توڑ ہی رہا ہے اور اب بیوی بچہ بھی.....

بھیا پڑھائی میں بہت ذہین تھے۔ میں جب دیکھتی وہ موٹی موٹی کتابوں میں اپنی آنکھیں گڑائے

رہتے۔گاؤں کے دوسرے نوجوانوں کی طرح نہ تو وہ ناٹک منڈلی میں شرکت کرتے اور نہ ہی کالی استھان میں بیٹھتے۔ ہر وقت ایک ہی بات مجھے بی ڈی او بننا ہے۔ وہ پورے انہماک سے تیاری میں لگے رہے۔ بی پی ایس سی کے شوق میں بھیا کے ہاتھوں سے دوسری چھوٹی موٹی نوکریاں بھی نکلتی گئیں اور بی پی ایس سی میں کبھی مین میں کبھی انٹرویو میں بھیا چھنٹتے ہی رہے۔ تیاری کرتے کرتے بھیا کے آدھے بال سفید ہو گئے آنکھیں دھنس گئیں۔اب نوکری کی ضرورت سخت سے سخت تھی مگر اب بیشتر نوکریوں کے لیے ان کی عمر کی حد ختم ہو چکی تھی۔کارخانہ بھی اب وہ کارخانہ نہیں رہ گیا تھا کہ کوئی بھی جا کر بھرتی ہو جائے۔اب بھرتی کے لیے باضابطہ بھرتی بورڈ بن گئے تھے۔الہ آباد، سکندرآباد اور نہ جانے کہاں کہاں اب ریلوے کے امتحان ہوتے تھے۔ بھیا کے پاس اب نہ عمر تھی، نہ وسیلہ اور نہ حوصلہ۔ وہ دن بہ دن اندر سے کھوکھلے ہوتے جا رہے تھے۔

انہیں مشکل دنوں میں بابو جی کو نہ جانے کیسے ہاتھ تھرتھرانے کی بیماری ہوگئی۔ڈاکٹر کو دکھایا تو معلوم ہوا کہ پارکنسن ڈیزیز ہے، لاعلاج۔عمر کے ساتھ ساتھ بدن کا تھرتھرانا بڑھتا ہی جائے گا۔

بھیا نے بہت کوشش کی، بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر چھوٹی سے چھوٹی نوکری بھی ہاتھ نہ آئی۔ وہ کلینیر، کھلاسی کی نوکری جو پہلے کسی کو بھی دستیاب تھی اب اس کے لیے بھی لوگ دو۔دو لاکھ روپے دینے کو تیار تھے اور ہمارے پاس اتنے روپے کہاں تھے؟ ادھر ماں کی بیماری، بھیا کا بڑھتا پریوار، میری شادی، بابو جی کی دن بہ دن قریب آتی ریٹائرمنٹ کی تاریخ اور ادھر چھوٹا کالی استھان میں بیٹھ بیٹھ کر جوا چپیسی کی عادت میں برباد تھا۔ بھیا اسے دیکھتے اور ایک سرد آہ بھر کر رہ جاتے۔

بابو جی کا ریٹائرمنٹ اسی سال تھا۔ ہم لوگ سوچ کر بھی دہل جاتے تھے کہ پہلے ہی بابو جی کی طلب سے گھر کا گزارا مشکل ہو رہا تھا اور جب ریٹائرمنٹ کے بعد طلب آدھی ہو جائے گی تو پھر کیسے کام چلے گا۔ ایسی بات نہیں تھی کہ بابو جی اس بات سے بے خبر تھے مگر وہ کر بھی کیا سکتے تھے؟ اب اسے وقت کی خوبی کہئے یا خرابی وہ ٹھہر کر نہیں رہتا۔ وقت خواہ اچھا ہو برا گزر ہی جاتا ہے۔

اس مہینے کی تیس تاریخ کو بابو جی ریٹائر ہونے والے تھے۔ وہ دل کو بہلاتے، کہتے چلو اب تم دونوں کی جان چھوٹی۔اب قلی گاڑی آئے یا جائے تم لوگوں کو صبح اٹھ کر ٹفن تیار نہیں کرنا پڑے گا اور وہ ٹھٹھا کر ہنس پڑتے..... بالکل کھوکھلی اور مصنوعی ہنسی..... ہم بھی ان کا ساتھ دیتے، پھر ہم سبھی الگ الگ کونوں میں اپنے اپنے حصے کا آنسو بہا لیتے۔

تیس تاریخ سے ٹھیک چار دن پہلے شام کو خبر آئی بابو جی گاڑی سے اترتے وقت ریل کی پٹری پر گر پڑے۔ہم بدحواس گمٹی پر دوڑے۔معلوم ہوا ہاتھ تھرتھرانے کی وجہ سے گیٹ کے ہینڈل کو ٹھیک سے پکڑ نہیں پائے اور اس سے پہلے کہ گاڑی پوری طرح رکتی..... بابو جی ریلوے اسپتال میں تھے، زندگی اور موت کے بیچ جھولتے

ہوئے۔ڈاکٹروں نے بتایا اگلے ۲۴ گھنٹے ان کی زندگی کے لیے بہت اہم ہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ہم لوگ سانس تھامے ایک ایک پل کو ناپ رہے تھے۔ بابو جی کو دیکھنے کے لیے گاؤں سے لوگوں کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ بابو جی کی حالت کافی سیریس تھی۔انہیں آکسیجن پر رکھا گیا تھا۔انہیں کوئی پریشانی نہ ہو اس لیے ہم لوگوں میں سے ہی باری باری سے کسی ایک کو بابو جی کے پاس جانے کی اجازت تھی۔لہٰذا جو بھی بابو جی کو دیکھنے آتے ہم لوگوں سے مل کر تسلی کے دو بول بول کر اپنا فرض ادا کر لیتے، وہیں ان میں سے بہت سے دبی زبان سے یہ کہنے میں بھی نہ چوکتے ''دیکھو بوڑھا کیسا لٹکا دیا ہے! مر جاتا تو بیٹا کو نوکری مل جاتا۔نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا رہا۔کوئی بولتا۔''ابھی بھی ٹائم ہے بھیا دیکھو بھگوان کب اٹھاتا ہے تیس کے پہلے یا تیس کے بعد، چھورے کی قسمت۔ایسے بچ بھی گیا تو زیادہ دن چلے گا نہیں''۔ہم سبھوں کی بات سن کر بھی ان سنی کر دیتے۔ ہمارے پاس کسی کی بات کا کوئی جواب نہ تھا۔

آخر کار ۲۴ گھنٹے بھی گزر گئے۔ ڈاکٹر نے بتایا..... ''فی الحال بڑا خطرہ تو ٹل گیا ہے مگر دماغ کے اندرونی حصے میں زبردست چوٹ لگی ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کے بابو جی بچ تو جائیں مگر شاید ہی کبھی چلنے پھرنے کے قابل ہو سکیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ماں کا چہرہ ایک جھٹکے میں گھوم گیا تو کیا بابو جی بھی.....؟

میں دہاڑ مار کر رونے لگی۔چھوٹا ایک کونے میں بیٹھا سبکنے لگا اور بڑے بھیا خاموش کھڑے شیشے سے بابو جی کو دیکھتے رہے جن کی زندگی سفید سلنڈر سے پائپ کے ذریعہ چھن چھن کر آ رہی تھی۔ وقت انسان کے ہاتھوں میں نہیں انسان وقت کے ہاتھوں میں ہے جس طرح جنگل میں راہگیر کے سامنے شیر آ جانے پر راہگیر کچھ نہیں کر پاتا جو کرتا ہے شیر ہی کرتا ہے اسی طرح وقت کے پھنسے جبڑوں میں پڑ کر سوائے آنسو بہانے کے ہم اور کر بھی کیا سکتے تھے؟

پوس کی اندھیری رات تھی، ٹھیک ویسی ہی جس رات ماں کو فالج کا اٹیک آیا تھا۔ کپکپا دینے والی ٹھنڈ کے ساتھ رہ رہ کر ہوتی بوندا باندی۔ بھیا نے ہمیں سمجھا بجھا کر گھر بھیج دیا اور خود اکیلے اسپتال میں رہ گئے۔

صبح خبر ملی۔ بابو جی نہیں رہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ بیشتر زبان پر ایک ہی بات..... ''بنو دا نوکری کے لیے اپنے باپ کو مار دیا'' ان تمام الزامات اور کہا سنی کے درمیان بھیا چٹان کی طرح کھڑے رہے۔ چھوٹے کی پڑھائی مکمل ہو گئی۔اسے بنگلور میں ایک اچھی جگہ مل گئی۔ میری شادی طے ہو گئی اور اب چند دنوں کے اندر ہی میری ڈولی اٹھنے کو تھی کہ خبر آئی۔کارخانہ سے لوٹتے ہوئے بھیا اترتے وقت قلی گاڑی سے گر کر تھرولائن سے گزرتی وکرم شیلا کی لپیٹ میں آ گئے اور ہاں..... انہیں نہ تو پارکنسن کی بیماری تھی اور نہ ہی رانگ سائڈ اترنے کی ضرورت۔

◀◀ ● ▶▶

C/o : Prof. Nawal Kishor Singh
Shiv Chandra Path-2 Near SVD School
Kali Mandir Road Hanuman Nagar
Patna Mob: 7870678786

● **امکانات**
● **حمیرہ فضا**

دوسری موت

لوگوں کے وجود متعدد بیماریوں سے گل سڑ جاتے ہیں مگر مجھے جو مرض لاحق تھا اُس نے تو میرے تن من کے گھر سمیت سمجھ بُوجھ کی دیواروں تک کو سیلن زدہ کر دیا تھا۔ اَنگ اَنگ درد سے چُور تھا اور سوچ سوچ پیڑ میں ڈوبی ہوئی۔ مرض کیا تھا دہکتی بھٹی تھی جس کی اَگنی ہردم مجھے سِیکتی رہتی۔ میں چاہے پُڑیاں چاٹ لیتی یا گولیاں پھانک لیتی تب بھی اِس بیماری کا سایہ ختم کیا مدھم تک نہ ہوتا۔ مجھے بیسواں برس لگا تھا اور میرا مرض مجھ سے پانچ سال چھوٹا تھا پر اُس کے ہاتھ کسی پکّی عمر کی جفا کش عورت جتنے سخت تھے اور اُن ہاتھوں کا کھردرا پن ہر پل میرے حواس اور اعتماد کی کھال چھیلتا رہتا۔ میں اَپنے آپ سے شاکی تھی اور اَمّاں مجھ سے بیزار۔

اِس بیماری نے میرے اور اَمّاں کے بیچ ایک دیوار اُسار رکھی تھی۔ بھڑنے اور زچ کرنے کی دیوار۔ کسی بھی بیماری کا سٹکا لگے تو گردوپیش کے لوگ لپیٹ میں ضرور آتے ہیں اور اِس بوسیدہ گھر میں چار ہنستی کھیلتی مُرغیوں چیکی، چندا، چنبیلی اور چُوچی کے علاوہ میری بیمار جوانی اور اَمّاں کا صحت مند بڑھاپا بسے تھے۔ ہم سب کی ماں سانجھی تھی جو ہمیں دانہ بھی ڈالتی اور گالیاں بھی بکتی۔

ہم چار بہنیں تھیں اور بھلا ہو اَبّا کا جس نے پنشن تو چھوڑی ہی پر مرنے سے قبل باقی تین بہنوں کو بھی سسرال پہنچا دیا تھا۔ اَب میں تھی اماّں اور اماّں کا یہ تردُّد کہ میری اچھوتی بیماری سمیت مجھ سے کون بیاہ کرے گا۔ اَمّاں کا گھلنا بجا تھا مگر میں بے اِختیاری تھی سب کچھ کر کے بھی جان بوجھ کر کچھ نہ کرتی۔

یادداشت کا قلم پیچھے گھسیٹو تو پانچ برس پہلے اِس بیماری نے اِبتدائی داؤ کھیلا تھا۔ محلے میں شادی تھی میں اور اماّں جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ اَمّاں کے دکھوں میں ایک بڑا دکھ اوپری منزل کا گھر بھی تھا۔ تالا لگا کر جلدی سے نیچے آ جا، میں جتنے یہ مصیبت ماری سیڑھیاں اُترتی ہوں۔ جی اَمّاں میں نے کسّی ہوئی چٹیا کو جھٹکا دے کر سر کو اثبات میں حرکت دی۔

میں پانچ منٹ ڈیلے پھاڑے تالے کو گھورتی رہی ایسے جیسے پہلی بار کسی نایاب چیز کا دیدار ہوا ہو۔ بس یہی وہ سنہری تالا تھا جس نے میرے شعور کی روشن سلیٹ پر ناسمجھی کی کالک تھوپی تھی۔ جس نے میرے سکون کے لمحوں کو بے سکونی کے زِندان میں جکڑ ڈالا تھا۔ چند ثانیے بعد میں دروازے کے منہ میں تالا ٹھونس کر اُسے یقین کی

رسی سے کھینچنا شروع ہوگئی... کہ تالا لگا ہے کہ نہیں... دروازہ بند ہوا ہے کہ نہیں۔ میں اِس یقین دہانی کے کھیل میں جُتی ہوئی تھی کہ میری نازک کمر پر اَمّاں کے بھاری جوتے کی تھاپ نے شک کا طلسم توڑا۔ نامراد میں آدھا گھنٹہ تیری راہ تک تک کر تھک گئی اور تُو یہاں تالے کے ساتھ کھینچا تانی میں مگن ہے۔ اَمّاں نے اپنا سُکڑا ہوا گُوڈا مسلتے ہوئے پھولی ہوئی سانس میں کہا تو مارے خجالت کے میں نے نظریں تالے سے ہٹا کر زمین میں گاڑ دیں۔

بیماری کا پہلا وار تو اَمّاں ہضم کر گئیں مگر اِس وار نے میری خوداعتمادی کی سِری کھالی تھی۔ اعتماد کا باقی دھڑ بھی ہولے ہولے وہم کے چاقو پہ پھڑک رہا تھا۔ پہلے پہل کی ضربیں ہلکی پھلکی تھیں جیسے دروازے کی چٹخنی بار بار ہِلا جُلا کے بند ہونے کی تصدیق کرنا کہ کوئی چور چکا نہ لوٹ جائے، چولہے کے سوئچ کو مروڑ تروڑ کے اطمینان اندر کھینچنا کہ کہیں گیس نہ سانس دبا دے، ہاتھوں پہ صابن کی رگڑیں مار مار سکون لینا کہ کوئی جراثیم زندہ نہ بچ نکلے۔ یہ عادتیں پکی سے پکی ہوتیں گئیں اور سکھ چین کی جڑیں اُکھاڑتیں اَمّاں کی بھاری بھرکم گالیاں بھی اِن کی نشوونما نہ روک سکیں۔

اِس مرض نے سب سے زیادہ زیاں میری تعلیم کا کیا تھا۔ وہم کی دیمک پوری رفتار سے قطار بناتی ہوئی دِماغ کی اُس الماری تک جا پہنچی تھی جہاں کئی کتابوں کے ڈھیر تھے... خوابوں کی کتابیں... خواہشوں کی کتابیں... اُمیدوں کی کتابیں...... احتمال کی اِسی دیمک نے میری سونے جیسی بیش بہا کتابوں کو مٹی مٹی کر دیا تھا۔ ذہانت اور فراست پر ڈنڈے پڑے تو ہاتھوں میں بھی کھلبلی مچ گئی۔ یہ درست نہیں لکھا... یہ ایسے لکھنا تھا... یہ ویسے لکھتی تو۔ یوں گمان کی اِس تھراہٹ میں اَمّاں کی خوب لعنتیں کمائیں اور کاغذ، قلم کا کثرت سے ستیاناس کیا۔ شک شبہ کی شبنم خفیف سا گیلا کرتی تو کچھ بچت ہوجاتی۔ مگر یہاں تو میں پوری کی پوری وسواس کے دریا کو پیاری ہوچکی تھی۔ بارہویں جماعت میں ساری ساری رات کتابیں رٹ رٹ کر بھی بھروسے کے لب تشنہ رہے۔ ہر پل ذہن و دل بھڑتے رہتے کہ کہیں تو کچھ چھوٹ گیا ہے کہیں تو کچھ نامکمل ہے اور نتیجہ یہ نکلا کہ پورے سُو رے نمبروں سے پاس ہوئی تو اَمّاں کو کیا سر دردی تھی کہ دو خرچوں میں ایک نالائق سا طالبِ علم پڑھاتیں۔ بس گزارش، من مانی کی دکان مزید نہ چلی اور تعلیم کا کھاتا بھی بند ہوگیا۔

جمعہ کا دن تھا اور میں مرغی کو اچھی طرح غسل دینے میں منہمک تھی تا کہ وہ چاولوں کی گود میں اُترنے سے قبل چاولوں جتنی گوری چٹی ہوجائے۔ بس کر دے نفسیاتی مریض...... بخش دے اِس غریب کو یہ نہ ہو کے یہ عاجز آ کر تیرے ہاتھوں میں ہی پک جائے۔ عقب میں اَمّاں کے نوکیلے لفظوں کا پتھر پڑا تو میں ایک دم اُچھلی۔

''بس دھل گئی اَمّاں...... دھل گئی۔'' میں خفت سے منمنائی۔ اَمّاں چلی گئی مگر اُس کی دور تک کوستی ہوئی آواز بھی میرے ہاتھوں سے آٹھ آٹھ بار ہونے والے کاموں کو روک نہ سکی۔

اِس ازار سے اب میں چڑنے لگی تھی۔ گِھس گِھس کے میرے ہاتھ پاؤں اور دھو دھو کر میرا پری اندام چہرہ یوں بھس بھسے ہو گئے تھے جیسے نوّے سالہ بڑھیا کا پلپلا جسم ہوتا ہے۔ اپنی ذات کی تباہی تو ایک طرف تھی میں نے گھر کے راشن کے نظام کو بھی تہس نہس کر دیا تھا۔ نقصان پہ نقصان کے اژدھے جمع پونجی کو نگلنے لگے تو تھک ہار کر اَمّاں نے مجھے ہر شئے سے دستبردار کر کے خود گھر سنبھال لیا۔

وہ دن میں کبھی نہیں بھول سکتی جب اِس بے درماں بیماری نے ایک بڑا داؤ کھیلا تھا۔

''یہ میرا سوٹ استری کر دے ،سوچتی ہوں تیری خالہ کے گھر چکر لگا آؤں۔'' اَمّاں نے بشاش لہجے میں اپنا نیا فیروزی جوڑا مجھے تھمایا ہی تھا کہ اِسی اَثنا میں بڑی آپا کا فون آ گیا۔ میں بڑے سلیقے سے ایک ایک سلوٹ کو انگلی سے پکڑ پکڑ کر باہر نکالنے میں لگ گئی۔

''بلقیس! پونا گھنٹہ تیری بہن سے بات کی ہے اور تو ابھی تک استری سے کھیل رہی ہے بس کر دُر بُد ھ اِس سوٹ کو پہن کر کھڑے نہیں رہنا میں نے۔'' ڈھیلی آواز میں سرزنش کرتی ہوئی اَمّاں نہانے چل دی ۔ پندرہ منٹ بعد وہ واپس آئی تو میں ویسے ہی قمیض کو گس گس کر رگڑیں مارنے میں غرق تھی بس اُس دن گیلی چپل نے میری وہ دھلائی کی کہ میرے نئے پُرانے سارے زخم بلبلا اُٹھے۔

اُس دن میں ایک کمرے میں سمٹی سسکتی رہی اور اَمّاں دوسرے کمرے میں آلتی پالتی مارے پچھتاتی رہی۔ آس پڑوس کی خالہ، چچی، پھوپھی اور میری تین بہنیں اب میرا رشتہ ڈھونڈنے میں سرگرم ہو گئیں تھیں۔ سب کے نزدیک اس بیماری کا یہی حل تھا کہ مجھے فوراً سے بیشتر کسی کے سر منڈ دیا جائے۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا گلے میں پھندا ڈال کے جسم کی کال کوٹھری سے سانسوں کو بھگا دوں اور کبھی کبھی شدت سے آرزو ہوتی کوئی تو ایسا مسیحا ہو جو اِس بیماری کو باندھ کے قابض کر لے اور اِسے ایسی موت مارے کہ میری زندگی تالیاں پیٹ پیٹ کر داد دے۔

آخر بڑی آپا کے سسرالی خاندان سے ایک چھڑے کا رشتہ مل ہی گیا۔ صاحب اِکلوتے تھے اور ماں باپ دنیا سے کوچ کر چکے تھے۔ میری عیب زدہ شخصیت کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا جائے گا اِس لیے اَمّاں کو یہ رشتہ بہت غنیمت لگا۔ سلیم کو ذہنی طور پر تیار کرنے کے لیے میری ذات کی کور کسر کے بارے میں تھوڑا تھوڑا بتا دیا گیا تھا۔ بس ایک دن سادگی سے نکاح ہو گیا اور میں اِس بیماری کے بکسے سمیت پیا گھر جا بسی۔ میں شاد ماں بھی تھی اور سلیم کے رویے پہ حیرت زدہ بھی۔ وہ مجھ سے یوں شفیق رویہ رکھتے جیسا بچوں سے روا رکھا جاتا ہے۔ اُن کے پیار کی پھوار میں بھیگ کر میں نے بھی کھل کر اپنے ناسور کا اِظہار کر دیا تھا۔ میں جو عدم تحفظ کا شکار تھی سلیم کے سایہ عاطفت میں آ کر محفوظ ہو گئی تھی۔ کاش اَمّاں سختی کی بجائے نرمی کا ہاتھ پھیرتی تو یہ مرض اِتنی پھُرتی سے نہ پھیلتا۔ سلیم کی شکل میں مجھے دوا مل گئی تھی، مرہم مل گیا تھا، مسیحا مل گیا تھا۔ نہ اُنہوں نے کبھی مجھے مصیبت سمجھا، نہ نفسیاتی کہا، نہ عذاب جانا۔

''سلیم! میں موت چاہتی ہوں۔'' وہ ایک سندر شام تھی جب لاشعوری طور پر میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو بلقیس؟'' سلیم نے زلزلے کی طرح جھٹکا کھایا۔

''ہاں! موت اِس وہم کی موت، اِس شک کی موت، اِس اُلجھن کی موت، اِس چبھن کی موت۔ میں اپنے اندر اِن سب اَذیتوں کی پہلی موت چاہتی ہوں تا کہ زندگی پہ جمے اِس روگ کا زنگ اُتر ے، تا کہ بے چینی کی آگ میں جھلستی روح پر راحت کا اَبر برسے۔ کیا کبھی ایسا ہو پائے گا؟ کیا میں ٹھیک

ہو جاؤں گی سلیم؟'' میں بولتے بولتے اُمید اور نا اُمیدی کے گھٹنوں پہ سر رکھ کے رو پڑی۔

''تمہارے اندر یہ پہلی موت ضرور ہو گی اور تم جیو گی بااعتماد، پرسکون اور با اختیار ہو کے۔'' سلیم نے میری تھوڑی سے آنسو سنبھالتے ہوئے اِتنے قوی لہجے میں کہا کہ میں اُن کی آنکھوں کے وعدے پہ بھروسہ کر بیٹھی۔

ہماری شادی کو چھے ماہ ہو چکے تھے۔ مرض وقتاً فوقتاً داؤ کھیل رہا تھا۔ سلیم اپنے کام کے ساتھ ساتھ دن رات میری تربیت میں بھی لگے ہوئے تھے۔ جب وہم کا حملہ ہوتا تو میری ڈھال بن جاتے۔ اَپنی ڈھارس سے میرا حوصلہ بڑھاتے۔ باہمت لوگوں کے قصّوں سے میرا خون گرماتے۔ میرے ذہن اور دل کو اِس آسیب سے نکالنے کے لیے اُنہوں نے مجھے کئی مثبت سرگرمیوں میں ڈال دیا تھا۔ گمان کی بیڑیوں سے نجات دِلانے کے لیے اُنہوں نے مجھے کئی سوچوں کی زنجیروں میں اُلجھا دیا تھا۔ سلیم مجھے گھر سے باہر کھلے آسمان تلے لے آئے تھے اِس لیے کہ میں جتنی بار بھی گروں مگر چلنا سیکھ جاؤں۔ اُنہوں نے مجھے ایک ہجوم میں چھوڑ دیا تھا کہ میں جتنا بھی گھبراؤں مگر کھل کے سانس لینا جان پاؤں۔

آج دل بہت شاد تھا، مطمئن تھا۔ سلیم کی ریاضت میں رچی بسی محبت نے آخر میرے مرض کی قبر پر فتح کا جھنڈا گاڑ دیا تھا۔ آج میری شادی کو ڈیڑھ سال ہو گیا تھا اور آج مجھے ہر گھڑی مارتی ساری اَذیتوں کا آخری دن تھا۔ سیاہ لمحوں کے وجود سے روشن لمحے لپٹ چکے تھے، کڑوے پلوں کی شاموں میں میٹھا پل گھل چکا تھا۔ آج ایک عرصے بعد اِس مرض نے نہ کوئی چال چلی تھی نہ کوئی داؤ کھیلا تھا۔ میں بہت خوش تھی بے اِنتہا خوش، خوش ہونے کی ایک نہیں تین تین وجوہات تھیں۔ میرے اندر پہلی موت ہو چکی تھی، مجھے نئی زندگی کی نوید مل گئی تھی اور میرے عزیز جان شوہر کی آج سالگرہ بھی تھی۔

میں خود اعتمادی کی اُنگلی پکڑے اکیلی مارکیٹ نکل آئی تھی۔ مجھے سلیم کے لیے ایک بہترین تحفے کی تلاش تھی۔ دل کیا پورا بازار کھنگال ڈالوں اور کوئی نایاب چیز ڈھونڈ لوں۔ میں ایک کے بعد ایک دکان میں کچھ انوکھا ڈھونڈتی پھر رہی تھی کہ مجھ پہ ایک ناگہانی اِنکشاف ہوا۔ یوں لگا اِرد گرد کی ساری ٹھوس چیزیں ریزہ ریزہ ہو کے ہوا میں تحلیل ہو رہی ہیں۔ پیروں کو سنبھالے فرش نے اُڑنا اور سر کو ڈھانپی چھت نے بیٹھنا شروع کر دیا ہے۔ ایسا لگا ہوا میں آکسیجن اور جسم میں طاقت ناپید ہو گئے ہیں۔ پہلی موت کا جشن مناتے مناتے میرے اندر دوسری موت ہو چکی تھی۔ چند فٹ کی دوری پر سلیم ایک عورت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کچھ خریدنے میں مصروف تھے۔ میرے شک میرے وہم کو پہلی موت مارنے والے نے میرے محبت پہ یقین کو دوسری موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔

◀◀ ● ▶▶

H. No. 67 Gali No. 2
Near Miyanwali Hotel Khayaban Coloni
Rahim Yaar Khan, Pakistan

- امکانات
- گل ارباب

مکافات

ٹھک.....ٹھک.....ٹھک.....دروازے کو کوئی پوری طاقت سے پیٹ رہا تھا۔رات کے اس پہر دستک کی آواز سن کر دائی سکینہ چھت کی لکڑیاں گنتے گنتے رک گئی۔عشا کی نماز پڑھ کر لحاف میں گھسی تھی مگر تہجد تک آنکھ نہ لگی۔

''ہائے وے میرے ربا نہ تب سکھ تھا جب جوان تھی ،نہ اب سکھ ہے جب بڈھی کھوسٹ ہوگئی ہوں۔''اک ٹھنڈی آہ اس کے جامنی ہونٹوں کی قید سے آزاد ہوئی۔''ٹھیک ہی کہتی تھی استانی جی بڑھاپے اور جوانی میں یہ ہی بات تو مشترک ہوتی ہے کہ انکھوں میں جگراتے (رت جگے) بس جاتے ہیں بڑھاپے میں جسم کا درد سونے نہیں دیتا اور جوانی میں دل کا درد.....بس دل لگنے تک نیندیں اپنی ہوتی ہیں یا بڑھاپے سے پہلے۔''اسے اپنی اس استانی کی بات یاد آ گئی جس سے دائی گیرہ سیکھا تھا۔سکینہ بی بی دل بھی لگایا تھا تو کس پتھر سے؟شیشے کو پتھر سے یاری کب راس آئی ہے اس یاری میں ہمیشہ کرچی کرچی تو شیشہ ہی ہوتا ہے۔

بادل نخواستہ وہ گرم لحاف سے بڑبڑاتے ہوئی نکلی۔''صبر کر لے نیک بخت! تو ہوا کے گھوڑے پہ سوار ہے مگر مجھ بڑھیا کو ہوا کے گھوڑے پہ سوار ہونے میں بھی وقت لگتا ہے۔''دروازہ کھٹکھٹانے والے کی جلدی اور بے صبری سے دائی جی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی دردزہ میں تڑپتی ہوئی عورت لائی گئی ہے یا کوئی ایسا ہے دروازے پہ جسے یہ ڈر ہے کہ دائی جی کے در پہ کوئی اسے دیکھ نہ لے ایسے لوگ ہی تو آتے تھے اس کے دروازے پہ کالی راتوں میں.....دائی نے سرہانے رکھی عینک ناک پہ ٹکاتے ہوئے ساتھ سوئی ہوئی شگو کو رشک آمیز نظروں سے دیکھا۔''ابھی دل کا روگ نہیں لگانا اسے...اپنی ماں کی طرح...یہ بھی جھلی کی جھلی ہی ہے...ایسی معصوم جوانی کی بے فکر نیند بھی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔اس بات کا ادراک تب ہوتا ہے جب جوانی ہاتھ سے نکل کر اڑتی ہوئی وقت کی اونچی منڈیر پہ جا بیٹھتی ہے پھر اسے پچکارتے رہو ہار سنگھار کا دانہ ڈال کر پاس بلاتے رہو وقت کے بنیرے (منڈیر) سے اترنے کا نام ہی نہیں لیتی دائی جی نے ٹھنڈی آہ بھر

کے کمرے کی کنڈی کھولتے ہوئے سوچا.....''

''ٹھک ٹھک''.....ارے چھری تلے سانس لو آ رہی ہوں۔''وہ بڑبڑاتے ہوئے چادر لپیٹنے لگی۔

''اس سردی کو دیکھو آدھی رات کو دیکھو۔اور اس مصیبت کو دیکھو؟ارے سکینہ بی بی تیرے لیے یہ کون سا نیا واقعہ ہے عمر گزار دی تو نے راتیں کالی کر کر کے جس کو درد لگتے ہیں سردیوں کی رات کے عین درمیان میں یا گرمیوں کی جلتی دوپہروں میں۔''بڑبڑاھٹ اور خود کلامی تو بڑھاپا سیکھا ہی گیا تھا اور اب بڑھاپے کا یہ سبق روزانہ دہرائی مانگتا تھا دروازہ کھولتے ہی جو عورت کالے برقعے میں لپٹی ہوئی نظر آئی ذرا غور کرنے پر اسے دائی نے پہچان لیا تھا۔وہ گاؤں کے چوھدری رب نواز کی بیوہ بہن صابرہ خاتون تھی اور اس کے پیچھے حویلی کا ملازم جیدا کھڑا تھا۔اونچا لمبا اور مظبوط ہاتھ پاوں والا جیدا گردن گھما کر آس پاس یوں دیکھ رہا تھا جیسے ڈر ہو کہ کوئی اس کی چوری نہ پکڑ لے۔دائی جی نے گلی میں جھانکا دائیں جانب تانگہ کھڑا تھا اصیل گھوڑی بہت خاموشی سے اپنی جگہ یوں سر جھکائے چپ کھڑی تھی جیسے اس بے زبان کو بھی سمجھ آئی ہوئی تھی کہ مالک آج کی رات دائی سکینہ کے در پہ عزت کی بھیک مانگنے سائل بن کے آئے ہیں۔اندر آتے ہی جیدے نے گھبرائے ہوئے انداز میں دروازہ اتنی جلدی بند کیا کہ پل کے ہزارویں حصے میں دائی جی کی جہاں دیدہ نظر ساری صورت حال سمجھ گئی۔اڑی اڑی رنگت والی صابرہ بیگم نے بولنے کے لیے منہ کھولا تو ماتھے پہ پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔حالانکہ موسم تو سخت جاڑے کا تھا۔

''صابرہ بی بی آدھی بات آپ کی دستک نے اور باقی آپ کے ماتھے پہ چمکتے پسینے کے قطروں نے بتا دی ہے اب یہ بتا دو کہ مہینہ کون سا چڑھا ہے؟''دائی جی صابرہ کے بولنے سے پہلے ہی بول پڑی۔وہ جانتی تھی کہ ایسے موقعے پہ وقت نہیں ہوتا ضائع کرنے کے لیے اس لیے بلا تمہید صاف بات کرتی تھی۔جیدے اور صابرہ بیگم نے آمنے سامنے چارپایوں پہ بیٹھے بیٹھے موڑھے پہ ٹکی دائی جی کے جھریوں زدہ چہرے کو دیکھا۔جو کمرے کے عین وسط میں چمکتے زرد بلب کی روشنی میں بہت بوڑھی لگ رہی تھی اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کی۔

''تیسرا لگا ہے حساب سے۔''صابرہ نے سر جھکا کر اتنی آہستگی سے اقرار گناہ کیا کہ دائی جی کی سماعتوں تک بمشکل اس کی آواز پہنچی۔وہ بات ختم کرتے ہوئے مزید ضبط نہ کر سکی اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔دائی جی کی دھندلی آنکھیں چشمے کے پیچھے سے صابرہ کی کلائیوں میں لشکارے مارتی چوڑیوں کو دیکھ کر چمکنے لگیں تھیں۔اسے صابرہ کے رونے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

''اللہ کا حکم ہے کہ زانیوں پہ رحم یا ترس نہ کھاؤ بلکہ ان کو پتھر مار مار کے ختم کر دو تا کہ اوروں کو بھی

سبق ملے.....مگر کون مارے گا پتھر؟ یہاں تو سارے ہی پلید مردار ہیں۔'' دائی کی بڑبڑاہٹ ہونٹوں میں ہی مقید تھی۔ جیدا تڑپ کر اٹھا اور صابرہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اسے چپ کرانے لگا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا بی بی جی! دائی جی کے پاس اس کام کا بڑا تجربہ ہے۔'' دائی نے عینک کے موٹے شیشوں سے اسے گھورا۔

''چل تو ادھر بیٹھ جا دائی جی کے وڈے .....اب تیرا کام ختم اور میرا شروع۔'' دائی جی! نے جیدے! کو باہر صحن میں جانے کا اشارہ کیا۔

''دائی جی! ان کا خیال رکھنا یہ بڑی ڈرپوک... بڑی نازوں کی پلی ہیں۔'' وہ منمنایا۔

''ڈرپوک؟ ہونہہ۔'' دائی جی! نے صابرہ بیگم! کو طنزیہ انداز میں سر سے پاوں تک دیکھا اور پھر جیدے! کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''دائی سکینہ نے اپنی زندگی میں ایسی بہت سی نازوں کی پلی ڈرپوک دیکھی ہیں... اور جو اللہ سے نہ ڈرے وہ بھلا کیسا ڈرپوک ہوا؟'' اس نے شرمندہ سے جیدے کے کمرے سے نکلتے ہی صابرہ سے کہا۔

''آ.....بی بی ادھر لیٹ جا تیرا معائنہ تو کروں۔'' دائی جی نے اشارہ کیا۔ صابرہ نے پلٹ کر جائزہ لیا زمین پہ اک کونے میں پیلے رنگ کی پھولدار چٹائی پڑی تھی جس پہ دو توشکیں بچھا کر ساتھ گاو تکیے رکھے ہوئے تھے۔ اکثر مریض عورتیں ادھر ہی زچگی کے درد سہتیں تھیں پاس ہی بان کی ننگی چارپائی پڑی تھی۔ جو دائی جی کو لیبر بیڈ کا کام دیتی تھی جس کے ساتھ ہی کچھ برتن بھی الگ سے پڑے تھے۔ اک چھوٹی قینچی ناف کاٹنے کے لیے، اور منہ ہاتھ دھونے والا خوشبودار صابن، اور ڈیٹول کی بوتل مٹی کی پلیٹ میں یہ سب چیزیں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ صابرہ اک ٹھنڈی آہ بھر کے زمین پہ بچھی توشک پہ لیٹ گئی۔ آنسو اک تواتر سے اس کی آنکھوں سے گالوں تک کا سفر طے کر رہے تھے۔ بار بار منہ پونچھتے ہوئے صابرہ بہت ڈری ہوئی لگ رہی تھی۔ دائی جی نے معاینے کے بعد بتا دیا کہ'' کام ہو جائے گا۔ دو گھنٹے لگیں گے اور کام کی نوعیت و مشکلات کو دیکھ کر سونے کی دو چوڑیاں اسے کلائی سے کم کرنی ہوں گی۔'' دائی سکینہ کی آنکھوں میں لالچ کی چمک صاف نظر آ رہی تھی۔ صابرہ نے یوں جلدی سے چوڑیاں اتار کر اسے پکڑائیں جیسے اس کی اجلی کلائیوں کو سانپ بن کے ڈس رہی ہوں۔ جیدے نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

''صابرہ بی بی! چودھری صاحب کو کیا بتائیں گی آپ .....وہ تو خود یہ چوڑیاں آپ تینوں کے لیے لائے تھے۔ آپ کے لیے شانو بی بی اور چھوٹی چودھرائن کے لیے۔ انھوں نے پوچھ لیا کہ دو چوڑیاں کم کیوں ہیں تو پھر کیا کریں گی؟'' آئے ہائے دائی جی نے افسوس بھرے انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''کاش ان چودھریوں کو کوئی یہ سمجھا دے کہ بیویاں، بہنیں، اور بیٹیاں، صرف سونے کی چوڑیوں سے خوش نہیں ہوتیں۔ بلکہ بنانے والے نے جو حق دے رکھے ہیں بس ان کا رستہ نہ روکو ان پہ اللہ کی حلال نعمتیں حرام نہ کرو..... بنانے والے کو پتہ ہے کہ اس نے کب کب کون کون سی خواہش دل کے کس کونے میں جسم کے کون سے حصے میں بسا رکھی ہے ان ہی خواہشوں اور ارمانوں کے تنور میں جل کر کویلہ اور پھر راکھ ہو جاتی ہیں یہ عورتیں اور یہ چودھری! ان کو پتہ ہی نہیں کہ کوئلہ اور کوئلے سے راکھ ہوئی عورتوں کو زیور کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ محبت اور خوشیوں کی ضرورت ہوتی ہے جو خواہشوں کی آگ کو سکھ کے ٹھنڈے چھینٹوں سے بجھانے کا کام کرتی ہیں۔'' دائی جی نے گہرے انداز میں بات مکمل کی۔ جیدے کی طرف دیکھ کر صابرہ نے مظبوط لہجے میں کہا۔

''اس وقت مجھے چوڑیوں سے زیادہ اپنی جان کی فکر ہے یہ سوچو انہیں اگر پتہ چل گیا کہ ان کی بہن؟'' صابرہ نے اپنے پیٹ کو دیکھتے ہوئے سیدھے ہاتھ سے چھوا اور جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

''جو بھی کرنا ہے ذرا جلدی کر دائی جی۔'' اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔'' کوئی اٹھ گیا اور میری غیر موجودگی کا راز کھل گیا تو حویلی میں قیامت آ جائے گی۔'' دائی جی نے گیس کا چھوٹا سلنڈر ماچس کی تیسری تیلی سے جلا کر اک پتیلے میں پانی گرم کرنے کے لیے رکھا۔

''ویسے تو اپلے جلا کر ہی کام کرتی ہے میری شگو.....مگر رات میں ایسے کیس کرنے کے لیے یہ گیس کا چولہا بھی رکھنا پڑتا ہے.....اور ہاں سن حویلی والوں سے نہ ڈر تجھ سے کچھ کم نہیں ہیں وہ بھی بزدلی میں'' دائی جی مسلسل بول رہی تھی۔

''اور کون دائی جی؟'' وہ حیران تھی۔

''نہ ٹٹول صابرہ بی بی دائی جی کا دل بہت سے رازوں کا قبرستان ہے بڑی بڑی انہونیوں کو ضرورتوں کا کفن پہنا کر اس قبرستان میں دفن کر دیا ہے۔ اب قبروں سے مردے نکالے جائیں ان لاوارث لاشوں کی شناخت کے لیے.....تو بدبو ہی پھیلے گی نا؟ کیونکہ ان مردوں میں سے شہید محبت کوئی ایک بھی نہیں سارے ہوس کے پھندے گلے میں لگا کر خودکشی کرنے والے ہیں۔ سوچو یہ لاشیں بدبو نہ پھیلائیں گی تو اور کیا کریں گی؟.....ارے یہ راز تو میرے ساتھ ہی جائیں گے۔'' صابرہ کا سوال ابھی منہ میں ہی تھا کہ دائی جی نے بات کاٹی۔

''تو خوش ہو کہ تیرا راز بھی ہمیشہ راز رہے گا.....دو گھنٹے کا کام ڈیڑھ گھنٹے میں تکمیل تک پہنچا کر دائی جی نے سکھ کا سانس لیا۔

صابرہ کا زرد کملایا ہوا چہرہ اس درد اور اذیت کی گواہی دے رہا تھا جو پچھلے ڈیڑھ گھنٹے میں اس نے برداشت کی تھی۔ جیدا باہر سردی میں سکڑا سمٹا دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے مل مل کر جسم کی گرمی سے موسم کی خنکی کا مقابلہ کرتے ہوئے گھڑیاں گن رہا تھا۔ کبھی کبھی رات کی خاموشی میں کتوں کے بھونکنے کی آواز کے ساتھ صابرہ کی درد میں ڈوبی گھٹی گھٹی چیخیں مل جاتیں تو وہ بے چینی سے اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔

''چل اٹھ ہمت کر اور یہ پی لے اس سے لرزہ ختم ہو جائے گا۔'' دائی جی نے صابرہ کو پسی ہوئی سونٹھ کی اک چٹکی کھلا کر اوپر سے گرم گرم دودھ کا گلاس پلا دیا۔

''اب شگو بے چاری صبح سویرے دودھ پتی نہیں پی سکے گی۔'' خالی گلاس صابرہ کے ہاتھ سے لیتے ہوئے دائی نے احسان جتانے والے انداز میں کہا تو صابرہ نے سر جھکا لیا۔ اس کے دانت سردی سے بج رہے تھے۔ دائی جی کو اس نازوں کی پلی کا لرزہ دیکھ کر ترس آ ہی گیا، اور تکیے کے نیچے سے سرخ جرابوں کا اک جوڑا نکال کر اسے دے دیا۔

''یہ پہن لو ورنہ یہ لرزہ تجھے مار ہی دے گا۔'' صابرہ نے شکر گزار نظروں سے دائی سکینہ کو دیکھا اور جلدی جلدی جرابیں پہن لیں۔ چند منٹ بعد جیدا صابرہ کو سہارا دے کر باہر لے گیا دائی جی نے دروازہ بند کرتے ہوئے دیکھا تانگے کے پاس کھڑے ہو کر جیدے نے اپنی چادر اتاری اور لرزتی کانپتی صابرہ کو اس میں ڈھانپ لیا ان کے تانگے میں بیٹھتے ہی دائی جی نے دروازے کی کنڈی اندر سے چڑھا دی۔

☆☆☆

اندر آ کر شگو کا لحاف ٹھیک کرتے ہوئے وہ بوڑھے اور کمزور جسم کی دو گھنٹوں کی فریادیں مزید نظر انداز نہ کر سکی اور بے ساختہ کمر پکڑ کر ہائے ہائے کرنے لگی، ''ایک تو سردیوں کے ساتھ پرانے درد بھی تازہ ہو جاتے ہیں ادھر ہی تو لات ماری تھی ظہورے نے۔ اس لات کا درد وہ آج بھی اپنی کمر میں محسوس کر کے بے ساختہ سسک اٹھی..... اب قبر میں جواب دے رہا ہوگا ان تھپڑوں اور لاتوں کا جو چرس کا سوٹا لگا کر مجھ کمزور پہ برساتا رہتا تھا کم بخت۔ دفعہ دور میں اس کو یاد بھی نہ کروں اگر اس کی دی ہوئی چوٹوں سے ٹیسیں نہ اٹھیں۔ اب تو ایک سردی اور دوسری سردی ہی یاد کرتی ہوں اس بیرحم کو..... جب جب بدن کے بھولے بسرے زخموں سے ٹیسیں اٹھنے لگتی ہیں۔'' اتنی بڑی لوٹھا کی لوٹھا ہوگئی ہے وہ بڑی محبت سے شگو کے معصوم چہرے پہ آئی ہوئی کالی لٹ کو کان کے پیچھے کرتے ہوئے مسکرانے لگی۔ مگر یوں اپنے آپ سے بے خبر ہو کر سوتی ہے کہ جیسے بھنگ پی کر سوئی ہو۔ لحاف ٹھیک کرتے ہوئے دائی کی آنکھوں کے سامنے سترہ سال پرانی اک ایسی ہی رات کے مناظر انگڑائیاں لیتے ہوئے جاگنے لگے ایک کے بعد ایک منظر آنکھیں ملتا ہوا دائی

کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

دروازے پہ یوں ہی دستک ہوئی تھی ایسی ہی سردی کی کالی سیاہ رات تھی لوگ اپنے گھروں میں لحافوں میں دبکے ہوئے تھے گلیوں میں صرف آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں چاند کی پہلی تاریخیں تھیں روشنی اور اندھیرے کی جنگ چھڑ چکی تھی مگر روشنی کی کمزور کرنیں چاندنی کا لباس پہن کر اندھیرے سے لڑ تو رہی تھیں لیکن جیت نہیں سکتی تھیں جیت کے لیے ابھی چاند کی درمیانی تاریخوں کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اندھیرا روشنی سے جیت کر پورے گاؤں میں دندناتا ہوا اکڑ اکڑ کر گھوم پھر رہا تھا تب دروازہ کھولنے جو دائی سکینہ باہر نکلی تھی وہ تکیے کے نیچے بڑا سا ٹوکا، رکھ کے سوتی تھی بیوگی کے بعد کوئی ایسا نہ تھا جو اس کا سہارا بنتا..... ''کون ہے؟ وہ موٹی اونی چادر کی بکل مار کے تیز ٹوکا، چادر کے اندر بغل میں چھپائے کمرے سے نکلی تھی۔

''آپاں جی دروازہ کھول دے میں ہوں نوری شیدے نائی کی بیٹی۔'' دروازہ کھولتے ہی اسے شیدے نائی کی کم عمر بیٹی کے پیچھے چودھری رب نواز کھڑا نظر آیا۔ گاؤں کا چودھری تھا سارا گاؤں اس سے واقف تھا اور وہ تو اچھی طرح اس سے واقف تھی جب ظہورے کے مرنے کے بعد وہ حویلی اور حویلی والوں کی پناہ میں چلی گئی تھی تبھی چودھری سے مکمل تعارف ہوا تھا ایسا تعارف کہ جسے چودھری بھی مرتے دم تک بھول نہ پائے گا۔ وہ حویلی میں اس کی دوسری رات تھی رات کے آخری پہر سوتے میں اپنے بدن پہ کسی کے ہاتھوں کا لمس محسوس کرتے ہی اس نے تکیے کے نیچے چھپایا ہوا ٹوکا، تیزی سے نکالا اور اس سے پہلے کہ دست درازی بڑھتی وہ ٹوکا، سیدھا اس ہاتھ پہ مار دیا جو اس کے پاکیزہ بدن سے عصمت کی چادر اتارنے کے درپے تھا۔

''اف۔ وہ زخم لگتے ہی کراہا اور اس سے پہلے کہ وہ بتی لگاتی وہ غائب ہو گیا تھا۔''

''بی سکینہ! کیا ہوا؟'' مختاری جوان کاموں میں چودھری کی دلالی کرتی تھی اس کے سر پہ کھڑی پوچھ رہی تھی۔

''شاید کوئی جانور اندر گھس آیا ہوگا۔'' اس کا جواب نہ پا کر سفید توشک پہ خون کے قطرے دیکھتے ہوئے اس نے خود ہی تبصرہ کیا۔''

''ہاں مختاری جانور ہی تو تھا وہ پرسوچ انداز میں ٹوکے پہ نظریں جمائے طنزیہ انداز میں بڑبڑائی۔'' حویلی کے جانوروں سے کہہ دو کہ سکینہ بی بی کا شکار ناممکن سی بات ہے سو جو مردار کھا رہے ہیں اسی پہ گزارا کریں۔ معنی خیز بات کی سمجھ آ گئی تھی مختاری کو..... صبح بڑی چودھرائن سے اجازت لے کر وہ باہر نکل رہی تھی کہ چودھری نظر آ گیا اس کے ایک ہاتھ پہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ سکینہ نے اسے دیکھا اور وہ نظریں چرا

گیا.....اور جب وہ حویلی والوں کا آسرا چھوڑ کر استانی جی کی شاگردی میں کام کرتے کرتے نام پیدا کر چکی تھی.....آس پاس کے گاؤں میں بھی.....تب اسے ایک بار پھر چودھری نظر آیا تھا۔ دبلی پتلی سی نوری اس وقت کچھ بدلی بدلی سی نظر آ رہی تھی کچھ پھیلی پھیلی سی اور کچھ گھبرائی ہوئی سی۔ چودھری نے اندر گھستے ہی رعب دار آواز میں اسے مخاطب کیا۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے دائی سکینہ! میں چودھرائن سے دو گھنٹے کا کہہ کر نکلا ہوں جو بھی کرنا ہے جلدی کر۔'' اک موٹا سا خاکی لفافہ تیزی سے پکڑتے ہوئے اس نے نوری سے سوال کیا۔

''مہینہ کون سا لگا ہے؟''

''پتہ نہیں آپاں!'' وہ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے ٹکر ٹکر دیکھنے لگی تھی۔ بہت کم عقل سی لڑکی تھی وہ.....سارے گاؤں والے اسے نوری جھلی کے نام سے بلاتے تھے.....وہ چودھریوں کی حویلی میں کام کرتی تھی اور رہتی بھی حویلی میں ہی تھی۔

''کب سے ہو رہا تھا یہ سب؟'' دائی نے اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا تو اب کی بار وہ بے بسی سے چودھری رب نواز کی طرف دیکھنے لگی۔

''آپاں جی پتہ نہیں کون سا مرض لگ گیا ہے مجھے... پہلے تو میں یہ سوچ کر چورن کھاتی رہی کہ پیٹ میں گیس ہو گئی ہے۔ لیکن اب تو میرے ٹیڈ (پیٹ) میں کوئی چیز سپ (سانپ) کی طرح پھرتی رہتی ہے۔'' اس کی بات سن کر دائی سکینہ کے دل پہ اک گھونسا سا پڑا۔

''اوئے تو خود دیکھ لے۔ اس جھلی نے مجھے بہت دیر سے خبر کی ورنہ میں وقت پہ ہی کچھ کرتا۔'' وہ بے شرمی سے کہہ رہا تھا۔

''معائنہ کے بعد پتا چلا ہے کہ یہ تو پورے دنوں سے ہے۔'' دائی نے چوھدری کی طرف ملامتی نظروں سے دیکھ کر دھیمے لہجے میں کہا۔

''مختاری بھی اب ہڈ حرام ہو گئی ہے.....'' وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

''اب کیا ہو گا؟'' چودھری کے انداز میں تشویش در آئی تھی۔

''ہونا کیا ہے کوشش کرتی ہوں کہ بچہ جلدی پیدا ہو جائے مگر پہلے سے بتا رہی ہوں اس کیس میں خطرہ بہت ہے نوری کی زندگی کو.....اگر ممکن ہو تو کسی ڈاکٹر سے کیس کروا لیں۔''

''پاگل ہو گئی ہو تم وہ غرایا۔ میں اسے کیسے شہر لے جا سکتا ہوں؟ تم جانتی ہو یہ راز کھل گیا تو میرے مامے اور مامے کے سات پتروں نے مجھے زندہ نہیں چھوڑنا۔'' چودھری کی بیوی اس کی ماموں زاد تھی اور

سات بھائیوں کی اکلوتی بہن بھی تھی۔ دائی نے کچھ سوچا اور ترس بھری نظروں سے معصوم اور ناسمجھ سی نوری کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''اور ہاں.....ایک لفافہ اور لگے گا چودھری جی اس مشکل کام کو آسان بنانے کے لیے۔'' لالچ سے زیادہ اکیلی جان کی ضرورتیں اس کے سامنے منہ پھاڑے کھڑی تھیں۔ وہ موقعے سے فائدہ اٹھانا سیکھ گئی تھی۔ اب کہ چودھری نے اسے ملامت امیز نظروں سے گھورا اور جیب سے کچھ پیسے اور نکال کر اسے پکڑا دیئے۔ پہلا بچہ تھا کم عمری بھی تھی نوری کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ فجر سے پہلے دو انہونیاں ہوئیں اک مات اور اک موت.....اک تو دائی کا تجربہ ہار گیا اور دوسری نوری زندگی ہار گئی۔ بچی کے رونے کی آواز سن کر چودھری بڑبڑایا۔

''اسے چپ کرا دے۔ ورنہ پاس پڑوس والے پوچھنے لگیں گے کہ کس کا بچہ ہوا ہے؟'' نوری کا سفید لٹھے جیسا بے جان چہرہ اور بے نور ادھ کھلی آنکھیں درد کی تصویر بن کر دائی سکینہ کو رلا رہی تھیں.....مگر چودھری کی آنکھوں میں نہ پچھتاوا تھا نہ سولہ سالہ نوری کی جوان جہان موت کا دکھ تھا۔ سپاٹ چہرے کے ساتھ اس نے نوری کے بے جان بدن کو دیکھا اور ابھی دائی نے بچی کو کپڑے میں بھی نہیں لپیٹا تھا کہ وہ نوری کی لاش دونوں بازوں میں اٹھا کر باہر نکلنے لگا۔

''یہ راز تیرے اور میرے علاوہ اگر کسی تیسرے تک پہنچا تو میں ان تینوں کو دو کرنے میں اک منٹ بھی نہیں لگاؤں گا۔ سمجھ گئی ہو نا؟'' اس کے لہجے کی کرختگی، دائی کا دل دہلا گئی۔

''اس کا کیا کروں چودھری صاحب؟'' وہ گلی کے دروازے پہ پہنچ گیا تھا باہر نکلنے سے پہلے اک پل کے لیے رکا اور بنا پیچھے مڑے بولا۔

''یہ جو کونے میں مٹی کی سینک پڑی ہے اس کے نیچے رکھ کر آدھا گھنٹہ چھوڑ دے سانس بند ہونے سے مر جائے گی پھر بے شک باہر کھیت میں پھینک دینا صبح تک کتے چیر پھاڑ کر کھا جائیں گے کسی کو خبر بھی نہ ہو گی کہ انسان کا بچہ تھا یا کوئی جانور تھا۔'' سفاکی کی انتہا کر دی تھی اس بے رحم انسان نے.....جسے انسان کہنے سے پہلے سو بار سوچنے کی ضرورت پڑتی تھی جبکہ درندہ کہنے سے پہلے ایک بار بھی سوچنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ چودھری نے اک پاؤں دھلیز سے باہر رکھا ہی تھا کہ وہ بول پڑی۔

''چودھری صاحب میرا کوئی نہیں ہے اس دنیا میں اسے اولاد کی طرح پالوں گی اگر آپ اجازت دیں تو؟''

''ٹھیک ہے خود ہی سنبھال لینا پھر سارا معاملہ۔ میں جانتا ہوں تو راز چھپانے کا ہنر جانتی ہے،''

یہ کہہ کر وہ کسی سانڈ کی طرح ہلتا ہوا نوری کی لاش اٹھائے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

صبح ہوتے ہی محلے بھر میں مشہور ہو گیا کہ دائی جی کے گھر دوسرے گاؤں کی کوئی عورت اپنی بچی چھوڑ گئی ہے اس ڈر سے کہ یہ پانچویں بچی گھر لے گئی تو ساس طلاق دلوا کر چھوڑے گی۔ نوری کی جوان موت کا معمہ ایسا تھا کہ کسی نے بچی والے قصے میں زیادہ چھان بین نہیں کی تھی۔ نوری کی لاش حویلی کے کنوئیں سے نکالی گئی تھی اور بنا کسی تحقیق کے دوپہر تک اسے دفنا بھی دیا گیا تھا۔ یوں دائی نے اپنے خالی دل اور خالی زندگی کو مامتا کے حسین رنگوں سے سجا لیا تھا۔ شگو کو دیکھ کر دائی اکثر سوچتی کہ اس رات نوری مری نہیں تھی بلہ دوبارہ زندہ ہو گئی تھی۔ دائی نے یادوں کے بھنور سے دماغ کی ناؤ کو بمشکل کھینچ تان کر باہر نکالا اور سوئی ہوئی شگو کی کلائی کی طرف دیکھا چار سونے کی چوڑیاں بالکل اسی ڈیزائین کی شگو کی دودھیا کلائی میں سجی ہوئی تھیں۔ ''اب کل ہی بلا کر اس کی ساس کو کہتی ہوں کہ اپنی امانت لے جائے بیاہ کر۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے پھر سے بڑھاپے کا سکھایا ہوا سبق دھرانے لگی.....

صابرہ کی دی ہوئی چوڑیاں اپنے سر پہ اوڑھی ہوئی چادر کے پلو سے کھول کر بڑی آہستگی سے سوئی ہوئی شگو کی کلائی میں پہنا دیں وہ نیند میں تھوڑا سا کسمسائی مگر پھر ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگی دائی نے اس کے ماتھے کو چوما اور پیار سے اس کی اجلی کلائی کو دیکھنے لگی جس میں چمکتی ہوئی موٹی موٹی سونے کی چھ چوڑیاں بہت جچ رہی تھیں۔ شگو کی کلائی نرمی سے پکڑ کر دائی جی دو چوڑیوں کو انگوٹھے اور ساتھ والی انگلی کی مدد سے الگ کرتے ہوئے بڑبڑائی۔

''یہ دو ہو گئیں۔ چودھری کی سوتیلی ماں شبانہ بیگم کی، یہ دو ہو گئیں چودھری کی بڑی بیٹی شانو بی بی کی، اور یہ دو ہو گئیں چودھری کی بیوہ بہن صابرہ بی بی کی۔

◀◀ ● ▶▶

House of SP
Arbab Shafiulla
Village Ranograri Near Chamkani
Tehsil & Dist Peshawar (Paskistan)

● امکانات

● قیصر دلاور جدون

ماں

رب ارحمھما کما ربیٰنی صغیراً (سورۃ بنی اسرائیل)

فقیر محمد نائی کی دکان گلی کے نکڑ پر تھی۔ کون کس وقت آتا جاتا ہے، اور کدھر آتا جاتا ہے کیوں آتا جاتا ہے اس کی مکمل معلومات فقیر محمد کو ہوتی تھی۔ محلے کا کوئی شخص اگر تھوڑی دیر کے لیے ادھر اُدھر ہو جائے تو فقیر محمد سے دریافت کر لیا جاتا۔ فقیر محمد یار فلاں آدمی کو تو دیکھا ہے؟ پھر جھٹ سے جواب ملتا ہاں جی وہ تھوڑی دیر پہلے اس طرف جا رہا تھا۔ فقیر محمد سادہ طبیعت کا مالک، سچا اور کھرا انسان تھا۔ آج صبح حسب معمول آتے ہی اپنی دکان کو چمکا رہا تھا۔ اتنے میں بڑے صاحب آ گئے۔

''السلام علیکم فقیر محمد کیسے ہو؟''

''وعلیکم السلام صاحب جی! رب سونڑے کا بڑا کرم ہے جی، بیٹھیے خط بناؤں کے بال بھی کٹا دیں گے؟''

بڑے صاحب کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے:

''پہلے خط بناؤ، اور یہ بتاؤ کے پچھلے دنوں تمہاری دکان بند کیوں رہتی تھی؟ تمہیں تو پتا ہے کہ میں تمہارے علاوہ کسی سے حجامت نہیں بنواتا۔''

فقیر محمد بڑے صاحب کے گلے میں کپڑا ڈالتے ہوئے بولا:

''وہ بڑے صاحب جی! میری ماں بہت سخت بیمار تھی جی۔ دو تین مہینے بہت علاج کروایا ہے پھر رب سوہنڑے کو کج ہور ہی منظور تھا جی، اُن کی وفات کے بعد چالیسویں تک دکان بند رکھی ہے۔ ہمارے ہاں رواج ہے جی چالی (چالیس) دن تک لوگ دعا کرنے آتے رہتے ہیں۔''

''بہت دکھ ہوا تمہاری ماں کی موت کا سن کر۔ مگر مجھے تو اس بات کا علم نہیں ہوا، ورنہ میں آتا تعزیت کے لیے تمہارے پاس۔'' بڑے صاحب نے سامنے شیشے سے فقیر محمد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس صاحب جی جس دن سے ماں مری ہے سچ پوچھیں تو نہ ہنسنے کو دل کرتا ہے نہ سجنے سنورنے کو۔ مجھے تو لگتا ہے جی جیسے مرا دل وی ساتھ ہی مر گیا ہے۔ پتہ نہیں کیوں جی۔ پہلے میری دکان میں اونچے اونچے گانے لگے ہوتے تھے ہر ویلے (ہر وقت) پر اب دل نہیں چاہتا کے کوئی گانا سنوں۔'' فقیر محمد استرے

میں بلیڈ لگاتے ہوئے اپنے دکھ سنانے لگا۔

''لگتا ہے تم بہت پیار کرتے تھے اپنی ماں سے۔'' بڑے صاحب نے شیشے سے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''لو جی!! یہ بھی کوئی بات ہے۔ بھلا ایسا کوئی پتر ہوگا جسے ماں سے پیار نہیں ہوگا۔ صاحب جی اک بات کہوں آپ سے۔ سچ پوچھیں تو یہ ماں رب کی بہت وڈی نعمت ہوتی ہے جی اولاد کے لیے، رب سوہنڑے کا بہت وڈا احسان ہے۔ میرے ابا کو مرے ہوئے وی (۲۰) سال ہوگئے ہیں جی پر مجھے کدی یہ احساس نہیں ہوا کے میں یتیم ہوں پر پتہ نہیں کیوں جی جدوں سے ماں مری ہے لگتا ہے سب کجھ اجڑ گیا ہے جی، سارا باغ لٹ گیا۔''

فقیر محمد کی پلکوں کی فصلیوں سے آنسو چھلکنے لگے۔ وہ باتوں کے ساتھ ساتھ استرے سے کام بھی دکھاتا جا رہا تھا۔ بڑے صاحب اس کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے اور سوچ رہے تھے۔ کے فقیر محمد کے ہاتھوں کی کاریگری بھی کمال ہے جو مشین کی طرح چل رہے ہیں مگر وہ اپنے دکھ بھی سناتا جا رہا ہے۔

''کیا ہوا تھا تمہاری ماں کو؟'' بڑے صاحب نے کرسی پہ تھوڑا اُٹھ کے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بس جی صاحب جی میری ماں کو کوئی اک بیماری نہیں تھی۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے ناں، میں نے کدی ماں کو کھُل کے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا نہ کدے ہار سنگھار کیئے۔ کیوں کے میری ماں کے ماں پیو تو مرے تھے ہی پرسنگ کے بہن، بھائی وی وقت کے ساتھ ساتھ مر گئے تھے۔ اور پھر ابا کی موت نے ماں کو اندر ہی اندر سے توڑ دیا تھا جی۔ وہ ہم بہن بھائیوں کے ساتھ ہنستی تو تھی اور خوش خوش رہنے کی کوشش بھی کرتی تھی پر کوئی اس کی ہنسی کے پیچھے چھپے دکھ کو نہیں دیکھتا تھا جی۔ وہ جتنے دکھ تھے صاحب جی وہ وقت کے نال نال بیماریاں بن کے سامنے آتے رہے پہلے بی پی ہائی ہوا پھر شوگر دی شکایت ہوئی اور دل دیاں بیماریاں جاگ اُٹھیا، تے آخر کار گردوں میں پانی پڑ گیا۔ پھر ڈائیلاسز کے بعد ہوش آیا اور کجھ دیر بعد فوت ہوگئیں۔'' فقیر محمد نے ماں کی بیماریوں اور فوت تک کے داستاں سنائی اور آخری فقرہ کہتے ہوتے اس کی آواز رندھ گئی۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پایا جانے اس لمحے اس نے کیا سوچا ہوگا۔

''لو جی صاحب جی آپ کو خط بن گیا ہے۔'' فقیر محمد نے آنکھوں سے آنسوؤں صاف کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا تھوڑی بالوں کی بھی صفائی کر دو یہ جو بال کانوں کے اوپر آ رہے ہیں انہیں تھوڑا ہلکا کر دو اور ہاں ذرا اوپر سر کے بال بھی تھوڑا چھوٹے چھوٹے کر دو۔'' بڑے صاحب نے فقیر محمد کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''جی صاحب جی! ابھی کر دیتا ہوں۔'' فقیر محمد ہاتھ میں قینچی اور کھنگی لے کے بالوں کی کٹائی میں مصروف ہوگیا۔

''تم صاف اور سیدھے سیدھے انداز میں باتیں کرتے ہو!'' بڑے صاحب نے ہلکی سی

مسکراہٹ کے ساتھ کہا تا کہ ماحول میں پھیلی سوگواریت ختم کی جا سکے۔

''صاحب جی مجھے آپ جیسے بڑے لوگوں کی طرح موٹے موٹے لفظ تو بولنے نہیں آتے جی، پر میں اک بات بتاؤں جی آپ کو۔ ابا کی مرنے کے بعد کے وی (۲۰) سالوں میں مری ماں نے ہم سب بہن بھائیوں کو اکھٹا کر رکھا تھا۔ سب موتیوں کی طرح اک مٹھی میں تھے پر جب ماں مری تو یہ مٹھی کھل گئی۔ صاحب جی ہم دانہ دانہ بکھر گئے۔ وکھو وکھ (الگ) ہوگئے ہیں صاحب جی وہ بوٹا ہی نہیں رہا کے جس کی چھاؤں میں ہم سب بیٹھتے تھے۔ جس کی وجہ سے ہم اک دوجے کی زیادتیاں بھی برداشت کر لیتے تھے۔ پر ہن صاحب جی ہر ہر گل کا حساب ہے جی ہر گل کا۔'' فقیر محمد بات کو پھر ماں کی طرف لے گیا۔ اس کے ہاتھ مسلسل کام میں لگے تھے اور وہ ساتھ ساتھ اپنے دکھڑے بھی سنا رہا تھا۔

''تم نے یہ دکھ دل پہ لے لیا ہے فقیر محمد یہ تو قدرت کا قانون ہے مائیں سب کی مرا کرتیں ہیں۔ بس رب کی رضا پہ آمین کہنی چاہیے۔'' بڑے صاحب نے فقیر محمد کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھ گئے کے ماں کی جدائی نے فقیر محمد کو بہت دکھی کر دیا ہے۔

''ٹھیک کہتے ہیں صاحب جی۔ پر ماں کا دکھ بھلا اتنی جلدی وی بھلایا جا سکتا ہے۔ ویکھو نہ جی میں چھوٹا سا تھا مری ماں نے مجھے اُٹھا کے سینے سے لگایا ہوگا، میری کنگھی کی ہوگی مجھے کھانا کھلایا ہوگا، میرے ہاتھ پاؤں کی مالش کی ہوگی اور اور میرے لیے ساری ساری رات جاگی ہوگی۔'' فقیر محمد نے سرد آہ بھر کے کہا۔

''یہ تو ہر ماں کرتی ہے فقیر محمد صرف تمہاری ماں نے تو نہیں کیا ناں۔'' بڑے صاحب تھوڑا طنزیہ لہجے میں بولے۔

''پر صاحب جی! مان لیا کے ایسا ہر ماں کرتی ہے پر جو میں نے کیا ہے ایسا ہر پتر نہیں کرتا صاحب جی۔'' فقیر محمد تھوڑی دیر کے لیے ہاتھ روک کے بڑے صاحب کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا جیسے صاحب جی کے متوقع سوال کا انتظار کر رہا ہو۔

''کیا ایسا کر دیا ہے تم نے؟'' بڑے صاحب تجسس سے بولے۔

''صاحب جی! میں دنیا کے چند اُن خوش نصیب پتروں (بیٹوں) میں سے ہوں جی، جنھوں نے بیماری میں اپنے ماں باپ کو سنبھالا ہے۔ میں نے اپنی ماں کو سینے سے لگا کے اُٹھایا ہے جی۔ ہاتھ پکڑ کے چلایا ہے جی، اور اُن کے سر کی کنگھی کی ہے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا ہے اور ہاتھ پاؤں کی مالش کی ہے۔ صاحب جی! اور اور ہسپتال میں ساری ساری رات جاگا ہوں صاحب جی یہ تو میرے مولا کا مجھ پہ کرم تھا ورنہ اور وی بھائی تھے پر رب جی نے یہ مہربانی مجھ پہ ہی کرنی تھی جی۔ جب ماں جی کا انتقال ہوا تھا تو میں اور میری بیوی اور میری اک چھوٹی بہن اور بھائی

پاس تھے۔ میں آخری تین دن اک پاؤں پہ کھڑا رہا ہوں جی باقی سب تو آتے جاتے رہے ہیں۔'' فقیر محمد نے کہا۔

''تو گویا تم اب یہ سمجھتے ہو کے تم نے ماں کی محبت اور خدمت کا حق ادا کر دیا ہے۔'' بڑے صاحب کی باتوں میں طنزیہ لہجہ صاف صاف چھلکنے لگا تھا۔

''توبہ توبہ صاحب جی میں نے تو ایسا کبھی سوچا بھی نہیں نہ نہ نہ جی اللہ سائیں معاف کرے میں تو ماں کی جا گی ہوئی اک رات کا بھی قرض نہیں اُتار سکتا جی۔ وہ تو باتوں سے بات نکل آئی تو بتا دیا۔''

''لو جی بڑے صاحب جی! آپ کی کٹنگ ہوگئی۔'' فقیر محمد نے گلے سے کپڑا کھولتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا جیسے وہ اپنا دکھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔

''بڑے صاحب تو کسی سوچ بھی ڈوبے ہوئے تھے۔

بڑے صاحب کے اندر سے کئی آوازیں سر اُٹھا رہیں تھیں جنھیں وہ دبانا چاہتے ہوئے بھی نہیں دبا سکتے تھے۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے بیس برس پرانا منظر آ گیا جس وقت وہ گاؤں سے نوکری کی خاطر شہر آئے تھے۔ شہر میں آنے کے بعد کچھ عرصہ تو گاؤں میں آنے جانے کا سلسلہ چلتا رہا لیکن شہر میں ہی شادی کر لینے کے بعد یہ سلسلہ کم ہوتا چلا گیا اور آخر کار ختم ہوگیا۔ جب کبھی گاؤں سے کوئی خط آتا یا کوئی آنے والا خبر لاتا کے تمہاری ماں بہت سخت بیمار ہے اور تمہیں بلاتی ہے تو اس بات کو محض اس لیے نظر انداز کر دیتا کے میں اگر اب گاؤں جاؤں گا ایک تو نوکری سے چھٹی نہیں ملے گئی اور دوسرا خرچہ بہت ہو جائے گا۔ یوں وہ شہر کی گوناں گوں مصروفیات میں پھنسا رہا۔ وہ اس بات بات کو بھول گیا کہ ایک بوڑھی بیمار ماں گاؤں میں چارپائی پر لیٹی اس کی راہ تک رہی ہے۔ اسے خیال تک نہ گزرا کہ اس کی ماں ہر آہٹ پر اسی کی آمد کا خیال کرتی اور اسی امید سے دروازے کو تکتی تھی کہ اس کا بیٹا آ گیا اور جب سے اس کی بینائی زائل ہوئی وہ دورازے کی ہر آہٹ کے بعد نذیر محمد کی آواز سننے کے لیے بے تاب رہتی۔ اور ہوتا بھی یوں کہ کوئی خاتون شہر سے آتی اور بوڑھی ماں سے ملنے جاتی تو بوڑھی ماں اسے اپنے بیٹے کے بارے میں ضرور پوچھا کرتا لیکن آنے والی خاتون مسکرا کر کہتی کہ شہر تو انسانوں کے سمندر ہیں وہاں کون کسی کو ملتا ہے۔ ماں ایک لمحے سوچ میں پڑ جاتی کہ کیا میرا بیٹا مجھے بھی بھول چکا ہوگا! اور پھر اگلے لمحے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیتی اور اسے خیال آتا کہ وہ بہت مصروف ہوگیا ہوگا۔ اور پھر ماں کے منہ سے دعائیں نکلتی تھیں۔

یوں ہی وہ اپنی ملازمت کرتا رہا اور پھر! ایک دن آفس کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، آفس بوائے نے لپک کر ریسیور اٹھایا:

''ہیلو جی نذیر محمد سے بات ہوسکتی ہے؟'' یہ درد سے رچی ہوئی آواز بڑے صاحب کے بھائی کی تھی۔

''جی آپ ایک منٹ ہولڈ کریں''۔ آفس بوائے نے ریسور کو میز پہ رکھ کر آواز دیتے ہوئے

کہا نذیر صاحب آپ کا فون ہے۔

''ہیلو کون؟'' بڑے صاحب بولے۔

''نذیر! میں بشیر محمد تیرا ویر۔ نذیر محمد! ڈاکٹروں نے بے بے کا جواب دے دیا ہے کہتے ہیں کے اب نہیں بچے گی جب ہوش میں آتی ہے تو کہتی ہے نذیرے میرے پتر تو آ گیا ہے نذیرے میں تو اندھی ہوگئی ہوں، تیری راہ تک تک کے میرے لال! شکر ہے تو آ گیا ہے۔ نذیر محمد! دیکھ اب بھی وقت ہے چھٹی لے کے آجا، دیکھ ماں اب دیکھ تو نہیں سکتی پر تیری آواز تو سن لے گی نا! دیکھ تجھے رب کا واسطہ بے بے کا ساہ سکھ سے نکلنے دے۔'' بڑے صاحب کا بھائی مسلسل منتیں کرتے ہوئے روئے جا رہا تھا۔

''نہیں لالا! بہت مشکل ہے ادھر سے چھٹی ہی نہیں ملتی۔'' نذیر محمد نے جب یہ کہا تو دوسری طرف سے فون بند ہوگیا۔ نذیر محمد سمجھ گیا کے بھائی نے غصے سے فون بند کر دیا ہے۔

پھر کچھ دنوں بعد گاؤں سے بندہ آیا ہے کے تیری بے بے فوت ہوگئی ہے۔ نذیر محمد کو ہلکا سا دکھ اور افسوس ہوا لیکن پھر چند دنوں بعد حالات معمول پر آ گئے۔

بڑے صاحب سوچوں میں گم تھے۔ فقیر محمد بولا: ''صاحب جی صاحب جی کدھر گم ہو گئے ہیں؟''

بڑے صاحب ایک دم سے بوکھلائے: ''کک..... کک..... کچھ نہیں بس ویسے ہی کچھ سوچنے لگا تھا۔ اچھا تو کتنے پیسے بنے ہیں تمہارے؟''

''جو دل ہے جی دے دیں۔ میں نے پہلے کبھی مانگے ہیں جو، اب مانگوں گا!''

بڑے صاحب نے جیب سے سو کا نوٹ نکالتے ہوئے کہا

''یار فقیر محمد تو بہت خوش قسمت ہے یار بہت خوش قسمت تو نے اپنی زندگی میں وہ کچھ کما لیا ہے جو میں نے نہیں کما سکا مجھے آج اس سوال کا جواب مل گیا ہے کے میرے بیٹے کا شان اور حنان مجھے کیوں تنہا چھوڑ گئے ہیں! اب اس اتنی بڑے حویلی میں میں تن تنہا کیوں رہے گیا ہوں! کیوں کسی کسی وقت نذیر پتر نذیر پتر کی آواز مجھے سوتے ہوئے جگا دیتی ہے۔''

فقیر محمد نے پیسے جیب میں ڈالتے ہوئے کہا:

''صاحب جی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جی میرا پتر رشید تو کہتا ہے کہ ابا اب تو دکان پہ نا آیا کر بس اب نماز روزہ کرا اور غم خوشی پہ جایا کر۔ میرے پہ تو رب سوہنڑے کا بہت کرم ہے جی۔''

◀◀ ● ▶▶

H. No. B1/412 Mohalla RAhampura
Hazara Road, Hasan Abdal
Dist Attok (Pakistan) 923145313104

● انتخاب

● ڈاکٹر افشاں ملک

افتادہ اراضی

نفیسہ بی نے اپنے وسیع وعریض لیکن کھنڈر ہوتے جا رہے مکان کی چھت سے مجھے اُفتادہ اراضی کا وہ قطعہ دکھایا جو اس کے مرحوم والد نے نفیسہ بی کے نام لکھ دیا تھا اور پھر کچھ عرصہ بعد ہی وہ دنیا سے سدھار گئے تھے۔ میں نے نفیسہ بی کی طرف دیکھا اور پھر اُفتادہ اراضی کی طرف۔ دونوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔ بلکہ ایک لمحہ تو ایسا آیا جب میں نے محسوس کیا کہ نفیسہ بی خود ہی ایک ایسی افتادہ اراضی کا وہ قطعہ ہے جو کبھی مزروعہ نہیں ہوئی اور آئندہ اس کے مزروعہ ہونے کے امکانات بھی نہیں تھے۔

میں اس وسیع وعریض حویلی میں تقریباً تیس برس کے لمبے وقفے کے بعد آیا تھا۔ محل نما حویلی کے اونچے صدر دروازے سے گزر کر جب میں اندر پہنچا تو ویرانی کے عجیب سے احساس نے مجھے گھیر لیا۔ یہ لمحہ وہ تھا جب پرانے وقتوں کی سچائیاں کھنڈر ہو کر ماضی کے نہاں خانوں میں غائب ہوتی جا رہی تھیں اور وہ آثار باقی رہ گئے تھے جو یہ بتانے کے لیے تھے کہ یہاں اس صدر دروازے کے باہر کبھی ہاتھی جھومتے ہوں گے، نوبت بجتی ہوگی، نقارے کی آواز پر پوری بستی متنبہ ہو جاتی ہوگی۔

پہلی بار جب میں یہاں آیا تھا تو یہ عمارت اتنی خستہ نہیں تھی اب دھیرے دھیرے گیرو اور چونے کی آمیزش سے بنایا گیا پلاستر اُکھڑنے لگا تھا۔ لکھوری اینٹیں بدنما دانتوں کی طرح باہر جھانکنے لگی تھیں، چھتیں نیچے جھک آئی تھیں اور وہ قیمتی جھاڑ فانوس جو اس حویلی کی چھتوں سے لٹکے رہتے تھے شاید بک بکا کر ضروریات زندگی کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ لمبی غلام گردشوں سے ہوتے ہوئے جب میں اندر محل سرا میں پہنچا ہوں تو قبرستان جیسا سناٹا دیکھ کر لرز گیا۔ نفیسہ بی میری پذیرائی کے لیے آگے بڑھی۔ انکی بوڑھی والدہ روشن جہاں پرانے انداز کے آبنوسی چھپر کھٹ پر بیٹھی بنا چھالیہ کی گلوری دونوں ہتھیلیوں کے درمیان مسلنے میں مصروف تھیں۔ ایک چھوٹا سا بدرنگ پاندان ان کے سامنے رکھا تھا جو اپنے پرانے پن اور از کار رفتہ ہو جانے کی نشاندہی کر رہا تھا۔

شام ہو چکی تھی اور سورج مغرب کی طرف جھکتا جا رہا تھا، اکتوبر کی نیم گرم دھوپ زمین سے وداعی لے رہی تھی میں نفیسہ بی کے ساتھ محل سرا کی غلام گردشوں سے گزرتا ہوا مغربی جانب کے زینے تک پہنچا اور اوپر

چھت کی بارانی کے قریب اس جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے نفیسہ بی کی اُفتادہ اراضی کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔

نفیسہ بی کی والدہ روشن جہاں میری کسی رشتے سے خالہ ہوتی تھیں۔ انھیں کے توسط سے مجھے اپنے بچپن اور جوانی کا کچھ حصہ یہاں گزارنے کا موقع ملا تھا۔ بعد میں تعلیمی مصروفیت رہی اور پھر ہندوستان سے باہر چلا گیا۔ جب واپس آیا تو مجھے روشن جہاں، نفیسہ بی اور ان کی اس وسیع وعریض حویلی کی بھی یاد آئی جس میں کبھی خان بہادر احمد علی صاحب کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔

میں نے چھت پر اپنے قریب کھڑی ہوئی نفیسہ بی کی طرف دیکھا اور پھر مغرب میں غروب ہوتے ہوئے سورج کی طرف، دونوں طرف غروب کا ایک ہی منظر تھا۔ تاسف بھرے لہجے میں میں نے نفیسہ بی کو مخاطب کیا۔

''کون جانتا تھا کہ اتنی جلدی اس بھری پُری حویلی کی یہ حالت ہو جائے گی؟''

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا، نفیسہ بی نے ایک حدیث کا نصف حصّہ مجھے سنایا، جس کا مطلب تھا کہ۔

'' یہ بشارت تو بہت پہلے ہی دے دی گئی ہے کہ جواد بار اگلی اُمتوں پر آئے ہیں وہ ذرا ذرا اور جزواً جزواً ہم پر بھی آئیں گے۔''

میں نے حسرت ناک نظروں سے نفیسہ بی کی طرف دیکھا۔ ذہن اس اذیت سے بھر گیا کہ نفیسہ بی ایک ایسے پر قناعت صبر کی حالت سے گزر رہی تھی کہ جس میں ادبار سے باہر نکلنے کی معمولی سی اُمنگ بھی نہیں بچی تھی۔ یہ اشرافیہ طبقے کا ذہنی زوال تھا جو اپنی فلاکت کو ایک حدیث کا حوالہ دے کر جواز تلاش رہا تھا۔ از کار رفتہ ہو جانے کی نشاندہی کر رہا تھا۔

میں نے نہیں چاہا کہ اس سلسلے کو آگے بڑھنے دوں کیوں کہ پسپا ہو جانے والے یا پسپائی کو قبول کر لینے والے کردار اپنی تشفی کے لیے جو حیلے تلاش کرتے ہیں وہی اس وقت نفیسہ بی بھی کر رہی تھی۔ پھر بھی میں نے اسے یاد دلایا کہ جب میں یہاں تھا اور یہ حویلی رونقوں سے بھری ہوا کرتی تھی تب تم اس محل سرا کے آنگن میں کیسی ہنستی کھلکھلاتی گھوما کرتی تھیں۔ حویلی خادموں اور خادماؤں سے بھری ہوتی تھی طرح طرح کے پکوانوں سے اشتہا انگیز خوشبو اٹھا کرتی تھی۔ میں نے یہ بھی یاد دلایا کہ تب کتنی ہی بار کئی خاندان اپنے بیٹوں کے لیے تمہارا ہاتھ مانگنے آیا کرتے تھے تب تمہارے والد خان بہادر احمد علی ان کی خوب خاطر تواضع کرتے اور سوچ سمجھ کر جواب دینے کا وعدہ کرتے ہوئے انہیں عزت واحترام سے رخصت کر دیا کرتے تھے لیکن اس کے برعکس جب وہ زنان خانے میں آتے تو روشن جہاں سے فرماتے۔

''ارے بیگم یہ ہماری سطح کے لوگ نہیں ہیں..... نئے دولتیے ہیں..... بس تھوڑا پیسہ آ گیا ہے تو چلے آتے ہیں عزت دار گھرانوں سے رشتہ جوڑنے۔''

بات تلخ ہو جاتی اور تمہیں احساس تک نہ ہوتا کہ یہ خاندانی عزت اور وقار تمھیں افتادہ اراضی میں

بدل دینے والا ہے۔نفیسہ بی خاموشی سے میری بات سنتی رہی۔اس نے بالائی منزل کی چہار دیواری سے نیچے پھیلی ہوئی اس افتادہ اراضی کی طرف دیکھا جو اس کے والد اس کے نام لکھ کر چھوڑ گئے تھے۔میں نے پوچھا۔

''تمہارے بھائی اکرام اللہ خاں اور سعد اللہ خاں کہاں ہیں؟''

نفیسہ بی نے بالائی حصے پر پڑی ایک بینچ پر بیٹھ کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''دونوں شہر جا کر بس گئے ہیں سعد اللہ خاں نے ایک عیسائی لڑکی سے شادی کر لی اور اپنے حصے کی جائیداد بھی بیچ دی۔دوسرے بھائی اکرام نے بھی اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کر لی ہے اور اس نے بھی اپنا حصّہ کوڑیوں کے مول بیچ دیا۔سنا ہے اس کی بیوی کسی اسکول میں اُستانی ہے۔دونوں کا تعلق اب اس حویلی سے نہیں ہے۔اب یہاں کوئی نہیں آتا''

میں نے نفیسہ بی سے کچھ نہیں کہا بلکہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔۔

''خان بہادر علی احمد صاحب نے اپنی نسلی شرافت اور خاندانی شجرے کی نجابت کو برقرار رکھنے کے لیے نفیسہ بی کا کوئی ایسا رشتہ قبول نہیں کیا جو ان کے خاندان پر دھبّہ لگا سکتا لیکن کیسی عبرت کا مقام ہے کہ بیٹے؟؟؟

نفیسہ بی نے ہاتھ کا اشارہ کر کے مجھے کچھ کہنے سے روک دیا۔میں نے خالی نظروں سے خلاء میں جھانکا۔شام کی قرمزی شفق آسمان کے مغربی گوشے میں اپنے پنکھ پھیلائے ڈوبتے ہوئے سورج کو وداعی دے رہی تھی۔تبھی کہیں دور سے اُڑتا ہوا فاختاؤں کا ایک جوڑا افتادہ اراضی کے ایک کونے میں ایستادہ شہتوت کے درخت کی ایک شاخ پر آ بیٹھا۔فاختاؤں کے جوڑے نے اپنے چھوٹے چھوٹے سر گھما کر چاروں طرف دیکھا گویا آس پاس کے ماحول کا جائزہ لے رہے ہوں۔فاختائیں مطمئن ہو گئیں تو ان میں سے ایک جو دیکھنے میں مادہ نظر آتی تھی اپنی بھاری اور سنجیدہ آواز میں وہی وظیفہ دہرانے لگی جو فاختائیں ازل سے دہراتی آ رہی ہیں۔میں نے نفیسہ بی سے پوچھا۔

''نفیسہ تم بتا سکتی ہو کہ شہتوت کی ڈالی پر بیٹھی یہ فاختائیں کیا کہہ رہی ہیں؟

نفیسہ بی نے سنجیدہ نظروں سے شہتوت کی طرف دیکھا اور بولی۔

''ساجد تمہیں یاد ہوگا دادی کہا کرتی تھیں کہ فاختائیں صبح منہ اندھیرے اور سورج غروب ہوتے وقت اللہ کی یاد میں وظیفہ پڑھتی ہیں، یہ کہتی ہیں۔

''یا پاک تو!.....یا پاک تو!''

میں نے دھیان دیا تو سچ مچ فاختاؤں کی آواز سے ایسا ہی اشتباہ ہوتا تھا جیسے وہ استغراق کے عالم میں ''یا پاک تو!'' کا وظیفہ پڑھ رہی ہیں۔میں نے درزیدہ نگاہوں سے نفیسہ بی کی طرف دیکھا اور حسرت آمیز لہجہ میں کہا۔

''نفیسہ معصوم پرندوں کے یہ تخاطب کہیں تمہارے لیے تو نہیں ہیں؟''

اور پھر میں نے یا پاک تو کہہ کر نفیسہ بی کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا۔!نفیسہ بی کے چہرے پر افسردگی کی

ایک لہر سی دوڑ گئی۔میں نے دیکھا اس کی پیشانی پر بالوں کی جولٹ جھول کر چہرے کو چھو رہی تھی اس میں آدھے سے زیادہ بال سفید تھے۔چہرے پر جھرّیاں نمودار ہونے لگی تھیں اور جسم کی جلد اپنی شادابی کافی کم کر چکی تھی۔

میں پھر اس افتادہ اراضی کی طرف دیکھنے لگا جو دور تک زمین کے ایک ویران ٹکڑے کی شکل میں پھیلی ہوئی تھی سے مزروعہ بنانے کے لیے کوئی مزارع اب تک نہیں آیا تھا۔اسی احساس کے ساتھ ہی ایک بار پھر میں نے نفیسہ بی کی طرف دیکھا۔ادھر بھی غیر مزروعہ، ادھر بھی غیر مزروعہ۔!!!

اراضی پر کچھ جنگلی پودے، کھر پتوار اور جھر بیریوں کے پیڑ اور بیچوں بیچ سپستاں کا ایک درخت کھڑا تھا۔مجھے لگا کہ نفیسہ کے باطن میں بھی ایسے ہی کھر پتوار جم چکے ہوں گے۔میں نے پوچھا۔

''نفیسہ تم نے اپنے والد کی دی ہوئی اس اراضی کو جوتنے کے لیے کسی مزارع کو کیوں نہیں دے دیا.....؟اس سے اچھی فصل مل سکتی تھی۔''

نفیسہ بی نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے جواب دیا

''ساجد.....! شاید میں نے بھی ابا حضور کی اسی سنّت پر عمل کیا جس پر عمل کرتے ہوئے میں نے انھیں دیکھا تھا یا پھر کوئی ایسا موزوں مزارع ملا ہی نہیں جو اس اراضی کو مزروعہ کرتا''

''المیہ مزارعوں کے معدوم ہو جانے کا نہیں ہے اراضی کو افضل اور غیر افضل کے خانوں میں بانٹ دینے کا ہے.....''

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں نفیسہ اسے بخوبی سمجھ رہی ہے۔میں نے بات آگے بڑھائی اور اس کا مرجھایا ہوا سرد ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

''نفیسہ ہمارا بچپن ساتھ ہی گزرا اور میرے دل میں تمہاری محبّت کی کونپل نے سر بھی اٹھایا لیکن تمہارے والد کی تمکنت اور غرور کی وجہ سے میں ان سے تمہارا ہاتھ مانگنے کی ہمّت نہیں جٹا پایا اور اپنی محبّت کو دل میں دبائے یہاں سے چلا گیا۔''

میں نے دیکھا نفیسہ اور زیادہ اداس ہو گئی ہے، وہ دھیمے لہجہ میں کہنے لگی۔

''خواب میں نے بھی دیکھے تھے لیکن خاندان، ابا حضور کا معیار زندگی، مرتبہ، اشرافیہ گھرانوں کی قدریں، یہ سب اہمیت کی حامل تھیں میں اور تم نہیں ساجد۔!''

آج جب میں عمر کی پانچ دہائیاں پوری کرنے جا رہا تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ دن کتنی تیزی سے دبے پاؤں گزر جاتے ہیں اور ہمیں احساس تک نہیں ہوتا۔یاد آیا کہ میرا گھرانہ بھی خان بہادر علی احمد کے گھرانے سے نسلی اور نسبی طور پر کمتر نہیں تھا ہاں دولت اور شان و شوکت میں بیشک نابرابری تھی۔آگے میں کچھ نہیں سوچ سکا کیوں کہ نفیسہ بی نے اپنی بات شروع کر دی تھی۔

''برسوں تک میں تمہارا بے سود انتظار کرتی رہی..... جانتی تھی کہ اس انتظار کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک اسی طرح جیسے یہ نیچے کی افتادہ اراضی جو سالہا سال تک کسی مزارع کا انتظار کرتی رہی ہوگی اور تب مایوس ہوگئی ہوگی جب اس پر جھربیریاں اور فالتو کا کھر پتوار اُگ آیا ہوگا۔''

میں نے یہ جملہ ادا کرتے ہوئے افتادہ اراضی کی طرف ایک بار پھر دیکھا۔ شہتوت کے درخت پر فاختاؤں کا جوڑا اب بھی ''یاپاک تو!'' کا وظیفہ پڑھنے میں منہمک تھا۔ سورج مغرب کی گھاٹیوں میں اور نیچے اتر آیا تھا ہلکی پڑ گئی گلابی دھوپ دیواروں اور درختوں سے وداعی لے رہی تھی۔ میں نے نفیسہ بی سے پوچھا۔

''اتنی بڑی حویلی میں تم اور خالہ کس طرح رہ پاتی ہو..... کیا تنہائی سے اکتا نہیں جاتیں؟''

نفیسہ نے ایک ٹھنڈی لمبی سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

''ہم دو نہیں..... تین ہیں! ایک ابا حضور کا پرانا ملازم خدا بخش ہے جو باہر ڈیوڑھی سے ملحق کوٹھری میں رہ رہا ہے۔ جب سارے خادم اور خادمائیں ایک ایک کر کے چلے گئے تو یہی ایک شخص تھا جو ہمارے ساتھ رہا اور اسی طرح خدمت کرتا رہا جیسے ابّا حضور کے سامنے کیا کرتا تھا۔ اب وہ قصبے میں لگنے والی ہفتہ وار ہاٹ کا محصول لے آتا ہے جس سے ہم لوگوں کی گزر ہو جاتی ہے۔ تمہیں تو معلوم ہوگا کہ قصبے کا وہ علاقہ جہاں ہاٹ لگتی ہے ابا حضور کی ملکیت میں تھا۔ اب ہماری آمدنی کا واحد ذریعہ یہی ہے.....''

''خدا بخش تو اب بہت بوڑھا ہو گیا ہوگا نفیسہ؟''

''ہاں بوڑھا ہو گیا ہے شاید خادموں کی صف کا وہ آخری آدمی ہے! تم جانتے ہو ساجد کہ تہذیبوں کا سورج ایک کنارے سے اُگتا ہے اور دوسرے کنارے پر ڈوب جاتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''نفیسہ سورج کو ڈبونے والے محرّکات بھی ہوتے ہیں۔ ڈوب چکے سورج سے پہلے اندھیری رات آنے کا اندیشہ جنھیں ہوتا ہے وہ روشنی کا بندوبست پہلے سے کر لیتے ہیں۔ لیکن یہاں جو تاریکی ہے وہ؟''

نفیسہ نے مجھے آگے کہنے سے روک دیا اور بولی۔

'' بستیاں جب اُجڑتی ہیں تو ان کا کوئی اور چھور نہیں رہتا۔ ایک موسم دوسرے موسم کو مسمار کرتا ہوا چلا جاتا ہے، وقت ایک ایسی طاقت ہے جس کے سامنے سب مجبور ہیں۔''

میں نے نفیسہ بی کے فلسفے کو ان سنا کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن کیا یہ خدا کا قانون ہے.....؟ میں تو سوچتا ہوں کہ ہر تہذیب اپنے لازوال ہونے کے مغالطے میں خود اپنا تحفظ کرنے کی فکر سے محروم ہو جاتی ہے اور نتیجہ اس اراضی کی شکل میں سامنے آتا ہے جو برسوں سے افتادہ پڑی ہے۔''

مجھے محسوس ہوا کہ ہم دونوں اپنی اپنی باتیں تمثیلی انداز میں اس لیے کہہ رہے ہیں کیوں کہ ہم میں سچائیوں کو براہِ راست واضح کرنے کی جسارت نہیں ہے۔ خاموشی کے کچھ لمحے ہم دونوں کے

درمیان سے چپ چاپ گزر گئے میں نے دوبارہ نفیسہ کو متوجہ کیا۔

''جب میں یہاں تھا تو سوچتا تھا کہ کم سے کم ایک مزارع بن کر ہی کبھی میں یہاں آؤں گا اور تمھاری اراضی کو افتادہ نہیں رہنے دوں گا، لیکن افسوس وہ وقت نہیں آیا''۔

نفیسہ نے دھیان سے میری بات سنی اور بولی۔

''وہ وقت نہیں آ سکتا تھا، کیوں کہ وقت کے بہاؤ کے سامنے تب تک وہ چٹان مضبوطی سے سینہ تانے کھڑی تھی جسے بعد میں آئے زلزلوں نے تہس نہس کر دیا اور پھر اتنی دیر ہو چکی تھی کہ اس اراضی پر کھر پتوار اور جھر بیریوں کے جھنڈ اُگ آئے اور ایسی حالت میں اس اراضی کو مزروعہ بنانے کی ہمت کسی میں نہیں رہ گئی تھی۔''

خفیف سی ہنسی کے دوران میں نے نفیسہ بی سے پوچھا۔

''کیا ہم یہ گفتگو واقعی سامنے کی اُفتادہ زمین کے بارے میں کر رہے ہیں، یا تمھارے اور اپنے بارے میں؟''

میں نے دیکھا تاسف اور بے چارگی کے عالم میں وہ میری طرف دیکھ رہی تھی اور پسینے کی دو موٹی بوندیں اس کے رخساروں پر ڈھلک آئی تھیں۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ فاختاؤں کا جوڑا ٹھہر ٹھہر کر وظیفہ خوانی کرتا ہوا کہیں اور اُڑ کر جا چکا تھا۔ افتادہ اراضی کی جھاڑیاں، سپستاں اور شہتوت کے درخت پر چھائیوں کی طرح ڈراؤنے اور بدنما دکھائی دے رہے تھے۔

ہم دونوں بالاخانے سے اتر کر نیچے آ گئے۔ روشن جہاں اپنے چھپر کھٹ پر اسی طرح بیٹھی تھیں، جیسا ہم انھیں چھوڑ گئے تھے۔ میں نے چشمے کے اندر سے جھانکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا تو مجھے لگا جیسے ان میں تاریخ کے الاؤ بجھ رہے ہوں۔ میں قریب گیا تو پیرانہ سالی کی تھکی ہوئی اور لرزیدہ آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''تو اتنے برس بعد لوٹا ہے بیٹا میں تو تجھے پہچان ہی نہ سکی۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور دل ہی دل میں بولا۔

''مجھ سے زیادہ آپ کی، نفیسہ بی کی اور اس حویلی کی پہچان معدوم ہو گئی ہے خالہ جان!''

میں نے نفیسہ کی طرف دیکھا وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھی اس کے چہرے کی جھرّیاں پل بھر میں اور گہری ہو گئیں۔ فاختاؤں کا وظیفہ جاری تھا لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ وظیفہ پہلے سے زیادہ دردناک ہو گیا ہو۔ میں نے نفیسہ کو دھیرے سے پکارا لیکن وہ روشن جہاں کی طرف دیکھتے ہوئے نہ جانے کیا سوچ رہی تھی..... علی الصبح میں خان بہادر احمد علی کی افتادہ اراضی کے پاس سے گزرتا ہوا واپس شہر لوٹ آیا۔

◀◀ ● ▶▶

S/4, Aazim Estate-2
New Sir Syed Nagar Medical Road
Aligarh

- **تجزیہ**
- **نوشابا خاتون**

ڈاکٹر افشاں ملک کا افسانہ......افتادہ اراضی

بزمِ ادب میں ڈاکٹر افشاں ملک کا افسانہ ''افتادہ اراضی'' میری نظروں سے گزرا۔ جس نے مجھے متاثر کیا۔ ان کے ہر افسانے میں کوئی نہ کوئی پیغام ضرور ہوتا ہے۔ یوں تو ہر افسانہ نویس اپنے افسانے میں کوئی نہ کوئی پیغام ضرور دیتا ہے۔ لیکن افشاں ملک کا طرزِ بیان بہت ہی موثر ہوتا ہے۔

اس افسانے میں موصوفہ نے زمین دار، جاگیر دار خاندان کے بزرگوں کی نفسیات، ان کی ذہنی کیفیت اور اس کے برے نتائج کو بہت ہی اثر انگیز پیرائے میں پیش کیا ہے۔

یہ قصہ ایک جاگیر دار۔ ''خان بہادر احمد علی صاحب'' کا ہے۔ اس وقت ان کا طوطی بولتا تھا۔ حویلی رونق سے بھری ہوا کرتی تھی۔ نفیسہ بی خان بہادر صاحب کی بیٹی' اپنی سہیلیوں کے ساتھ پوری حویلی میں ہنستی کھلکھلاتی پھرتی تھیں۔ اس وقت کئی خادم اور خادمائیں ہاتھ باندھے ان کے حکم کی تعمیل کے لئے کھڑے رہتے تھے۔ صبح سے شام تک طرح طرح کے پکوانوں کی خوشبو فضا میں پھیلتی رہتی۔ ہر وقت دربار لگا رہتا تھا۔

اس وقت کئی خاندان والے اپنے بیٹے کے لئے نفیسہ کا ہاتھ مانگنے آیا کرتے۔ جن کی خوب خاطر مدارات کی جاتی اور پھر یہ کہ کر انہیں رخصت کر دیا جاتا کہ سوچ کر جواب دیں گے۔ لیکن جب نواب صاحب زنان خانے میں جاتے تو بیوی سے یوں فرماتے:

''بیگم یہ ہماری سطح کے لوگ نہیں ہیں۔ تھوڑا پیسہ آ گیا ہے تو چلے آتے ہیں عزت دار گھرانوں سے ٹکر لینے۔''

وقت گزرتا رہا، حالات بدلتے رہے اور نفیسہ بی اب عمر کے اس موڑ پر آ کھڑی ہوئی تھیں جہاں سے پلٹ کر دیکھنے پر ماضی کا صرف دھندلا دھندلا عکس ہی نظر آتا ہے۔

اچانک پچیس سال بعد ایک شخص وہاں وارد ہوا جو کبھی نفیسہ بی کا پرستار تھا اور خواہاں بھی۔ جو اپنی محبت کی ناکامی سے دل برداشتہ ہو کر ملک سے کہیں باہر چلا گیا تھا اور پچیس سال بعد لوٹا تھا۔ یہاں آتے ہی اسے سب سے پہلے نفیسہ بی اور ان کی حویلی کی یاد آئی۔ اس نے حویلی کا رخ کیا۔ وہ اپنے مشاہدات اس

پیرائے میں بیان کرتا ہے:

''میں اس وسیع وعریض حویلی میں تقریباً پچیس برس کے لمبے وقفے کے بعد آیا تھا۔ محل نما حویلی کے اونچے صدر دروازے سے گزر کر جب میں اندر پہنچا تو ویرانی کے عجیب سے احساس نے مجھے گھیر لیا۔ یہ لمحہ وہ تھا جب پرانے وقتوں کی سچائیاں کھنڈر ہو کر ماضی کے نہاں خانوں میں غائب ہوتی جا رہی تھیں۔ چھتیں نیچے جھک آئی تھیں اور قیمتی جھاڑ فانوس جو اس حویلی کی چھتوں سے لٹکے رہتے تھے۔ ضرورتِ زندگی کی تکمیل میں شاید کہیں بک گئے تھے اور باقی رہ گئے تھے وہ آثار جو یہ بتا رہے تھے کہ کبھی یہاں اس دروازے پر ہاتھی جھومتے تھے، نوبت بجتی تھی۔''

نفیسہ اس کی پذیرائی کے لئے آگے آئیں۔ ان کی بوڑھی والدہ روشن جہاں پرانے انداز کے آبنوسی چھپر کھٹ پر بیٹھی بنا چھالیہ کے گلوری اپنے دونوں ہتھیلیوں کے درمیاں مسلنے میں مصروف تھیں۔ پاندان سامنے رکھا تھا جو اپنے از کار رفتہ ہو جانے کی نشاندہی کر رہا تھا۔ جب وہ ان کے قریب گیا تو ان کی لرزیدہ آواز کانوں میں پڑی:

''تو اتنے دنوں بعد لوٹا ہے بیٹا کہ میں تو تجھے پہچان ہی نہ سکی۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور دل ہی دل میں سوچا:

''مجھ سے زیادہ آپ کی، نفیسہ بی کی اور اس حویلی کی پہچان معدوم ہو چکی ہے''

شام کا سورج مغرب کی طرف ڈھلتا جا رہا تھا۔ ایک اقتباس میں نفیسہ بی کے ساتھ محل سرا کی غلام گردشوں سے گزرتا ہوا مغرب جانب کے زینے تک پہنچا اور چھت کی بارانی کے قریب اس جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے نفیسہ بی کی افتادہ اراضی کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے نفیسہ بی کی طرف دیکھا اور پھر مغرب میں غروب ہوتے ہوئے سورج کی طرف۔ دونوں طرف غروب کا ایک منظر تھا۔ تاسف بھرے لہجے میں میں نے نفیسہ بی کو مخاطب کیا

''کون جانتا تھا کہ اتنی جلدی اس بھری پری حویلی کی یہ حالت ہو جائے گی میں پھر اس افتادہ اراضی کی طرف دیکھنے لگا اور پھر نفیسہ بی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''تم نے اپنے والد کی دی ہوئی اس اراضی کو جوتنے کے لئے کسی مزارع کو کیوں نہیں دیا۔ اس سے اچھی فصل مل سکتی تھی۔'' اس نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

''ساجد میں نے بھی ابا حضور کی اس سنت پر عمل کیا۔ جس پر عمل کرتے ہوئے میں نے انہیں دیکھا تھا۔ کوئی ایسا موزوں مزارع نہ ملا جسے میں اس افتادہ اراضی کو جوتنے کے لئے دیتی''

کتنی گہرائی، کتنا درد، کتنی مایوسی اور طنز بھرا تھا اس جملے اور لہجے میں۔ ان کی پیشانی پر بالوں کی جو لٹیں جھول رہی تھی اس میں آدھے سے زیادہ بال سفید تھے، چہرے پر جھریاں نمودار ہونے لگی تھیں۔ جسم کی

جلد اپنی شادابی کھو چکی تھی اور آنکھوں میں ایسی ویرانی تھی جیسے ان کے اندر زندگی کی ذرا بھی رمق باقی نہ ہو۔ان دونوں کے بیچ خاموشی کے کچھ لمحے اور بیت گئے۔ایک اقتباس

نفیسہ تمہیں یاد ہوگا؟ بچپن میں ہم دونوں نے کتنی بار کھیل کھیل میں ایک دوسرے سے بیاہ رچایا تھا۔میں نے کتنی بار تمہیں اپنانے کے خواب دیکھے تھے۔میں نے دیکھا نفیسہ اور زیادہ اداس ہوگئی، وہ دھیمے لہجے میں کہہ رہی تھی خواب میں نے بھی دیکھے تھے۔لیکن خاندان، ابا حضور کا معیارِ زندگی ،مرتبہ،اشرافیہ گھرانوں کی قدریں، یہ سب اہمیت کی حامل تھیں۔میں یا تم نہیں، ویسے میں بھی برسوں تک تمہارا بے سود انتظار کرتی رہی حالانکہ جانتی تھی کہ اس انتظار کا کوئی فائدہ نہیں۔

جب میں یہاں تھا تو سوچتا تھا کہ کم سے کم ایک مزارع بن کر ہی یہاں کبھی آؤں گا اور تمہاری اراضی کو افتادہ نہیں رہنے دوں گا۔لیکن افسوس وہ وقت نہیں آیا۔

نفیسہ بی کے چہرے پر افسردگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

ان دونوں کے مابین کچھ دیر تک خاموشی رہی۔شہتوت کے درخت پر فاختاؤں کا جوڑا یا پاک تو کا وظیفہ پڑھ رہا تھا، دونوں اپنے جوڑے کے ساتھ کتنا خوش تھے۔اور اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے۔سورج مغرب کی کھائیوں میں اور نیچے اتر آیا تھا ہلکی گلابی دھوپ دیواروں اور درختوں سے وداع لے رہی تھی۔ایک اقتباس:

''اتنی بڑی حویلی میں تم اور خالہ کیسے اکیلی رہ پاتی ہو؟ تنہائی سے اکتا نہیں جاتیں؟ نفیسہ نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا:

ہم دو نہیں تین ہیں ساجد.....ایک ابا حضور کا پرانا ملازم خدا بخش ہے جو باہر ڈیوڑھی سے ملحق ایک کوٹھری میں رہ رہا ہے۔جب سارے خادم خادمائیں ایک ایک کر کے چلے گئے تو یہی ایک شخص تھا جو ساتھ رہا اور اسی طرح ہماری خدمت کرتا رہا جیسے ابا حضور کے وقت میں کیا کرتا تھا۔اب وہ قصبہ میں لگنے والی ہفتہ وار ہاٹ کا محصول لے آتا ہے جس سے ہم لوگوں کی گزر ہو جاتی ہے۔اب ہماری آمدنی کا واحد ذریعہ یہی ہے۔میں نے دیکھا تاسف اور بے چارگی کے عالم میں وہ مجھے دیکھ رہی ہے اور آنسو کی دو موٹی موٹی بوندیں اس کے رخساروں پر ڈھلک آئی تھیں''

مندرجہ بالا اقتباس معاشرے کے ان افراد کو آئینہ دکھاتے ہیں جو جھوٹی شان و شوکت اور اپنی اولاد کی زندگی کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔انہیں دلدل میں ڈال دیتے ہیں۔نفیسہ بی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اور اب انہیں اس دلدل سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

◂◂ ● ▸▸

406,Lochan Enclave
Lohia Nagar
Kankarbagh Patna - 800020

- **ناول کا ایک باب**
- **اقبال حسن خان**

راج سنگھ لاہوریا

میں اگر اس گاؤں میں بالکل اجنبی ہوتا تو شاید زیادہ آسانی سے گھوم پھر سکتا تھا لیکن چونکہ ابھی چند ہفتے قبل ہی میں یہاں آیا تھا تو اس بات کا ڈر تھا کہ میں کہیں پہچان نہ لیا جاؤں۔میں کھلے کھیتوں والی ایک پگڈنڈی پر چل رہا تھا۔دو ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ مرد یا عورتیں میرے قریب سے گزر گئے۔ایک چہرہ میں نے پہچانا بھی لیکن اُس نے میری طرف کوئی توجہ نہ کی تو میں مطمئن انداز میں آگے بڑھنے لگا حتیٰ کہ میں کلونت کور کے گھر کے سامنے لگے بکائن اور شیشم کے درختوں کے اُس جھنڈ کے بالکل قریب پہنچ گیا جہاں اُس کے باپ بلبیر سنگھ کی موجودگی میں میری اُس نے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔درختوں کے جھنڈ سے ذرا ہٹ کر دو تین رنگین پایوں والی چارپائیاں پڑی تھیں۔ایک بڑی چارپائی پر دو تکیے بھی دھرے تھے اور رنگین چادریں سمٹ کر زمین کو چھو رہی تھی جیسے ابھی کوئی وہاں سے اُٹھ کر اندر گیا ہو۔میں آواز دے کر کلونت کور کو نہیں پکار سکتا تھا۔اُس کے گھر کے اندر درانہ بھی نہیں جا سکتا تھا۔یہ گھر گاؤں کے اُفتادہ گوشے میں ضرور تھا لیکن یہاں کسی بھی لمحے، کوئی بھی آ سکتا تھا۔میں ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا ہو کر سوچنے لگا تبھی میں نے اپنے عقب میں آہٹ سنی۔میں نے گھوم کر دیکھا۔وہ کلونت کور تھی۔وہ آج بھی سرخ قمیص پہنے ہوئے تھی اور سر پر سبزے کا گٹھا اُٹھائے اُسی پگڈنڈی پر تیزی سے چل رہی تھی جو اُس کے گھر کے دروازے پر ختم ہوتی تھی۔میں درخت کی آڑ میں تھا تو اُس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔وہ شاید دیر سے اس راستے پر چل رہی تھی لیکن ادھ پکی گندم کی اُونچائی کی وجہ سے میں اُسے نہیں دیکھ سکا تھا۔جہاں وہ اب چل رہی تھی، وہاں گندم کے بجائے سبزہ لگا ہوا تھا۔وہ قریب پہنچی تو میں درخت کی اوٹ سے نکل کر اُس کے سامنے آ گیا۔وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔اُس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ میری وہاں موجودگی کا یقین نہ کر رہی ہو۔اُس نے سبزے کا گٹھا سر سے اُتار کر پھینکا اور مجھ سے ایک لفظ کہے بغیر میرا ہاتھ پکڑ کر گندم کی اُس اُونچی فصل میں لے گئی جس کی قطار ساتھ ہی چل رہی تھی۔

ہم گندم کے کھیت میں تھے۔ہمارے گرد سبزے کی خالص مہک پھیلی ہوئی تھی۔میرے دونوں ہاتھ کلونت کور کے ہاتھوں میں تھے اور میں اُس کی سیاہ آنکھوں میں فقط آنسو دیکھ سکتا تھا۔شاید اُس کے بدن سے بھی سبزے کی مہک یوں پھوٹ رہی تھی کہ وہ سبز چارہ کاٹ کر اور سر پر ڈھو کر گھر لا رہی تھی۔

ہم وہیں بیٹھ گئے۔کلونت کور بولی۔

''مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گے۔''

میں نے کہا۔''میں شاید نہ آتا اگر تم مجھے اُس دن ریلوے سٹیشن تک پہنچانے نہ جاتیں۔''

کلونت کور نے اپنی آنکھیں قمیص کے دامن سے صاف کیں اور بولی۔

''یہاں ایک ہی ریل رکتی ہے۔میں ہر روز ریلوے سٹیشن جاتی ہوں اُس وقت پر۔صرف آج ہی نہ جا سکی کیوں کہ شٹالا (سبز چارہ) کاٹنا تھا۔''

پھر وہ چند لمحوں تک سر جھکائے بیٹھی رہی اور بولی۔

''تم مجھے لینے آئے ہو؟ ہے نا؟''

میرے لئے یہ ایک مشکل سوال تھا اور اس کا جواب اس سے بھی مشکل کیونکہ میں اُسے فقط ملنے گیا تھا۔میں نے کہا۔

''نہیں۔میں تمہیں ملنے آیا ہوں کلونت کور۔میں تمہیں ضرور لے جاؤں گا لیکن ابھی اس کے لئے مناسب وقت نہیں آیا۔''

مجھے لگا جیسے میرے جواب سے کلونت کور کو مایوسی ہوئی ہو۔وہ اُسی عالم میں بولی۔

''اب کیوں نہیں لے جا سکتے؟ اس میں کیا مشکل ہے؟ میں ابھی،اسی وقت تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔''

ایسا ممکن نہیں تھا۔کم از کم اُس وقت تو بالکل ہی ممکن نہیں تھا۔مجھے اس کا اظہار کرتے وقت ایسے الفاظ استعمال کرنے تھے کہ اس کا دل نہ ٹوٹتا تو میں نے کہا۔

''دیکھو ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ابھی وہ وقت نہیں آیا۔''

میں اس جواب سے خود ہی مطمئن نہ تھا تو وہ کیا ہوتی۔اُس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔

''تم سچ بول رہے ہو نا؟ تمہیں مجھ سے اتنی ہی محبت ہے جتنی مجھے تم سے ہے؟''

مجھے اگر اُس سے محبت نہ ہوتی تو میں محض اُس کے قرب کے لالچ میں یہ نوکری کیوں قبول کرتا؟ میں نے اُسے اپنی نوکری والا واقعہ سنا دیا۔کلونت کور کو میری بات بہت اچھی لگی۔وہ مسکرا کر بولی۔

''تو اب ہم روزانہ ملا کریں گے؟ ہے نا؟''

یہ ممکن تھا لیکن میں ہر روز ایسا یوں کرنا نہیں چاہتا تھا کہ یہ بہت بڑے خطرے کی بات تھی۔اس گاؤں میں سکھوں کی بڑی تعداد رہتی تھی۔میں مسلمان تھا اور یہ راز فاش ہونے کا مطلب ہم دونوں کی فوری موت بھی ہو سکتا تھا تو میں نے کہا۔

''ہر روز تو نہیں لیکن ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ ضرور مل سکتے ہیں۔''

کلونت کور ابھی میری بات کا جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ بالکل ہمارے قریب سے کوئی گالیاں

دیتا گزر گیا۔میں نے دیکھا کہ کلونت کور کا سرخی مائل رنگ جیسے لمحہ بھر کو پیلا پڑ گیا ہو۔اُس نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کو کہا اور بولی۔

''یہ ہمارا نوکر دھیان سنگھ ہے۔کوئی بھینس کہیں گم ہو گئی ہے۔اُسی کو ڈھونڈ رہا ہے۔''

پھر وہ بے آواز طریق پر کھڑی ہوئی اور اُس نے چاروں طرف کھیتوں میں دیکھا اور ایک بار پھر میرے قریب بیٹھ کر بولی۔

''باؤ۔تم رات یہاں رہ جاؤ نا۔''

میں یہ فرمائش سن کر حیران رہ گیا۔ایسا ناممکن یوں تھا کہ اگر میں اُس کی بات مان بھی لیتا تو رات کہاں گزارتا۔وہ شاید میرا ذہن پڑھ رہی تھی۔وہ مسکرا کر بولی۔

''ہماری حویلی کے باہر جو کمرے ہیں ناجن میں بھوسہ اور کھل (بنولہ) بھری رہتی ہے۔وہاں رات میں کوئی نہیں جاتا۔تم اُس کمرے میں رہ جانا۔میں رات کو تمہارے لئے روٹی لاؤں گی۔ساری رات تمہارے ساتھ رہوں گی۔''

یہ دعوت سن کر میری بھوک اُڑ گئی۔میں نے کہا۔

''نہیں نہیں۔میں یہاں کسی کا نوکر ہو کر آیا ہوں۔میرا کھانا وہیں سے آتا ہے۔اگر میں رات بھر غائب رہا تو وہ مجھے ڈھونڈنا شروع کر دیں گے۔اگر تم مجھ سے پھر بھی ملنا چاہتی ہو تو مجھے اس وقت جانے دو۔''

ایک مرتبہ پھر فصل میں جیسے کوئی طوفان آیا۔اس مرتبہ بھورے رنگ کی ایک بھینس ہمارے سامنے آن کھڑی ہوئی۔بھینس کا جسم کیچڑ سے آلودہ تھا۔کلونت کور تیزی سے اُٹھی اور مجھ سے بولی۔

''وہ اس بھینس کے پیچھے آنے ہی والا ہو گا۔میں بھینس کو نکال کر لے جا رہی ہوں۔وہ یہاں نہیں آئے گا۔تم پرسوں رات نو بجے تک ضرور آنا۔میں تمہارا انتظار کروں گی۔اور سنو.....'' کلونت بات مکمل نہ کر سکی کیوں ہمارے قریب ہی سے کسی نے اُسے پکارا۔

''کا کی۔او کا کی۔اسے روک کے رکھ اُدھر ہی۔میں پہنچ رہا ہوں۔''

کلونت کور نے جواب میں بھینس کو ہاتھوں سے پیٹنا شروع کر دیا اور بھاگتی بھینس کے پیچھے کھیتوں سے نکل گئی۔میں کوئی دس منٹ مزید وہاں بیٹھا اور جب کھڑا ہوا تو وہاں نہ بھینس تھی،نہ کلونت کور اور نہ ہی دھیان سنگھ۔

میں ریل کی پٹڑی پر چلتا اپنے رہنے کی جگہ پہنچا تو کہیں سے مغرب کی اذان کی آواز آ رہی تھی۔

مجھے منیجری کرتے پندرہ سول دن گزر چکے تھے۔اس دوران میری عمر حیات خان سے بس ایک مرتبہ ہی ملاقات ہوئی تھی اور دوسری اب یوں ہونے والی تھی کہ اُس نے مجھے حویلی میں بلوایا تھا۔اپنے انٹرویو والے دن کے بعد اُس سے میری ملاقات اُس وقت ہوئی تھی جب سن چالیس کے کوئی پرزہ خراب ہو

گیا تھا اور میں میکینک کے ساتھ شہر وہ پرزہ لینے گیا تھا اور واپسی میں اس کی اطلاع عمر حیات کو دی تھی۔ قیمت کی رسید دیکھ کر وہ چند لمحوں تک خاموش بیٹھا رہا اور پھر یک بیک مسکرا کر بولا۔

''میں نے تجھے معاف کیا عماد الدین۔''

میں یہ بات سن کر حیران رہ گیا۔ عمر حیات میرے قریب آیا اور میرا شانہ تھپک کر بولا۔

''شاباش جوان۔ مجھے تمہاری ایمانداری دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔''

یہ معمہ اس کی دوسری بات نہ مزید اُلجھا دیا۔ عمر حیات بیٹھا اور خوشبودار تمباکو والے حقے کا کش لے کر بولا۔

''یہ پرزہ خریدتے وقت تم سے دکاندار نے کوئی بات تو نہیں کہی تھی؟''

یقیناً کہی تھی اور وہ یہ بات تھی کہ وہ مجھے اس پرزے کی خریداری پر دس فی صد کمیشن دینا چاہتا تھا لیکن میں نے اُتنی ہی قیمت کم کروالی تھی اور رسید بھی اُسی قیمت کی لی تھی۔ یہی بات میں نے عمر حیات کو بتلا دی۔ جب میں رات کو کھانا کھا کر لیٹا اور میں نے اس واقعے پر غور کیا تو مجھ پر کھلا کہ مجھ سے پہلے جو آدمی یہاں منیجر تھا وہ غالباً خریداری میں ہیر پھیر کرتا تھا اور یہ بات اب عمر حیات کے علم میں آئی تھی۔ چونکہ وہ آدمی اب دنیا میں نہیں تھا تو عمر حیات نے اُسے معاف کر دیا تھا۔ کچھ بھی تھا اس واقعے کے بعد میری اب تک اُس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

بشیر کی زبانی پیغام ملتے ہی میں حویلی روانہ ہو گیا۔ عمر حیات اُس وقت اپنے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ میں نے سلام کیا تو اُس کے جواب دینے سے پہلے اُس کے سامنے بیٹھے آدمی نے جو اپنے بالوں کی رنگت سے انگریز لگ رہا تھا، گھوم کر دیکھا۔ یہ وہی انگریز تھا جو مجھے ریلوے سٹیشن پر ملا تھا اور جس نے ہندوستانیوں کو جانور قرار دیا تھا۔ میں نے اپنے چہرے کے تاثرات قابو میں رکھے لیکن انگریز ایک بار پھر مجھ سے اُلجھنا چاہ رہا تھا۔ عمر حیات سے پہلے وہ بولا۔

''اوہ تو یہ ہے تمہارا نیا سٹیٹ منیجر۔''

عمر حیات نے حیرت سے کہا۔

''تم اسے جانتے ہو؟''

انگریز مسکرایا اور بولا۔

''ہاں۔ ہم پہلے ایک مرتبہ مل چکے ہیں۔ ریلوے سٹیشن پر۔''

عمر حیات نے مجھے گھورا۔

''تم ریلوے سٹیشن کیوں گئے تھے؟''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''خان جی ہم ہر سال گندم بھجوانے کے لئے ریلوے کی خدمات جو حاصل کرتے ہیں۔ اُسی کی معلومات کے لئے گیا تھا۔ دو چار ہفتوں میں ہماری گندم کٹ جائے گی۔''

لگتا تھا میرا جواب عمر حیات کو پسند آیا تھا تبھی تو اُس نے ہنس کر کہا۔

''سمارٹ بوائے۔ میں تمہارے کام سے بہت خوش ہوں۔''

میں نہیں جانتا تھا اس وقت مجھے کیوں بلوایا گیا تھا تو میں نے پوچھا۔

''آپ نے مجھے بلوایا تھا؟''

عمر حیات چونکا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ یہ بات بالکل ہی بھول گیا ہو کہ اُس نے مجھے کیوں بلوایا تھا۔ پھر جیسے اُسے یاد آ گیا۔

''تم نے نواب فراست اللہ خان کا نام سنا ہے کبھی؟''

میں نے نہیں سنا تھا تو ایسا ہی اظہار کیا۔

اس مرتبہ عمر حیات کی بجائے انگریز بولا۔

''کبھی اخبار بھی پڑھ لیا کرو۔ تم ایک سیاسی آدمی کی جاگیر پر منیجر ہو۔ تمہیں اتنا تو پتہ ہونا چاہئے کہ وہ کتنی ہی پارٹیاں تبدیل کر کے ابھی ابھی یونینسٹ پارٹی میں شامل ہوا ہے۔ اُس کے گھر کی شراب کی پارٹیوں کی دھوم سارے ہندوستان میں ہے۔''

پھر اُس نے مجھے آنکھ ماری اور مزید انکشاف کیا۔

''تین سال پہلے ایک ایسی انگریز عورت سے شادی کی ہے اُس نے جسے پیچھے سے دیکھو تو.....

میں نے عمر حیات کے چہرے کے تاثرات دیکھے۔ شاید اُسے انگریز کی بات اچھی نہیں لگی تھی تو وہ قدرے تلخی سے انگریز کی بات کاٹ کر بولا۔

''ہر وقت بکواس مت کیا کرو ڈینی۔ نواب صاحب ہمارے دوست ہیں۔''

انگریز جس کا نام مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا تھا مسکرانے لگا۔

عمر حیات نے گھڑی دیکھی اور مجھ سے کہا۔

''فراست اللہ اپنی فیملی کے ساتھ ساڑھے تین بجے والی ٹرین سے یہاں پہنچ رہا ہے۔ ہل مین لے جانا اور اُسے اندر والے مہمان خانے میں ٹھہرانا۔''

میں نے تعمیل کے الفاظ کہے۔ جب میں باہر نکلنے لگا تو انگریز پھر بولا۔

''اور اُس کی بیوی سے ہندوستان کی آزادی کے بارے میں کوئی بات نہ کرنا ورنہ وہ تمہارا منہ نوچ لے گی۔''

میں نے نکلتے ہوئے جو آواز سنی وہ عمر حیات کی تھی اور اُس سے غصہ عیاں تھا۔

''نوکروں کے سامنے اپنی زبان بند رکھا کرو۔''

مغربی پنجاب کی چاندنی رات کا فسوں لفظوں میں بیان کرنا بہت مشکل کام ہے۔اسے صرف دیکھا اور محسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔دُور تک لہلہاتے کھیتوں میں ٹاہلی کے پیڑ آسمان کی طرف دیکھتے یوں لگ رہے تھے جیسے چاندنی سے سرگوشیاں کررہے ہوں۔دن کو گرمی اور رات کو خنکی ہوجایا کرتی تھی۔گندم کی بالیاں سنہری ہونا شروع ہوگئی تھیں اور میں ریل کی پٹڑی کے ساتھ چل رہا تھا۔کلونت کے گاؤں جسے چوروں کا گاؤں کہتے تھے، جانے کا ایک راستہ اور بھی تھا اور شاید کچھ مختصر بھی لیکن میں سانپوں کے خوف سے ایسا نہیں کررہا تھا کیونکہ مغربی پنجاب کے سانپ خطرناک سمجھے جاتے ہیں اور کالا سانپ تو اپنے شکار کو بس ایک آدھ گھنٹے کا وقت ہی دیتا ہے۔اب تو سانپ کاٹے کا علاج دریافت ہوچکا ہے لیکن جس وقت کی میں بات کررہا ہوں، اُس وقت سانپ کاٹنے پر مریض کو اصلی گھی پلا کر قے کروائی جاتی تھی اور متاثرہ مقام سے ذرا اوپر،، بند،، باندھ کر خون روک دیا جاتا تھا۔کہیں کہیں جوگیوں کو بلایا جاتا تھا جو مسلسل بین بجایا کرتے تھے اور مشہور تھا کہ سانپ بین کی آواز سن کر مریض تک پہنچتا اور اپنا زہر چوس لیتا ہے۔یہ سب قصے کہانیاں تھیں کیونکہ اُس وقت کسی کو علم ہی نہیں تھا کہ سانپ سن ہی نہیں سکتا تو بین کی آواز پر کیسے دوڑا آسکتا تھا؟ بہرحال میں احتیاطاً ریل کی پٹڑی پر چل رہا تھا اور شفاف فضا والی اُس رات چاندنی اتنی گہری تھی کہ میں کچھ دُور تک، بہت صاف دیکھ سکتا تھا۔

اس ایک ماہ میں، مَیں پانچویں مرتبہ کلونت کور سے ملنے جارہا تھا۔مجھے پلیٹ فارم سے پہلے پٹڑی چھوڑنا تھی کیونکہ یہاں سے دائیں جانب جو پگڈنڈی گھومتی تھی، وہی کلونت کور کے گاؤں کو جاتی تھی۔ہوا میں خنکی تھی، پھیلا ہوا چاندنی کا غبار بھلا لگ رہا تھا اور کلونت کور کے گاؤں میں بھونکتے کتوں کی آوازیں اب صاف سنائی دینے لگی تھیں۔وہ وہیں موجود تھی جہاں ہم ملا کرتے تھے۔

کلونت کور کبھی سکول نہیں گئی تھی۔اُسے پنجابی کے سوا اور کوئی زبان نہیں آتی تھی نہ میک اپ کے جدید طریقوں اور اس میں استعمال ہونے والی کسی چیز کا کوئی علم تھا۔وہ سب کے سونے کے بعد بستر چھوڑ کر مجھے ملنے آتی تھی اور اُس وقت وہی لباس پہنے ہوتی جس میں وہ اُس رات بستر پر لیٹتی تھی۔وہ کوئی خصوصی اہتمام نہیں کرتی تھی۔دن بھر وہ اپنی ماں کے ساتھ گھر کے کاموں میں مشغول رہتی۔کھیتوں سے چارہ کاٹ کر لاتی، بھینس دوہتی، جانوروں کو چارہ ڈالتی اور کپڑے دھوتی تو جب وہ مجھ سے ملنے آتی تو مجھے اُس کے قریب سے کسی جدید سینٹ کی خوشبو نہیں بلکہ کبھی لسی، کبھی چارے اور کبھی بھینس کی بُو آتی لیکن کلونت کور کے دل میں چھپے محبت کے ان پھولوں کی مہک اُس وقت تک میرے گرد پھیلی رہتی، جب تک وہ میرے قریب بیٹھی معصومانہ باتیں کرتی رہتی تھی تو مجھے اُس سے لمحہ بھر کو بھی کراہت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

کلونت کور کی باتوں کا محور محض چوروں والا پنڈ تھا۔اُس کی مصلنیں، اُس کے ترکھان، لوہار، چرواہے اور ان کی بہو بیٹیاں۔ہمارے بارے میں وہ محض ایک بات کرتی کہ ہمیں شادی کرلینی چاہئے۔وہ جانتی تھی کہ اُس کا باپ بلبیر سنگھ کبھی اُس کی شادی مجھ سے نہیں کرے گا۔وہ بڑا مذہبی آدمی تھا۔کاروباری حد

تک تو ٹھیک تھا لیکن وہ مسلمانوں کو بالکل بھی پسند نہیں کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اُس کے گھر میں کوئی مسلمان ملازم تھا اور نہ ہی اُس کے کھیتوں پر کوئی مسلمان دکھائی دیتا تھا۔ایسے سخت گیر آدمی کی بیٹی ایک مسلمان کے عشق میں مبتلا ہوچکی تھی اور ہمارے مستقل ملن کا ایک ہی حل پیش کرتی تھی کہ میں اُسے بھگا لے جاؤں اور میں یہ کرنے پر آمادہ نہ تھا۔اُس رات بھی ہمارے درمیان یہی باتیں ہورہی تھیں۔

''مسلمانوں سکھوں کے بیچ کوئی جھگڑا تو اُس وقت ہوگا نا جب کسی کو پتہ چلے کہ میں کسی مسلمان کے ساتھ چلی گئی ہوں۔''

کلونت کور کہہ رہی تھی اور جب وہ یہ کہہ رہی تھی تو اُس کی سیاہ آنکھیں چاندنی میں چمک رہی تھیں اور اُس کے بدن سے سبزے کی مہک پھوٹ رہی تھی۔میں ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔میں کلونت کور سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن کیسے؟ یہ میں نے ابھی تک نہیں سوچا تھا۔میں نے کہا۔

''دیکھو کلونت کور۔ہمیں اس رشتے کے لئے کوئی باعزت راستہ نکالنا ہوگا۔تم نے کبھی سوچا کہ تمہارے اس طرح گھر سے بھاگ جانے سے تمہارے باپ کی علاقے بھر میں کتنی بے عزتی ہوگی؟''

کلونت کور کو اس کا احساس تھا لیکن وہ اپنی محبت بھی نہیں کھونا چاہتی تھی تو وہ بولی۔

''ٹھیک ہے۔بالکل ہوگی پر ہمارا ملن کیسے ہوگا؟''

میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔انہی چھوٹی چھوٹی باتوں کے درمیان ہماری محبت پروان چڑھ رہی تھی۔

وہ ہندوستان کی سیاست کا ایک طوفانی دَور تھا۔فسادات ہر روز کا معمول تھے۔ہر روز کسی نہ کسی شہر سے فساد کی خبریں آتی تھیں۔جن علاقوں میں مسلمان، ہندو یا سکھ اقلیت میں تھے، وہاں وہ خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے لیکن یہ آگ ابھی تک چوروں والے پنڈ جیسے اُفتادہ دیہات تک نہیں پھیلی تھی۔

پاکستان کا مطالبہ کرنے والوں کو ابھی تک اس حقیقت کا ادراک نہیں تھا کہ اس مطالبے کے جلو میں آگ اور خون کا کیسا سمندر لہریں لے رہا تھا؟ کونسا طوفان پل رہا تھا؟ ایک ایسا طوفان جو عنقریب بلا امتیاز مذہب وعقیدہ لوگوں کی عزت، مال، جان کی دھجیاں بکھیرنے والا تھا۔میں سیاسی آدمی نہیں تھا۔مجھے سیاست سے فقط اتنی دلچسپی تھی کہ انگریزوں کو یہاں سے چلا جانا چاہئے اور ہندوستان کو آزاد ہوجانا چاہئے۔پاکستان کیوں بننے جارہا تھا، مجھے اس کی زیادہ فکر تھی اور نہ ہی کوئی دلچسپی۔میں جیرے کے ہوٹل پر اپنی سیاسی اور نیم سیاسی دوستوں کی اس حوالے سے جو گفتگو سنتا تھا، اُس میں پاکستان کے حامی لوگ پاکستان کی جو تصویر کھینچتے تھے، اُس سے بحیثیت مسلمان تو مجھے دلچسپی تھی لیکن جب میں اسے حقیقت سے جوڑ کر دیکھتا تھا تو مجھے سب جھوٹ لگتا تھا۔ہندوستان کے رہنے والے مسلمان کردار، قول و فعل اور روزمرہ کے معاملات میں ویسے ہی تھے جیسے سکھ یا ہندو۔میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کرتا تھا کہ تقسیم کی لکیر کے

اُس پار رہنے والوں یا یہاں سے جا کر وہاں آباد ہونے والوں کی کایا کیسے راتوں رات کلپ ہو سکتی تھی؟ میں شاید پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ لوگوں کو اس سراب میں مسلم لیگ کی دوسرے درجے کی وہ قیادت مسلسل مبتلا کر رہی تھی جو اپنے خوابوں میں زندہ تھی اور یہ سوچنے سے قاصر بھی کہ جب اسلام کا،، احیا،، صدیوں سے اُس سرزمین میں نہیں ہو پا رہا تھا، جہاں سے وہ پھوٹا تھا تو برصغیر میں یہ کیسے ممکن تھا جہاں کے مسلمان دیگر مذاہب کی طرح ہر قسم کی اخلاقی کمزوریوں کا شکار تھے؟ اور میری اس سوچ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پاکستان سیاسی لوگ بنانے جا رہے تھے جو یقیناً پیغمبر نہیں ہوتے جو خدائی مدد سے معاشروں کو تبدیل کر دیا کرتے ہیں!

اُس رات کلونت کور کی معصومیت، سادگی اور محبت دیکھ کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اُسے ایسی ہی کسی رات اپنے ساتھ اپنے شہر لے جاؤں گا لیکن اس سے پہلے مجھے اپنے گھر والوں سے بات کرنا تھی۔

نواب فراست اللہ دو چار سو گاؤں پر مشتمل ایک،، ریاست،، کا نواب تھا۔ وہ ایک ایسی بوگی میں سفر کر رہا تھا جس میں وہ اور اُس کی موٹی انگریز بیوی ہی تھی۔ مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔

میں یہ سمجھ کر کہ فراست اور اُس کی بیوی، دو افراد کا استقبال کر کے مجھے اُنہیں حویلی تک پہنچانا تھا، محض ایک کار لے کر گیا تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ فراست اور اُس کی انگریز بیوی آٹھ ملازمین کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ اُن میں مالش کرنے والے سے لے کر حقہ تازہ کرنے والے، ہر قسم کے ملازمین موجود تھے۔ فراست کی بیوی نے ریلوے سٹیشن پر ہی میری عزت اُتار کر میرے ہاتھ پر رکھ دی۔

''دیسی لوگوں کا یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ عقل نہیں ہوتی تم لوگوں میں۔ تمہارا کیا خیال تھا ہم نوکروں کے بغیر سفر کر رہے ہوں گے؟ میرے نوکروں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ سمجھے؟''

اس سرزنش کے دوران نواب فراست پان سے میلے دانت نکالے اثبات میں یوں سر ہلاتا رہا جیسے وہ چابی سے چلنے والا کوئی ایسا کھلونا ہو جس کی سر ہلانے والی کل کو دبا دیا گیا ہو۔

میں نے ڈرائیور کے ہمراہ دونوں کو حویلی بھیجا اور تین تانگوں میں اُن کے نوکروں کو لئے روانہ ہوا۔ نوکر بھی شاید نواب کی موٹی بیوی سے تنگ آئے ہوئے تھے، چنانچہ اُن میں سب سے عمردار، جسے دیگر نوکر عبدل بھائی کہہ کر پکار رہے تھے، غالباً میرا دل رکھنے کو بولا۔

''برا مت ماننا بابو جی۔ اتنی انگریزی ہم بھی سمجھ لیتے ہیں۔ سالی ایسے ہی بولتی ہے سب سے۔ میں اِتا سا آیا تھا، مرحوم بڑے نواب صاب کے کنے (پاس)۔ میری بھی عزت نئیں کرتی۔ سنا ہے سالی ناچتی تھی ہوٹلوں میں ہوں آں (وہاں) ولایت میں۔ کیوں بے رئیس؟''

اس تانگے میں میرے اور عبدل کے علاوہ بس رئیس اور سوار تھا۔ رئیس لہک کر بولا۔

''سنا تو یہی ہے مگر عبدل بھائی ناچتی کیسے ہوگی؟ سالی کے دودھ اور چوتڑ اِتے بڑے بڑے ہیں

گے؟ اپنے ہیاں (یہاں) کی رنڈیوں کا بدن تو ٹٹولنے پہ بھی پتہ نئیں چلتا۔''

اس پر عبدل ہنسا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''سنا منی جر صاب؟ سالا ایسا بول رہا ہے جیسے عمر بھر رنڈیوں کو ٹٹولا ہو۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد رئیس نے بیڑی سلگائی اور مزے سے کش لے کر بولا۔

''وہ جو سالا پاکستان واکستان بن رہا ہے نا۔ اُس کے خلاف ہے سالی۔''

موضوع سیاست ہو چکا تھا تو عبدل بھائی نے سنجیدگی سے کہا۔

''وہ اکیلی تو نئیں ہے۔ نواب صاب بھی ہیں گے۔ یہ قصہ کیا ہے منی جر صاب؟''

میں نے پاکستان کے اغراض و مقاصد انتہائی مختصر الفاظ میں بتائے جنہیں دونوں آدمیوں نے سنجیدگی سے سنا۔ پھر رئیس نے بیڑی کا ٹکڑا عبدل کو تھماتے ہوئے کہا۔

''کچھ بھی نئیں ہوگا۔ لکھ لو۔ یہ سب سالے ایسے ہی عیش کرتے رہیں گے۔ غریب غریب رہے گا اور امیر امیر۔ اور پھر یہ مسلمان؟ سالوں نے اپنی حکومت جیسے انگریزوں کو پلیٹ میں رکھ کے دے دی تھی۔ ویسے ہی یہ نیا ملک بھی دے دیں گے۔ تم دیکھ لینا۔''

میں نے اُس وقت رئیس کی بات سے اتفاق نہیں کیا تھا لیکن پاکستان بننے کے ساتھ جیسے ہی پاکستان کے اولین حکمرانوں نے امریکہ کی گود منتخب کی اور اُچھل کر اُس میں جا بیٹھے، تب سے یقیناً پاکستان پر بلا واسطہ امریکہ کی ہی حکومت ہے۔ انہی باتوں میں حویلی آ گئی اور میں نے ملازمین کو شاگرد پیشہ کے کمروں میں ٹھہرا دیا۔

نواب فراست اللہ خان کی بیوی انگریز تھی۔ ڈینی بھی انگریز تھا اور کیٹی بھی لیکن ان تینوں میں کتنا فرق تھا، میں یہ سوچتا تو حیران رہ جاتا۔ ڈینی سارا سال مختلف ریاستوں میں قیام کرتا اور اپنی پیش گوئیوں سے راجوں اور نوابوں کو خوش رکھتا۔ دراصل وہ ایک انتہائی کائیاں شخص تھا جس کا نجوم کا علم بھی کچھ نہ کچھ واسطہ رہا ہوگا لیکن یہ اس کی چرب زبانی تھی جس نے اُسے مقبول کر رکھا تھا۔ اُس سے زیادہ بہتر پیش گوئیاں کرنے والے ہندوستان میں موجود تھے لیکن اُن کی چمڑی کا رنگ سفید نہیں تھا۔ اُس شام عمر حیات نے مجھے پہلی مرتبہ ڈانٹا لیکن وہ ان معنوں میں سمجھدار آدمی تھا کہ اُس نے ایسا تنہائی میں کیا۔

''تم میں اتنی عقل ہونا چاہئے تھی کہ ملازمین کے لئے علیحدہ سے سواری کا بندوبست کرتے''۔

میں نے صاف صاف بات کی۔

''میرا واسطہ کبھی نوابوں راجوں سے نہیں پڑا تو مجھے اُن سے سلوک کے آداب کا علم نہیں ہے خان جی۔ آئندہ خیال رکھوں گا۔ ویسے میں کچھ عرض کر سکتا ہوں۔''

عمر حیات نے مجھے فقط سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔

''یہ انگریز لوگ ہم دیسی لوگوں سے بات کرتے وقت ہمیں بالکل جانور سمجھتے ہیں۔ میں تعلیم یافتہ ہندوستانی ہوں۔ میرا سیاسی شعور بالکل بھی نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ عنقریب یہ لوگ یہاں سے دفعان ہو جائیں گے تو ہمیں ان کا یہ سلوک برداشت نہیں کرنا چاہئے اور شاید میں اب نہ کروں۔''

میری بات یقیناً عمر حیات کے لئے ایک انہونی کی حیثیت رکھتی تھی۔ اُس سے حقہ پینا ترک کیا اور مجھے گھور کر دیکھا۔

''تم جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم بھی انہی جاہلوں میں شامل ہو جو انگریز کے ہندوستان چھوڑنے کے حق میں ہیں؟''

میں یقیناً انہی جاہلوں میں سے تھا تو میں نے کہا۔

''آپ ایسا نہیں چاہتے؟''

عمر حیات مسکرایا اور حقے کا ایک ہلکا سے کش لگا کر بولا۔

''کوئی بھی وہ شخص اس احمقانہ تجویز کی حمایت نہیں کرتا جو ہندوستان کا بھلا چاہتا ہے۔ ٹھیک ہے انگریز باہر سے آئے ہوئے لوگ ہیں مگر یہ مت بھولو کہ جنہیں کولونیل ماسٹرز کہا جاتا ہے، اُن میں سب سے مہذب یہی قوم ہے۔ انہوں نے ہندوستان کو جدید زندگی کا تمام انفراسٹرکچر مہیا کر دیا ہے۔ ہمارے لوگوں کو انسانوں کی طرح جینا سکھا دیا ہے اور چھوٹے چھوٹے دیہات تک میں سکول قائم کر دیئے ہیں۔ تم مغلوں اور اُن سے پہلے کے ہندوستان کے اُس تاریک دَور سے چمٹے رہنا چاہتے ہو جس نے جہالت، بیماری اور گندگی کے علاوہ اس ملک کو کچھ نہیں دیا؟''

میں جواب سوچنے لگا تو شاید وہ سمجھا کہ میں اُس کے خوف سے بات کرنے سے ہچکچا رہا ہوں اور پھر شاید یہ بات بھی تھی کہ وہ اس سلسلے میں اپنے ملازمین کو اپنا ہمنوا دیکھنا چاہتا تھا اور مجھے اپنی گفتگو سے اپنا ہم خیال بنانا چاہتا تھا تو اُس نے نرمی سے کہا۔

''اگر تمہارے پاس اس کا کوئی جواب ہے تو بلا جھجک بات کرو۔ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اظہار خیال پر پابندی لگاتے ہیں۔ کھل کر کہو۔''

مجھے جو بھی کہنا تھا کھل کر ہی کہنا تھا۔ ابھی عمر حیات کو علم نہیں تھا کہ میں ایک ایسے ماضی سے بھی گزرا تھا جس میں ایک بااثر سرکاری ملازم انگریز کے منہ پر دو تھپڑ مارنا بھی شامل تھا۔ میں نے کہا۔

''میں ہندوستان پر قبضہ اور حملہ کرنے والوں بلا امتیاز مذہب اور عقیدہ جارح سمجھتا ہوں۔ یہ ایک پرسکون ملک تھا اور اگر یہاں کسی قسم کے جھگڑے تھے بھی تو وہ آپسی تھے جن کا بیرونی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ بیرونی حملہ آور اس ملک کو محض لوٹنے کے لئے اس پر حملے کیا کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے آپ مجھے یہ کہہ کر قائل کرنے کی کوشش کریں کہ آج ہندوستان میں مسلمانوں کی جو کثیر تعداد دکھائی دے رہی ہے، وہ

انہی قابض حکمرانوں کی وجہ سے ہے تو میں اس کو یوں تسلیم نہیں کروں گا کہ اسلام اس سرزمین پر پھیلانے میں ان حکمرانوں کا ہاتھ کیسے ہوسکتا ہے جو اقتدار کی جنگ کے لئے، ہم مذہب ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی گردنیں کاٹتے رہے؟ اسلام یہاں صوفیائے کرام کی وجہ سے پھیلا اور شاید وہ بھی اتنی جلدی کامیاب نہ ہوتے اگر ہندوؤں میں ذات پات کا نظام اتنی شدت سے نافذ نہ ہوتا۔''

عمر حیات نے چند لمحوں تک مجھے دیکھا اور مسکرایا۔ اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم تاریخ کو اس رخ سے دیکھتے ہو لیکن کیا یہ سچ نہیں ہے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کی مندر بھی مسمار کئے؟''

میں نے کہا۔ ''مسلمانوں نے تو مسجدیں بھی مسمار کیں اور کیا تاریخ میں اس کے شواہد نہیں ملتے کہ بوقت ضرورت ہندو حکمرانوں نے بھی اپنے مندروں کو گرایا اور سیاسی مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا؟ اور کیا ایسی مثالیں نہیں ہیں کہ مسجدوں کے ساتھ ساتھ مندروں کے سالانہ وظیفے بھی مسلمان حکمرانوں نے مقرر کر رکھے تھے؟ نہیں جناب۔ میں اسے کسی عام ہندو یا عام مسلمان سے ایک دوسرے کی نفرت کی بنیاد یوں نہیں مان سکتا کہ میرے نزدیک یہ اقتدار قائم رکھنے کے وسیلے تھے۔ ہندو ہوں یا مسلمان یا پھر انگریز۔ اُنہوں نے اقتدار کی جنگیں کیں اور اس کے لئے کسی مذہب کی کوئی پروا نہیں کی۔ انگریز تو بدیسی ہیں، آج نہیں تو کل یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہندو اور مسلمان کو یہیں رہنا ہے اور مل کر رہنا ہے ورنہ غربت، جہالت اور بے امنی کا عفریت ان کا پیچھا کبھی نہیں چھوڑے گا۔''

عمر حیات مسکرایا اور بولا۔ ''اسی لئے تو ہم نہیں چاہتے کہ پاکستان بنے۔ دیکھو نا۔ ایک مستقل دشمنی کی بنیاد پڑ جائے گی دونوں قوموں میں۔''

میں نے کہا۔ ''خان جی۔ بات پاکستان بننے یا نہ بننے کی نہیں ہے۔ بات نفرت کی اُس گہری بنیاد کو ختم کرنے کی ہے جسے ہندو اور مسلمان اپنی حماقتوں سے گہرا کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ ہندوؤں نے یہ کیسے فرض کر لیا ہے کہ ہندوستان کی چوتھائی آبادی پر مشتمل مسلمان یہاں سے کہیں اور چلے جائیں گے؟ اسی طرح مسلمانوں کو یہ خوش فہمی کیوں ہوگئی ہے کہ پاکستان بنتے ہی وہ دودھ اور شہد کی نہروں والے کسی دیس میں جا کر آباد ہو جائیں گے؟''۔

عمر حیات نے مجھے گھورا اور بولا۔ ''تم پاکستان کے حق میں ہو یا مخالف؟ مجھ سے صاف صاف بات کرو۔''

میں نے حوصلہ کر کے کہا۔

''میں ہندوستان کا بٹوارہ مذہبی بنیادوں پر اس لئے نہیں چاہتا کہ اس سے دونوں ملکوں میں مذہبی پیشواؤں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو جائے گا جو سرحد کی ایک طرف اپنے مذہبی ہیروز کی مدح کرے گا اور دوسری طرف والا طبقہ ہندوؤں کو ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا کہ وہ کبھی ہندوستان کے مالک تھے اور مسلمان غاصبوں نے

اُن سے یہ ملک چھین لیا تھا اور اس کا نتیجہ اس خطے میں اس مستقل دشمنی کی بنیاد کے سوا اور کچھ نہیں نکلے گا۔''

عمر حیات بہت خوش ہوا اور بولا۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میری بہت سی جائیداد شملہ اور دلی میں ہے۔ میں گرمیاں شملہ میں گزارتا ہوں۔ دو ملک ہو گئے تو وہ جائیداد میرے ہاتھ سے نکل جائے گی لیکن اب کچھ دنوں سے لگتا ہے، مجھے پاکستان بنانے والوں کا ساتھ دینا ہوگا۔''

یہ بیان میرے لئے حیرت کا باعث تھا تو میں نے کہا۔

''آپ پاکستان کے حق میں کیوں ہو گئے اچانک؟''

وہ مسکرایا اور بولا۔''یہ کانگریسی الو کے پٹھے آزادی کے بعد بڑی جاگیریں ختم کرنے کے اعلانات جو کر رہے ہیں۔ مسلم لیگ نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ ہندوستان ہو، پاکستان یا انگریز، مجھے اپنی جاگیر بہرحال بچانا ہے۔ ٹھیک کہا نا میں نے؟''

اُس روز پہلی مرتبہ مجھے محسوس ہوا کہ اچانک ہی کیوں بڑے بڑے مسلمان جاگیردار کیوں دوسری جماعتیں چھوڑ کر مسلم لیگ میں جمع ہو رہے تھے؟ مسلم لیگ کی اس حماقت کو آج تک پاکستان کی سیاست بھگت رہی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ سٹیٹ بینک کے افتتاح کے موقع پر جناح صاحب کو کہنا پڑا تھا کہ میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں!

گو مجھے اس سارے قصے میں انگریزوں کے یہاں سے چلے جانے سے دلچسپی تھی لیکن پھر بھی مجھے حیرت ہوئی کہ ایسے لوگ بھی تھے جو پاکستان کے قیام سے پہلے ہی اپنے فوائد سوچے بیٹھے تھے۔ میں نے کہا۔

''جناح صاحب بنائیں یا نہ بنائیں لیکن میں ہندوؤں کی قیادت میں ایک طبقہ بہرحال ایسا دیکھ سکتا ہوں جو اچانک ہی پاکستان بنانے میں دلچسپی لینے لگا ہے۔''

وہ مسکرایا اور بولا۔''میں جانتا ہوں۔ سیاست نہیں، نفرت اور تنگ دلی اس ملک کے دو ٹکڑے کروانے جا رہی ہے۔ تم جانتے ہو مسلمانوں کو بڑے سرکاری عہدوں سے علیحدہ کیا جا رہا ہے؟ ہندوؤں میں رام راجیہ اور اکھنڈ بھارت کے تصور کو زندہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے؟ ہندوستان کو متحد رکھنے اور اس کے اندر ہی مسلمانوں کو حقوق دینے والی بات کو کانگریسی قیادت نے مسترد کر دیا ہے؟ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ ہندو قیادت خود بھی چاہتی ہے کہ ایک اور ملک بن جائے اور سارے مسلمان اُس میں دفعان ہو جائیں لیکن ایسا ہوگا نہیں۔ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو پاکستان منتقل کرنا ناممکنات میں سے ہے کیونکہ ہندوستان میں ایسے مسلمانوں کی بھی کمی نہیں جو یہاں سے کہیں اور نہیں جانا چاہتے ایسی ہی صورت حال مسلم اکثریتی علاقوں میں رہنے والے غیر مسلموں کی بھی ہے۔ صدیوں سے جمے جمائے لوگ ایک جگہ سے اُکھڑ کر دوسری

جگہ جائیں گے تو خطے میں ایک عظیم الشان تہذیبی تبدیلی رونما ہوگی۔ ایک ایسی تبدیلی جس کا مذہب سے کوئی واسطہ نہ ہوگا، اقتصادیات اور سماجیات سے ہوگا۔ اگر تم تاریخ کے طالب علم ہو تو تمہیں پتہ ہی ہوگا کہ ایسی تبدیلیاں معاشروں میں کیسی اُتھل پتھل پیدا کرتی ہیں؟ میں صرف اپنی ذات کی بات کرتا ہوں۔ اگر کانگریس جاگیریں چھیننے کی بات نہ کرتی تو میں کبھی پاکستان کے بارے میں نہ سوچتا۔''

میں جانتا تھا کہ ایسا ہی تھا۔ میں تین دن کی چھٹی لے کر گھر چلا گیا۔

''اوئے تیری تو.....ساتھ میں اُس سکھنی کی بھی.....''

ابا جی نے میری وہ بات جو میں نے ڈرتے ڈرتے اُن سے کہی تھی، سن کر جواباً کہا۔

''اوئے کسی کافر کے بچے۔ تجھے سارے جہان شادی کے لئے جو لڑکی ملی وہ سکھوں میں ملی؟ مسلمان لڑکیاں مر گئی تھیں کیا؟ بے غیرت کے بچے۔ تجھے پتہ نہیں مجھے ان سکھوں سے کتنی نفرت ہے؟ کتنے.....ہوتے ہیں یہ؟''

میری خواہش کے جواب میں ابا جی نے گالیوں کا جو طوفان کھڑا کیا، اُسے اماں نے یہ کہہ کر روکا۔

''آہستہ بولو۔ دیوار سے دیوار ملی ہوئی ہے یہاں۔ کیوں سارے محلے کو سنا رہے ہو؟''

مگر ابا جی کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

''میں کہتا ہوں اس کی جرات کیسے ہوئی یہ بات کرنے کی؟''

پھر انہوں نے اماں سے ڈپٹ کر بات کی۔

''تو چپ رہ نہیں تو گھر سے نکال باہر کروں گا۔ تجھے ان باتوں کا کیا پتہ؟ ہر روز شہروں میں ہندو مسلم سکھ مار ماری ہو رہی ہے۔ یہ سکھ لڑکی پہ گرم ہو گیا ہے۔ حرامزادے، کیوں فسادات کروانا چاہتا ہے مفت میں؟''

میں نے دبی زبان سے کہا۔''ابا جی وہ مسلمان ہونے کو تیار ہے۔''

اس بات پر اُن کا غصہ مزید تیز ہوا۔ وہ بولے۔

''اوئے میں مسلمان ہوں۔ اور باتوں کا پتہ ہو یا نہ ہو، اتنا ضرور پتہ ہے کہ بندہ مسلمان ہونے کے لئے دل سے کلمہ پڑھتا ہے۔ وہ دل سے نہیں، تجھ سے شادی کرنے کے لئے کلمہ پڑھے گی تو مسلمان کیسے ہوگی؟ بس میں نے کہہ دیا۔ اگر تو نے اپنی مرضی کی تو میں تیری.....''

غالباً اس خوف سے کہ پڑوسی نہ سن لیں، اُنہوں نے اپنی بات مکمل نہیں کی اور حقے کا زوردار کش لگایا، حقہ ایک طرف ہٹایا، دھوتی رانوں میں دبا کر سوتے میں ممکنہ برہنگی کے خطرے کو ٹالا اور بستر پر دراز ہو کر بولے۔

''تجھے اپنی شادی کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ تیری شادی میں خود کروں گا اور کسی شریف مسلمان لڑکی سے کروں گا۔ میری طرف سے یہ بات ختم ہے۔''

اماں نے مجھے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں ابا جی کے فیصلے کے بعد کچھ اور کہنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن مجھے ہر صورت میں شادی تو کلونت کور سے ہی کرنا تھی۔ میں گھر سے نکلا اور جیرے کے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے دل پر بڑا بوجھ تھا اور میں اپنے کسی یار سے دل کا حال کہہ کر اس بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا تھا۔

گرمیوں کی آمد کے ساتھ ہی جیرے کے ہوٹل کی کرسیاں آدھی گلی تک پھیل چکی تھیں۔ وہاں زیادہ لوگ بھی نہیں تھے اور میرے دوستوں میں سے بھی کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خلش کبھی کبھار ہی آیا کرتا تھا کیونکہ اُس کا دفتر شملہ میں تھا۔ ججی نے جب سے نیا عشق شروع کیا تھا وہ ویسے بھی ہوٹل پر کم کم آیا کرتا تھا۔ میں تنہا بیٹھا چائے پیتا اور سگریٹ پھونکتا رہا، پھر کسی نے میرے شانے پہ ہاتھ رکھا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ گوگی بٹ تھا۔

میں اُسے بہت دنوں بعد دیکھ رہا تھا۔ مجھے اُسے اُس وقت وہاں دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ گوگی بٹ سامنے والی کرسی پر بیٹھا اور مسکرا کر بولا۔ ''چھٹی آیا ہے یا نوکری چھوڑ دی؟''

میں نے بتایا کہ میں چھٹی پر آیا تھا تو گوگی بٹ ہنس کر بولا۔

''یہ جاگیردار پکے اپنی ماں کے یار ہوتے ہیں۔ دیکھا اس ٹیم کیسے دھڑا دھڑ مسلم لیگ میں شامل ہو رہے ہیں۔ وجہ وہی ہے کہ کانگریس آزادی کے بعد ان کی جاگیریں چھین لے گی۔ ناں یار ایک بات کی سمجھ نئیں آتی، یہ مسلم لیگ والے ایسا کوئی اعلان کیوں نئیں کرتے؟ تیرے جاگیردار کا کیا خیال ہے؟''۔

میں اُس وقت سیاست پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شاید کر ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس موضوع پر بات کرنے کے لئے جس ذہنی یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ابا جی کی باتوں نے مجھ سے چھین لی تھی۔ گوگی بٹ دلیر اور مخلص شخص تھا۔ ہمارے محلے میں مسلم لیگیوں کی اکثریت تھی اور لوگ کانگریس کے حمایتیوں کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ کانگریس کی کھلم کھلا حمایت کیا کرتا تھا۔ میں نے اُسے اپنی اور کلونت کور کی محبت کا قصہ اور ابا جی کی مخالفت کی داستان سنائی۔ گوگی بٹ کی آنکھیں یہ سن کر چمکنے لگیں اور اُس نے کوئی اگلی بات کرنے سے پہلے، چائے کا گھونٹ لیا، سگریٹ سلگایا اور بولا۔

''اوئے یہ،، ابے شبے،، ایویں ہی بھانجیاں مارتے رہتے ہیں۔ تُو اس کی فکر نہ کر۔ شادی کر لے چپ چاپ۔ ایک آدھ بچہ پیدا کر۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

جتنا میں اپنے ابا جی کو جانتا تھا تو یہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا۔

''احمقانہ بات ہے۔ تم میرے ابا کو نہیں جانتے۔ وہ کبھی اس رشتے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔''

گوگی بٹ نے ایک کش اور لگایا اور بولا۔

''اور اُس کا باپ؟ میرا مطلب ہے تیری معشوق کا باپ؟ وہ مان جائے گا؟''

میں جانتا تھا ایسا بھی ممکن نہیں تھا تو میں نے کہا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

گوگی بٹ نے چند لمحوں تک سوچا اور مسکرا کر بولا۔

''ایسے تو پھر یہ شادی کبھی نہیں ہو سکتی۔''

ایسے حالات میں لگتا تو یہی تھا لیکن مجھے کسی بھی صورت یہ شادی کرنا تھی تو میں نے کہا۔

''کچھ بھی ہو میں یہ شادی ضرور کروں گا۔ میں نے اُسے زبان دے دی ہے۔''

گوگی بٹ کو میرا زبان والا حوالہ بہت پسند آیا۔ وہ ہنسا اور بولا۔

''ایسی بات صرف اصلی مرد ہی کر سکتے ہیں۔ دیکھ اگر تُو اُسے،، نکال،، کر لے آئے تو اگلا سارا کام میرے ذمے۔ میں تم لوگوں کے رہنے سہنے کا بندوبست بھی کر دوں گا۔ یہاں نئیں دلی میں۔ اپنے بڑے یار ہیں وہاں۔ بس حوصلہ کر اور دیر نہ کر۔''

لیکن یہ اتنی آسان بات نہیں تھی۔

اگلے دن جب ابا جی سبزی منڈی چلے گئے اور مجھے بھی اُسی شام واپس روانہ ہونا تھا تو اماں نے مجھ سے تنہائی میں بات کی۔

''یہ تو نے کیا نیا قصہ شروع کر دیا ہے بیٹا؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

میں اماں سے بحث بھی کر سکتا تھا اور کھل کے بات بھی۔ میں نے کہا۔

''اماں وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ سادہ سی دیہاتن۔ تمہارے ساتھ بہت اچھا گزارہ ہو گا اُس کے ساتھ۔''

اماں نے میری بات سے اتفاق کیا اور بولیں۔

''مگر بیٹا وہ غیر مذہب ہے۔ سکھنی ہے۔ ہم مسلمان ہیں۔ کون مانے گا یہ شادی؟''

میں اماں کو انسانی برادری، مساوات، مذہب کی اہمیت کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہ ہونا وغیرہ کی مثالیں دے کر نہیں سمجھا سکتا تھا کیونکہ میری اماں صرف قران شریف پڑھی ہوئی تھیں اور اُنہوں نے اپنے شہر کے علاوہ صرف جالندھر دیکھا تھا تو میں نے کہا۔

''اماں۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ وہ مسلمان ہونے کو تیار ہے۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔''

اب اماں نے اپنے ترکش سے اخلاقیات کا تیر نکالا اور طنزیہ لہجے میں بولیں۔

''جو لڑکی ماں باپ کا گھر چھوڑ کر ایک غیر مرد کے ساتھ گھر سے بھاگنے پر تیار ہو اور جسے اپنے ماں باپ کی عزت کا ذرا سا بھی پاس نہ ہو، وہ اچھی لڑکی کیسے ہوئی بھلا؟ میں یہ بات نہیں مان سکتی۔''

اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے چڑ کر کہا۔

''مگر میں شادی کلونت کور سے ہی کروں گا۔ بس۔''

مجھے اس بات پر اپنی ماں کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر افسوس بھی ہوا لیکن میں بھی ایسا کہنے پر مجبور تھا۔ اماں نے طویل سانس لی اور اُٹھتے ہوئے بولیں۔

''جو تیری خوشی ہو کر۔ پر اتنا یاد رکھنا تیری یہ حرکت تیرے باپ کو جیتے جی مار دے گی۔''

اماں مجھ سے لاتعلق ہو کر گھر کے کاموں میں اُلجھ گئیں اور میں بے بسی سے سوچتا ہی رہ گیا۔ شام کو ابا جی کے لوٹنے سے پہلے ہی میں اپنی نوکری پر جانے کے لئے گھر سے نکل گیا۔

نواب فراست اللہ اور اُس کی موٹی انگریز بیوی ابھی تک عمر حیات کی مہمان تھی۔ میں نے دیکھا، نواب کی بیوی ڈینی سے بہت متاثر دکھائی دے رہی تھی۔ ڈینی نے اُسے دبلا ہونے کا کوئی دیسی نسخہ بھی بتلایا تھا، شاید ہی وجہ تھی کہ وہ دو نوکروں کے ساتھ صبح صبح کھیتوں میں گھومتی بھی دکھائی دیتی تھی۔ یہ عورت مجھے پہلے دن سے ناپسند کرتی تھی اور میں اُسے۔ وہ ہندوستانیوں کی تضحیک کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانتے دیتی تھی۔ عمر حیات اور نواب فراست اللہ کہیں انگلینڈ میں ساتھ پڑھتے رہے تھے اور ایک ہی کمرے میں بھی رہتے تھے تو ان کی دوستی بہت گہری تھی۔ نواب فراست اللہ نے کانگریس کے اس اعلان کے بعد کہ بڑی جاگیریں آزادی کے بعد ضبط کر لی جائیں گی، اُن علاقوں میں جن کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا تھا کہ وہ پاکستان میں شامل ہونے جا رہے تھے، زمینیں خریدنا شروع کر دی تھیں اور عمر حیات اس سلسلے میں اس کی مدد کر رہا تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ فراست اللہ کا تعلق یوپی سے تھا اور یوپی کو بہر صورت ہندوستان میں ہی شامل رہنا تھا۔ بہت بعد میں میرے علم میں یہ بات آئی تھی کہ فراست اللہ نے پاکستان آنے کے بعد دو شہروں کے مضافات میں کوئی چودہ ہزار ایکڑ زمین الاٹ کروالی تھی، یہ اُس کے علاوہ تھی جو وہ عمر حیات کی مدد سے اس سے پہلے خرید چکا تھا۔ ایک بڑے شہر میں ایک بڑا ہوٹل اور ایک سنیما اس کے علاوہ تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں پاکستان کے قیام یا ہندوستان کی آزادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اُنہیں اس مملکت میں اپنی چھوٹی موٹی ریاستیں، انگریز کے جانے کے بعد بھی قائم رکھنا تھیں اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے تھے۔ اُن کی اولاد آج بھی، پاکستان کی کل آبادی کا ایک انتہائی معمولی حصہ ہونے کے باوجود یہاں کے وسائل پر قابض ہے اور سیاست کی راہ اقتدار پر بھی۔

۱۹۳۷ کے بعد جتنے بھی مشن برطانیہ نے ہندوستان بھیجے ہو سب ایک طرح سے ناکامی سے ہی دو چار ہوئے۔ پاکستان بننے کی شاید نوبت ہی نہ آتی اگر مسلمانوں کے ساتھ کانگریس کا مجموعی سلوک بڑے بھائی جیسا ہوتا۔ کانگریسی وزارتوں کے دوران مسلمانوں نے ہندوستان میں وہ ہوتا دیکھا جسے وہ مستقلاً قبول کرنے پر کسی بھی صورت آمادہ نہ تھے۔ وہ کام جو قیام پاکستان کے سلسلے میں مسلم لیگی مولویوں نے بعد میں کیا، وہ کانگریس نے سن سینتیس میں ہی کر دیا تھا۔ مسلمانوں کو ملازمتوں سے برطرف کیا گیا، سکولوں کے نام ،،ودیا مندر سکول،، قسم کے رکھے گئے اور بندے ماترم کو قومی ،،سلام،، قرار دیا گیا۔ کانگریس کی یہ احمقانہ پالیسیاں مسلمانوں کو کسی صورت منظور نہ تھیں چنانچہ کیبنٹ مشن کی

ہندوستان کو ایک ملک رکھنے کی کوشش بھی محض اسی لئے ناکام ہو گئی۔ اس کے علاوہ بھی اس میں اور بہت سی حقیقتیں بھی شامل ہیں جو اُس دَور کی تاریخ میں بہت صاف اور واضح طور پر لکھی اور جن کا مطالعہ اس سلسلے میں ذہن کو صاف کر سکتا ہے۔

جناح صاحب کے ،،ڈائریکٹ،، کے ایکشن کا ردعمل بنگال کے خونین فسادات کا آغاز تھا۔ اس کے ساتھ ہی مغربی پنجاب میں جہاں غیر مسلم آبادی پینتیس فی صد تھی، فسادات کا شکار ہونے لگی۔ سکھوں کو ان کی املاک، خاص طور پر زمینوں سے بے دخل کیا جانے لگا تو یہ سکھ باقاعدہ جتھوں کی صورت میں مشرقی پنجاب روانہ ہو گئے اور اُنہوں نے وہاں کے مسلمان زمینداروں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کر کے قبضے شروع کرنا دیئے۔ اب یہ کہنے کی غالباً کوئی ضرورت نہیں کہ یہ قبضے محبت بھرے سلوک کے ساتھ کئے گئے ہوں گے۔ فسادات کا ایک شاخسانہ دونوں طرف کے حضرات میں لالچ کا عنصر بھی تھا۔ یہ فسادات بعد میں بہار تک پھیلے اور ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا شدید جانی نقصان ہوا۔ بعد میں جب گاندھی جی نے بہار کا دورہ کیا تو ابھی تک ریلوں سے درختوں میں ٹھونکے گئے مسلمان بچوں کی لاشوں کے پنجر اپنی کہانیاں کہنے کو موجود تھے!

سن چھیالیس کے وسط سے پھوٹنے والے فسادات بتدریج ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ برطانوی وزیر اعظم مسٹر ایٹلی نے ۲۰ فروری ۱۹۴۷ کو پارلیمنٹ میں اعلان کر دیا کہ برطانیہ نے جون ۱۹۴۸ تک ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہ مسٹر ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے آخری وائسرائے ہوں گے اور تقسیم کے عمل کی ذمہ داری اُنہیں تفویض کی جائے گی۔ ماؤنٹ بیٹن ایک جلد باز شخص تھے تو انہوں نے ہندوستان پہنچنے میں دیر نہ لگائی۔ چونکہ وہ وسیع اختیارات دے کر اس ہدایت کے ساتھ ہندوستان پہنچے تھے کہ اقتدار مقامی لوگوں کو دے کر جلد از جلد ہندوستان سے بھاگ لیں تو وہ سارے معاملے کا ٹھنڈے دماغ سے جائزہ نہ لے سکے اور انہوں نے ۱۵ اگست ۴۷ کی تاریخ، ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کے قیام کے لئے طے کر دی اور اس کے ساتھ ہی برصغیر کے وہ عظیم الشان فسادات پھوٹے جنہوں نے ہندوستانیوں کا منہ تاریخ میں ہمیشہ کے لئے کالا کر دیا۔

میں جون سینتالیس کے وسط میں اپنے شہر پہنچا تو وہاں پہلا فساد ہو چکا تھا اور دونوں طرف کا جانی نقصان یعنی دو دو آدمی برابر تھا۔ شہر میں معمول کی رونق ضرور تھی لیکن خوف کا ان دیکھا سایا بھی ہر جگہ محسوس کیا جا سکتا تھا۔ خیال یہی تھا کہ ان فسادات پر دونوں طرف کے لوگ مل کر قابو پا لیں گے لیکن ایک ایسا عنصر اس میں تیزی سے داخل ہو رہا تھا جس نے بعد میں ہندوستان کے مختلف شہروں کو آگ اور خون میں دھکیل دیا۔ یہ وہ سکھ تھے جن کی بڑی تعداد مغربی پنجاب چھوڑ چھوڑ کر مشرقی پنجاب اور اس کے بعد پڑنے والے دوسرے شہروں میں تیزی سے پھیل رہی تھی۔ ابھی تک ریلوں پر حملے شروع نہیں ہوئے تھے۔ یہ حملے جب شروع ہوئے تو انہوں نے آگ اور خون کا وہ کھیل رچایا جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں شاید ہی کبھی اور کہیں ملے۔

جیرے کا ہوٹل ویران تھا۔ کچھ لوگ پاکستان چلے گئے تھے۔ کچھ زیادہ محفوظ محلوں میں منتقل ہو

چکے تھے۔ ہمارے گھر میں ابھی ہندوستان میں رہنے یا پاکستان چلے جانے کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ میری ابا جی سے بات ہوئی تو اُنہوں نے ایک زوردار گالی دے کر کہا۔

''ہم نے یہاں سے کہاں جانا ہے؟ لوگ بزدل ہیں۔ یہ قصے پہلے بھی ہوتے رہے ہیں۔ دو چار دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

میرا اپنا بھی یہی خیال تھا لیکن یہ خیال غلط تھا۔ میں واپس جاگیر پر پہنچا تو فسادات میں ایک وقفہ تھا جس سے لوگوں کو یہ خوش فہمی ہوئی کہ یہ دھول اب بیٹھ گئی تھی۔ مجھے جاگیر کے دو ٹریکٹروں کے لئے پرزہ جات لانے کو انہی دنوں دلی جانا پڑا اور یہ ایک اتفاق تھا کہ میری ملاقات کیٹی سے ہوگئی۔

اس ملاقات کو میں اس لئے اتفاق کہوں گا کہ کیٹی سیٹھ مول چند کی دوست تھی اور میں اُس وقت مول چند کے دفتر میں بیٹھا، اُس کے منیجر کو اپنا آرڈر لکھوا رہا تھا جب کیٹی دفتر میں داخل ہوئی۔ منیجر نے کھڑے ہو کر اُس کا استقبال کیا اور چند منٹ انتظار کرنے کو کہا کہ سیٹھ جی کے کچھ مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ کیٹی ذرا ہٹ کر پڑے صوفوں میں سے ایک پر بیٹھی اور چہرہ خشک کرنے لگی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے دیکھ چکی تھی اور نظر انداز کر رہی تھی، اس لئے میں نے بھی دوبارہ اُس کی طرف نہیں دیکھا لیکن اگلے ہی لمحے کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ کیٹی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میں بھی کھڑا ہوا۔ اُس نے مجھ سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور پرجوش آواز میں بولی۔

''اوہ مائی۔ اوہ مائی۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو ژون ڈون؟''

ہم دونوں ہنسے اور مول چند کے حیران منیجر کو چھوڑ کر صوفوں پر آن بیٹھے۔ ان چند مہینوں میں کیٹی قدرے دبلی ہوگئی تھی اور اُس کے چہرے کی رنگت سے کچھ سرخی بھی کم دکھائی دیتی تھی۔ کچھ رسمی باتوں کے بعد کیٹی نے مجھے شام کو اپنے فلیٹ پر آنے کو کہا۔

جب وہ ہمارے لئے شراب کے جام لے کر اور ایک مجھے دے کر اطمینان سے بیٹھی تو مسکرا کر بولی۔

''میں نے ایک دن تم سے کہا تھا نا کہ کسی شام ہم اکٹھے شراب پئیں گے؟ کہا تھا نا؟ تو وہ شام آج کی شام ہے۔''

برسات کی آمد سے پہلے چلنے والی مغربی ٹھنڈی ہوا کیٹی کے فلیٹ کی کھڑکی سے اندر آ رہی تھی اور مجھے بہت ہی اچھی لگ رہی تھی۔ بلاشبہ کیٹی نے اس شام شراب کا انتظام کر کے بہت ہی اچھا کیا تھا۔ وہ شام اُن شاموں میں سے تھی جن میں شراب نہ پینا اپنے اور موسم کے ساتھ زیادتی گردانا جانا چاہئے۔

''میں نے انگلستان واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

◂◂ ● ▸▸

(جاری)

تبصرے

نام کتاب: پتّی پتّی خواب کھلے
صنف: شاعری
شاعر: سید صابر حسن رئیس
پتا: 166، گھیر بساطیان، قافلہ گیٹ کے اندر، ٹونک (راجستھان) 304001
موبائل: 9799088060
انتخاب و ترتیب: ڈاکٹر ارشد عبدالحمید
باراوّل: 2014
تعداد: پانچ سو
قیمت: /250
صفحات: 112
تقسیم کار: (1) ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9 گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔ (2) مسکین بک ڈپو، موتی ڈونگری روڈ، جے پور، راجستھان
مبصر: اقبال حسن آزاد

سید صابر حسن رئیس ایک کہنہ مشق شاعر اور صحافی ہیں۔ انہوں نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ لیکن ان کی شناخت ایک منفرد شاعر کی حیثیت سے ہی قائم ہے۔ ان کے مجموعے ''پتّی پتّی خواب کھلے'' میں ایک نعت کے علاوہ چھیالیس غزلیں، پانچ نظمیں (انتظار ساعت، میرے ساتھ چلو، فسونِ ضیا، دھند کا سایہ اور تو اور میں)، تین سانیٹ، چھ رباعیات، اور بارہ قطعات شامل ہیں۔

اس مجموعے کے مطالعے کے بعد یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ سید صابر حسن رئیس کو ان تمام اصناف پر قدرت حاصل ہے لیکن ان کا اصل جوہر غزلیہ شاعری ہی میں کھلتا ہے۔ غزل گو شعراء کی بھیڑ میں اپنا راستہ، اپنی الگ پہچان بنانا بڑا دشوار ہے لیکن مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ موصوف کی شاعری اپنے تمام ہم عصروں سے بالکل جداگانہ ہے۔ ان کا ایک اپنا رنگ و آہنگ ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

تمہارا پیرہن منصفی ہے خوب مگر نشاں ہیں کوششِ بخیہ گری کے دامن میں
انا کی بیڑیوں کو کاٹ کر چلنا نہیں سیکھا مرے پائے رسا کا سیدھا سادا مسئلہ یہ ہے
رات شجر نے پلکیں جھپکیں پتی پتی خواب کھلے یادوں کی رجنی گندھا میں خوشبو کے مہتاب کھلے
گو اس دھوپ نگر میں بدلی کم ٹھہری کم کم برسی پھول مگر اس بغیا میں جب جب بھی کھلے کیا ب کھلے

سید صابر حسن رئیسؔ نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور برتا ہے۔ زندگی نے ان کے ساتھ خواہ کیسا ہی سلوک کیا ہو مگر انہوں نے زندگی کے ساتھ ہمیشہ اچھا ہی سلوک کیا ہے:

سرابوں کی قیمت مرے دل سے پوچھو، میں ایسے مقاموں سے گذرا ہوں اکثر
ادھر زندگی اپنا دامن چھڑالے، ادھر موت کی بے رخی مار ڈالے
ہے سر چشمۂ نشۂ جاودانی ،فریب ہوس ہے تو ہے زندگانی
جو خوابوں سے انسان دامن بچالے، حقیقت نما آگہی مار ڈالے

غنیمت ہیں جو اس دنیا میں ہم سے ہنس کے ملتے ہیں محبت کون کرتا ہے یہاں اہل محبت سے
رئیسؔ غم سے نہ گھبرا کہ ہر گلستاں میں خزاں کے بعد یقیناً بہار آئی ہے

اور پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:

کس کے لیل و نہار ہوتے ہیں دو فرشتے سوار ہوتے ہیں
مسکراہٹ کی چادریں اوڑھے حسرتوں کے مزار ہوتے ہیں

شاعر کی نظر آجکل کے ملکی اور سیاسی حالات پر بھی رہتی ہے:

کبھی شب کی سیہ چادر اچانک مت الٹ دینا ہزاروں چاند سورج گر پڑیں گے بام رفعت سے
دنیا زیر و زبر ہو گئی لوگ سمجھے سحر ہو گئی

فنکار وہ شخص ہے جو اپنے خون جگر سے زندگی میں رنگ بھرتا ہے لیکن افسوس کہ بیشتر فنکاروں کی اپنی زندگی رنگ وروغن سے محروم رہتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

آہ اس دور یتیمی میں کہاں وہ لاڈ پیار اس لیے فنکار بھی اب سخت جاں ہونے لگے

اس قسم کے اور بھی اشعار جا بجا مل جاتے ہیں۔

سید صابر حسن رئیسؔ کو اردو کے ساتھ ساتھ ہندی زبان پر بھی قدرت حاصل ہے۔ ان کے اشعار میں ہندی الفاظ کا استعمال اس فنکاری اور ہنرکاری کے ساتھ ہوا ہے کہ انہیں پڑھنے میں کہیں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ اشعار دیکھئے:

چاند گگن سے اتر کے میرے آنگن میں جب آتا ہے اپنے ساتھ مجھے بھی ظالم ساری رات جگاتا ہے

درشن، ترک، خدا کا ڈر اور اپنے پرائے ایک طرف من ہے بڑا ہی کٹّر پنتھی، بس اپنی ہی گاتا ہے
من کے سندر سپنوں کی جب چھلکی گاگر دیپ جلے کاغذ کی بستی میں چمکے میرے اکشر دیپ جلے
نینوں کے پٹ کھولے کب تک راہ تکے اک دکھیاری گھر میں گھوم گھورا ندھیارا، دوارے باہر دیپ جلے

اس مجموعے میں جا بجا ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جو ذہن و دل کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتے:

ساکنان شہر دل بستی کو جلتا دیکھتے ہیں خانہ ویرانی کا اپنی خود تماشا دیکھتے ہیں
لمحہ لمحہ اک لباس نو میں وہ رقاصۂ شب شام سے سو جانے والے بس سویرا دیکھتے ہیں
بچپن سہانا خواب مگر کتنا مختصر سورج تو آنکھ کھلتے ہی سر پر دکھائی دے
مژدۂ باد سحر پا کے ہی گل کھلتے ہیں تو نے اے دوست مجھے آج پکارا ہوگا
یوں بے نیاز ہو کے نہ پھولوں پہ ہاتھ ڈال کانٹوں کو بھی وجود کا اثبات چاہیے
یہ سلگتے ہوئے جذبے، یہ غزل کے الفاظ جیسے گلدان میں کانٹوں کو سجایا جائے
یوں مرا افسانۂ غم روز دہراتے ہیں پھول روز کھلتے ہیں چمن میں روز مرجھاتے ہیں پھول
برسوں کی مسافت سے تھکے ماندے مسافر گھر لوٹ کے آتے ہیں تو گھر ہی نہیں ملتا
کوئی سزا ہے کہ انداز دل ربائی ہے وہ خود تو آئے نہیں ان کی یاد آئی ہے
وہ لوگ جن کو بہت زعم پارسائی ہے مجھے بتائیں محبت میں کیا برائی ہے

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ سید صابر حسن رئیسؔ کا شعری مجموعہ ''پتی پتی خواب کھلے'' اردو ادب میں ایک اہم اضافہ ہے اور اس کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہونی چاہیے۔

☆☆☆

نام مجلّہ: ''تحقیق، ریسرچ جرنل، دربھنگہ
بیادگار: سید حکیم الطاف حسین دمریؒ و محمد فاروقؒ
زیر اہتمام: المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، دربھنگہ، بہار (الہند)
جلد: 1، شمارہ: ۱ر جنوری ۲۰۱۷ء تا مارچ ۲۰۱۷ء
مدیر اعزازی: ڈاکٹر احسان عالم
مدیر: ڈاکٹر منصور خوشتر
معاون مدیر: کامران غنی صبا، سلمان عبدالصمد
صفحات: ۸۸

مبصر اقبال حسن آزاد

''تحقیق'' ڈاکٹر منصور خوشتر کی ادارت میں شائع ہونے والا ایک نیا رسالہ ہے۔ موصوف کا نام محتاج تعارف نہیں۔ وہ دربھنگہ ٹائمز کے مدیر، عمدہ نثر نگار اور اچھے شاعر ہیں۔ اپنے اداریے ''چند باتیں'' میں کہتے ہیں:

''.....آج 'قسمت آزمائی' کے میدان میں تحریروں کی 'کیفیت' کے بجائے 'کمّیت' کی اہمیت مسلّم ہوتی جا رہی ہے اس لیے اب نہ ریسرچ اسکالرس، بلکہ قابل ذکر اسکالروں نے بھی 'کمّیت' کی بارگاہ میں سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ 'طولانی معیار پسند' رسالوں تک ریسرچ اسکالروں کی رسائی ناممکن ہوگی۔ کیونکہ ایک طرف معیاری تحریریں ہوتی ہیں تو دوسری طرف طولانی تعلقات۔ 'حق بہ حقدار رسید' کے تناظر میں معیاری تحریروں کی اشاعت کا جواز تو ہے تاہم 'طولانی تعلقات' پڑھنے لکھنے والے ریسرچ اسکالروں کے حق میں مزاحم بن جاتے ہیں۔ چنانچہ ''تحقیق'' ایسے ہی ریسرچ اسکالروں کی اشاعت کے لیے مختص ہوگا۔ تاکہ نہ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہوں اور نہ ہی قسمت آزمائی کے میدان میں ان کا قد بونا نظر آئے۔ البتہ پہلے شمارے میں ریسرچ اسکالروں کے علاوہ نامور مصنفین کے مضامین بھی شامل اشاعت ہیں تاہم تنظیمی طور پر آئندہ شماروں میں ریسرچ اسکالرز کی ہی شمولیت رہے گی۔''

درج بالا اقتباس سے اس مجلیکی اشاعت کی غرض و غایت پوری طرح منکشف ہو جاتی۔ یہ ایک قابل تحسین اقدام ہے اور اس کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے۔

زیر نظر شمارے میں اداریے کے علاوہ مشہور فکشن نگار بانو قدسیہ پر ایک مختصر سا گوشہ بھی شامل ہے۔ دیگر قلم کاروں میں پُرانے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ کئی نو مشق لکھاری بھی اپنے قلم کا جوہر دکھا رہے ہیں جن میں ڈاکٹر احسان عالم، ڈاکٹر عشرت ناہید، غلام نبی کمار، شاہ نواز فیاض، نوشاد منظر، ڈاکٹر ایم صلاح الدین، ڈاکٹر مستفیض احد عارفی، ڈاکٹر عین رشید، درخشاں اور محمد عارف حسن کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ چونکہ یہ سب کے سب بالکل نئے لکھنے والے ہیں لہذا ان کی تحریروں میں پختگی کی تلاش عبث ہوگی۔ لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اگر ان نونہالوں کو مواقع ملتے رہے تو جلد ہی ہماری زبان میں محققوں اور نقادوں کی ایک نئی پود سامنے آجائے گی اور یہ اردو کے حق میں بہت اچھا ہوگا کیونکہ پرانے پتّے آخر کب تک اپنی بہار دکھائیں گے۔ ایک نہ ایک دن انہیں شاخوں سے گرنا ہی ہے۔ یہاں پر میں نوجوانوں کو ایک مخلصانہ مشورہ دینا چاہوں گا۔ پرانے لکھنے والوں سے استفادہ ضرور کریں لیکن اپنے مطالعے اور علم میں بھی اضافہ کرتے رہیں۔ میں نے اکثر ایسے مضامین دیکھے ہیں جو دوسروں کا چربہ معلوم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر حال ہی میں اردو افسانہ نگاری پر ایک مضمون کسی رسالے میں شایع ہوا جس میں ایسے افسانہ نگاروں کو 'دور حاضر' کا افسانہ نگار بتایا گیا جنہوں نے گزشتہ بیس پچیس برسوں سے کچھ بھی نہیں لکھا ہے جبکہ بہت سے ایسے لوگوں کے نام غائب تھے جو مسلسل لکھ رہے ہیں۔ یقیناً اس تنقید نگار نے کسی دوسرے کے مضمون کو سامنے رکھ کر

اسے لکھا ہوگا۔ ادب کو اپنی نظر سے دیکھنا سیکھئے۔ کوئی ضروری نہیں کہ اگر ایک ادیب کسی ناقد کو پسند ہے تو وہ آپ کو بھی پسند ہو۔ تحقیق اور تنقید ادب میں نئی راہوں کی تلاش کا نام ہے لکیر کے فقیر بننے کا نہیں۔

بہر کیف! میں اس انقلابی قدم کے لیے ڈاکٹر منصور خوشتر کو مبارکباد دیتا ہوں اور ''تحقیق'' کی کامیابی کے لیے دل سے دعا گو ہوں۔

☆☆☆

نام رسالہ سہ ماہی: تفہیم کتابی سلسلہ ۱۱۔۱۰

سرپرست: جناب شمس الرحمٰن فاروقی

اعزازی مدیر: ڈاکٹر لیاقت جعفری

مدیر: عمر فرحت

صفحات: ۱۴۴

اس شمارے کی قیمت: درج نہیں

اس شمارے سے زر سالانہ: ۵۰۰ روپے (ہندوستان)

رابطہ: محمد عمر فرحت مقابل آئی ٹی آئی روڈ وارڈ نمبر۔۴ راجوری۔ جموں اور کشمیر (بھارت)

موبائل 08803139175، ای میل: omerfarhat519@gmail.com

فی زمانہ اردو رسائل تو کثرت سے نکل رہے ہیں لیکن چند ایک سرکاری سرپرستی میں شایع ہونے والے رسالوں کو چھوڑ کر باقی سب کے سب ناسازگار فضاء کے باعث یا تو جلد ہی بند ہو جاتے ہیں یا پھر ان کی اشاعت کا وقفہ بڑھنے لگتا ہے۔ جو رسالے ''سہ ماہی'' ہوتے ہیں وہ کبھی چھ ماہ پر، کبھی ایک سال بعد اور کبھی کبھی تو ڈیڑھ دو سال بعد شایع ہوتے ہیں۔ زیادہ تر اردو رسالے اس کمزور اور ناتواں بچے کی طرح ہوتے ہیں جو ہسپتال میں وینٹی لیٹر کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔ کب ان کا دم نکل جائے کہا نہیں جا سکتا۔ ایسی صورت حال میں اردو کا کوئی رسالہ دیر سویر سامنے آجاتا ہے تو یک گونہ خوشی محسوس ہوتی ہے۔ ''تفہیم'' کے تازہ شمارے کو دیکھ کر مجھے ایسی ہی خوشی محسوس ہوئی۔

اداریہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں آنجہانی بلراج کومل نے ''ادب کی تلاش'' کے عنوان سے چند سطریں تحریر کی ہیں اور دوسرے حصے میں عمر فرحت نے رسالے کے تعلق سے دو چار باتیں کہی ہیں۔

زیر نظر شمارے میں چند نہایت اہم اور قیمتی مضامین شامل ہیں مثلاً 'شوخی و بذلہ سنجی و آوارگی (گوپی چند نارنگ)، ساختیات کا بنیاد گزار (عتیق اللہ)، اردو کی جدید نظم میں 'غیر' کا تصور (ابوالکلام قاسمی)، اردو افسانے کا مابعد الطبیعاتی آہنگ (محمد حمید شاہد)، عتیق اللہ: شعری سفر کی ثقافتی جہتیں (انتخاب حمید خاں)، معاصر نظم، نئی نو آبادیات

اور روایت کی بازیافت (ناصر عباس نیّر)، 1857ء: تناظرات، مسائل اور اردو ناول (صلاح الدین درویش)۔

اس کے علاوہ قاضی افضال حسین کا انٹرویو (عمر فرحت) بھی خاصے کی چیز ہے۔

باب سخن میں ظفر اقبال، احمد مشتاق، عتیق اللہ، رفیق راز، جینت پرمار، عرفان ستار، ضیاالمصطفیٰ ترک، لیاقت جعفری، اظہر اقبال کی غزلیں اور نصیر احمد ناصر، خلیل مامون، اقتدار جاوید، جینت پرمار، سلیم فگار، عادل رضا منصوری اور امتیاز نسیم کی نظمیں شامل ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ دو نئے نام بھی ہمارے سامنے آتے ہیں......مہندر کمار ثانی اور سید طیفور احمد۔

انتخاب کے تحت علی اکبر ناطق کا تعارف (عمر فرحت)، علی اکبر ناطق کی چار نظمیں اور ان کا ایک منتخب افسانہ ’’چونا کا گڑھا‘‘ شامل اشاعت ہیں۔ اس شمارے میں جناب ہمدم کاشمیری کے شعری مجموعے ’’ورق سادہ‘‘ پر فضیل جعفری کا تحریر کردہ تبصرہ بھی موجود ہے۔

آخر میں چند بزرگوں مثلاً نیّر مسعود، ظفر اقبال، انتظار حسین (مرحوم)، فضیل جعفری، نصیر احمد ناصر، مرزا حامد بیگ، کرشن کمار طور، محمد حمید شاہد اور ہمدم کاشمیری کے خطوط پیش کیے گئے ہیں۔

بلاشبہ اس شمارے کی ترتیب میں کافی محنت صرف کی گئی ہے۔ امید کی جانی چاہیئے کہ شعر و ادب کا یہ دریا یوں ہی جاری رہے اور تشنگان ادب کی سیرابی ہوتی رہے۔

☆☆☆

نام کتاب: بہار میں اردو صحافت......سمت و رفتار

مرتب: ڈاکٹر منصور خوشتر

سنہ اشاعت: ۲۰۱۶

صفحات: ۳۲۰

قیمت: دو سو روپے، لائبریری ایڈیشن: تین سو روپے

زیر اہتمام: المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، سبھاش چوک، دربھنگہ

ای میل: mansoorkhushter@gmail.com

Mobile: 09234772764,9472059441

مبصر: اقبال حسن آزاد، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر۔۸۱۱۲۰۱ Mobile:9430667003

صحافت یعنی اخبار نویسی انسانی سماج کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس کے بغیر ہم کسی ترقی یافتہ اور مہذب دنیا کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پہلے یہ صرف پڑھے لکھے لوگوں تک محدود تھی لیکن ریڈیو اور ٹیلی ویژن

کی ایجاد نے اسے گھر گھر پہنچا دیا ہے۔ آج مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا جوان یا پھر بوڑھا، خواندہ ہو یا ناخواندہ، ہر شخص باخبر رہتا ہے اور یہ صحافت ہی کی دین ہے۔

صحافی کا قلم خنجر کی نوک سے بھی زیادہ تیز ہوتا ہے۔ بقول اکبر الہٰ آبادی:

بندوق نکالو نہ ہی تلوار نکالو
انگریز مقابل ہو تو اخبار نکالو

صحافی وہ ہے جو ملکوں اور قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرتا ہے، سرکاریں بناتا اور گراتا ہے لیکن صحافت کرنا اور تنی ہوئی رسّی پر چلنا ایک جیسا ہے۔ اگر ذرا سا بھی توازن بگڑا تو صحافی اپنے منصب اور سماج کی نظروں میں گر جاتا ہے۔

ڈاکٹر منصور خوشتر ایک نڈر اور بیباک صحافی ہیں اور میدان صحافت کے پرانے اور مشاق شہسوار ہیں۔ ان کا سہ ماہی رسالہ ’’دربھنگہ ٹائمز‘‘ اب کسی تعارف کا محتاج نہیں رہا۔ ابھی حال ہی میں انہوں نے ایک خالص تحقیقی و تنقیدی رسالے ’’تحقیق‘‘ کا بھی اجرا کیا ہے اور اس کے پہلے ہی شمارے نے ادبی حلقوں میں اپنی گہری چھاپ چھوڑی ہے۔ ’’بہار میں اردو صحافت......سمت اور رفتار‘‘ ان کی تازہ ترین کاوش ہے جس میں ’’عرض مرتب‘‘ کے علاوہ کُل اٹھائیس گرانقدر مضامین ہیں۔ (۱) بہار میں اردو صحافت (مشتاق احمد نوری)، (۲) اردو اخبارات اور قومی یکجہتی (ڈاکٹر عبدالحنان سبحانی)، (۳) بہار میں اردو صحافت: سمت و رفتار (ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی)، (۴) بہار کی اردو صحافت: آزادی کے بعد (ڈاکٹر سید احمد قادری)، (۵) صحافت، صارفیت اور صیہونیت (حقانی القاسمی)، (۶) بہار میں اردو صحافت (صفدر امام قادری)، (۷) بہار میں اردو صحافت: آزادی کے بعد (انور الحسن وسطوی)، (۸) سول معاشرہ: اردو میڈیا کا کردار اور ذمہ دار کون؟ (ڈاکٹر ریحان غنی)، (۹) بہار میں اردو صحافت کے خدوخال (ڈاکٹر شمیم قاسمی)، (۱۰) بہار میں اردو صحافت: مسائل اور امکانات (ڈاکٹر قیام نیّر)، (۱۱) ادبی صحافت کے اغراض و مقاصد (عطا عابدی)، (۱۲) بہار میں اردو صحافت: ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک (ڈاکٹر اقبال حسن آزاد)، (۱۳) اردو میڈیا: اعتبار و معیار (شکیل احمد سلفی)، (۱۴) بہار میں اردو صحافت کا عصری منظر نامہ (شاہد الاسلام)، (۱۵) دربھنگہ ٹائمز کی خدمات (ڈاکٹر مجیر احمد آزاد)، (۱۶) بہار میں جرائد نسواں: صحافت کا ایک گمشدہ باب، (جمیل اختر)، (۱۷) بہار کی موجودہ اردو صحافت (عبدالمتین قاسمی)، (۱۸) بہار میں اردو صحافت: آغاز و ارتقا (ڈاکٹر احسان عالم)، (۱۹) متھلا کے پانچ رسائل: ایک جائزہ (سلمان عبدالصمد)، (۲۰) جدید ادب کے روشن مستقبل کا استعارہ: دربھنگہ ٹائمز (ڈاکٹر آصف)، (۲۱) اردو اخبارات کو درپیش مسائل (محمد عبدالرحمٰن ارشد)، (۲۲) کلام حیدری کی اداریہ نگاری (سمی اقبال) (۲۳) بہار میں اردو صحافت: منظر، پس منظر (صفی اختر) (۲۴) اردو صحافت کی اخبار نویسی میں بہار کا حصہ (نور السلام ندوی) (۲۵) بہار میں اردو صحافت: مسائل، حل اور امکانات (کامران غنی)، (۲۶) بہار کے اردو اخبارات کا رول (فردوس علی)، (۲۷) بہار میں اردو صحافت: سمت و رفتار (شمس تبریز قاسمی)، (۲۸) بہار کی اردو

صحافت کی زبان کا معیار (محمد فہام الدین)۔

درج بالا فہرست کے علاوہ فاروق ارگلی، سہیل انجم اور پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کے گرانمایہ خیالات بھی فلیپ میں شامل ہیں جو اس کتاب کی اہمیت، افادیت اور وقعت میں اضافہ کر رہے ہیں۔

گو کہ یہ سارے مضامین عمدہ ہیں اور موضوع کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے نظر آتے ہیں لیکن مجھے خاص طور پر حقانی القاسمی، صفدر امام قادری، ڈاکٹر ریحان غنی، شاہد الاسلام، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، سلمان عبدالصمد، کامران غنی اور محمد فہام الدین کے مضامین پسند آئے۔ ڈاکٹر منصور خوشتر نے بھی بطور مرتب اپنی بات سلیقے سے کہی ہے لیکن یہاں پر میں ایک بات کہنے سے خود کو روک نہیں پا رہا ہوں۔ کسی بھی مرتب شدہ کتاب میں ''عرض مرتب'' پہلے نمبر پر ہوتا ہے لیکن اس کتاب میں مشتاق احمد نوری کا مضمون یا مضمون نما مقدمہ پہلے نمبر پر دیا گیا ہے جو اس کتاب کے حسن کو گہنا رہا ہے۔

یہ کتاب ریسرچ اسکالرز کے لئے ایک قیمتی تحفہ ہے اور یونیورسیٹی کے ہر طالب علم کے لئے اس کا مطالعہ لازمی ہے۔

☆☆☆

نام کتاب: شہنشاہ کونینؐ کے دربار میں

مصنف: حضرت مولانا سید محمد ولی صاحب رحمانی دامت برکاتہم

صفحات: 16

شائع کردہ: دارالاشاعت خانقاہ مونگیر

اشاعت اول: اگست 1994ء

مبصر: فضل رحمٰن رحمانی ایشین اسکول آف میڈیا اسٹڈیز، نوئیڈا موبائل نمبر 9971224394

شہنشاہ کونین محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''تم میں سے کوئی اسوقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اسکے نزدیک اسکے والدین بیٹے اور تمام لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔''

ابھی مفکر اسلام حضرت مولانا سید محمد ولی صاحب رحمانی دامت برکاتہم سجادہ نشیں خانقاہ رحمانی مونگیر امیر شریعت بہار، اڑیسہ، جھارکھنڈ و جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تصنیف کردہ کتاب شہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں نئی صورت و شکل کے ساتھ میرے سامنے ہے، یوں تو یہ کتاب اپنی مقبولیت کی وجہ سے بار بار چھپ چکی ہے اور میں پڑھ بھی چکا ہوں لیکن اس کتاب کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والا تھکتا نہیں ہے بلکہ ہر بار پڑھنے سے ایک نئی لذت محسوس کرتا ہے۔ ٹائٹل کے اعتبار سے بھی یہ کتاب

بہت خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ یوں تو حضرت مدظلہ کو اللہ تعالیٰ نے اوصاف حمیدہ کا مجموعہ بنایا ہے۔ جسمیں اللہ تعالیٰ نے آپکو تصنیف و تالیف کا عمدہ ذوق اور بہت سے کمالات سے نوازا ہے لیکن انکی انشاء پردازی ایک منفرد مقام رکھتی ہے عام فہم اور سہل انداز میں اپنی بات کہنے کا ملکہ مولانا موصوف کو اعلیٰ پیمانہ پر حاصل ہے۔ مصروفیتوں اور مناصب کے بوجھ کی وجہ سے آپ کی تصانیف و تالیفات تو کم ہیں لیکن بہت جامع اور پرمغز خشک سے خشک تر جملوں کو رنگین، دلفریب اور دلچسپ بنانے کا شاعرانہ انداز انکی تحریری خوبیوں میں سے ایک اہم خوبی ہے۔

یوں تو سیرت پر لامحدود کتابیں، مضامین اور رسالے منظر عام پر آچکے ہیں اور آتے رہتے ہیں لیکن آپ کی تصنیف ''شہنشاہ کونین کے دربار میں'' پڑھنے پر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے خانہ کعبہ اور روضۂ اقدسؐ کے تمام مناظر سامنے ہو گئے ہوں۔ کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے کعبۃ اللہ کے پردہ کو تھام کر اللہ سے لو لگانے کا احساس دل کو تڑپا رہا ہو احساس ندامت سے حجر اسود کو چھونے اور چومنے کی تڑپ تڑپاتی چلی جا رہی ہو۔ میزاب رحمت کی دعا اور ملتزم سے چمٹنا خانہ کعبہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی میدان عرفات کی گریہ وزاری اور مزدلفہ کا قیام لیل ان تمام کیفیتوں کے احساس و جذبات اس تحریر میں نہ ملیں تو کہئے۔

حضرت مدظلہ خود فرماتے ہیں کہ یہ میری مختصر سی تحریر ہے جسمیں احساسات کو زبان دی گئی ہے اور صحیح معنوں میں کتاب کے پڑھنے پر اسکا ایک ایک لفظ حضرت کے اس جملے کی گواہی دیتا چلا جاتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ پڑھتے جائیں۔

قارئین کی دلچسپی کیلئے کتاب کے چند سطور پیش کر رہا ہوں۔ جو انہیں کی زبان مبارک اور انہیں کی نوک قلم سے نکلا ہوا ہے۔

''ذرا سوچئے! کعبۃ اللہ کے پردہ کو تھام کر رونے گڑگڑانے والا انسان، اپنے ایک ایک گناہ کو یاد کر کے آنسو بہانے والا انسان، گناہوں کو جذب کرانے کے جذبہ سے مغلوب حجر اسود کو چھونے اور چومنے والا انسان، احساس ندامت اور بیخودی کی ملی جلی کیفیت میں طواف کرنے والا انسان، میزاب رحمت کے نیچے اللہ کی رحمت سے آس لگانے والا انسان، جب اپنی خودی کو خود فراموشی سے بدل کر شہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دیار کی طرف بڑھتا ہے تو کبھی سوچتا ہے کہ ؎

پاک دل پاک نفس پاک نظر کیا کہنا
بعد مکہ کے مدینہ کا سفر کیا کہنا

اب مدینے کا سفر شروع ہو رہا ہے۔ کیا کرنا ہے دل کی کیفیت کیا ہے اور دربارِ رسالت میں کیسے حاضری ہوگی بذات خود حضرت مصنف مدظلہٗ کی زبانی سنئے اور دل میں اتارئے۔

"کچھ آبادی جو شروع ہوئی تو ایسا لگا کہ وہ منزل آ گئی، جسے دل ڈھونڈ رہا تھا، ذوق بھی، شوق بھی، طلب بھی، تڑپ بھی، زبان پر درود شریف اور نگاہوں میں شہر جمال، مدینہ کی آبادی، عمارتیں، ایسا لگتا تھا جیسے سارا جسم نگاہ بن چکا ہے اور اس نگاہ کو گنبد خضراء کا انتظار ہے، اچانک دور سے عمارتوں کا سلسلہ جو ذرا ٹوٹا تو ہرے گنبد پر نگاہ جم گئی **اللھم صل علی سیدنا وشفیعنا ومولانا محمد** زبان سے جاری اور آنکھوں سے اشک رواں، گاڑی رکی تو حالت یہ تھی کہ۔

اور جو ہوش کی پوچھو تو مجھے ہوش نہیں

چند ثانئے خاموش بے حس و حرکت سیٹ پر رہا، اچانک جیسے خواب کی دنیا سے کوئی حقیقت کی دنیا میں آ گیا ہو، دروازہ کھول کر جو اترنا چاہا تو قدم ذرا دیر کے لئے جم سے گئے، کیسے اتریں یہ گنہگار پاؤں اس پاک سرزمین پر، کہیں یہی وہ جگہ تو نہیں جہاں چودہ سو سال پہلے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک قدم پڑے ہوں، شاید اسی احساس کی شدت تھی اور بڑی تیز شدت، کہ عاشق رسول پاک حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ننگے پاؤں مدینہ طیبہ کی گلیوں، بازاروں سے گذرتے رہے، کبھی جوتا نہیں پہنا۔

رہ رہ کر خیال آتا، کیا یہ قدم اس پاک سرزمین سے لگنے کے لائق ہے؟ دل سے آواز آئی، جب تک ندامت کے آنسو قدموں کو نہ دھوڑالیں، یہ قدم اس پاک سرزمین پر رکھنے کے قابل نہیں، دل کی آواز پر ایسے نازک مرحلہ میں کون لبیک نہیں کہتا، آنکھوں نے دل کا ساتھ دیا اور جب اشک ندامت نے گناہوں کے بوجھ کو ذرا ہلکا کیا تو قدم آگے بڑھے۔ آرزوؤں کے در سے دربار نبویؐ میں حاضری ہوئی، دو رکعت نماز پڑھی، سورج نصف النہار پر نہیں پہنچا تھا، اللہ کو یاد کرنے والے ابھی دو گھڑی کے لئے آرام کر رہے تھے، ایک گنہگار امتی آقا کے دربار میں سلام پیش کرنے کے لئے بڑھ رہا تھا، عجیب کیفیت تھی دل کی، کبھی درود، کبھی نعت کا کوئی مصرع اور کبھی **الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ**، شوق، قدم کو تیز بڑھاتا، احترام، قدم کو تھام لیتا، "ریاض الجنۃ" میں جگہ خالی تھی، جی چاہا دو رکعت پڑھ لی جائے پھر حاضر ہو کر سلام پیش کیا جائے گا، دل نے کہا کہ پہلے سلام پیش کیا جانا چاہئے، ایک سلام قبول ہو گیا تو حاضری مقبول، ایک سلام بھا گیا تو کون سا مرحلہ پھر رہ جاتا ہے۔

آقا! گنہگار سلام پیش کرتا ہے۔

آقا! میرے آقا! آنکھوں کے موتی قدموں پر نچھاور کر کے تیرے در پر آیا ہوں۔ اشکوں نے سارے وجود میں جو آگ لگائی ہے اسے تیری رحمۃ للعالمینی ہی ٹھنڈا کر سکتی ہے۔

آقا! خطا کار ہوں، سیہ کار ہوں، مگر ہوں تیری امت کا ایک حقیر فرد، سلام قبول ہو۔

آقا! بڑا گنہگار ہوں، مگر ہوں تیرے در کا ذرہ، اس ذرہ کو زندگی کی رمق ہیرے کی چمک کون

دے گا میرے آقا!

عربی صلاۃ و سلام کے بہت سے حصے یاد تھے، کچھ یاد رہے کچھ بھول گیا، عربی کے ساتھ اردو کے اشعار بھی پڑھے۔

سلام اے فخر موجودات فخر نوع انسانی

اور

سلام اے ظل رحمانی، سلام اے نور یزدانی"

ان جملوں پر غور کیجئے تو حضرت کی باتوں سے بات پیدا کرنے کا کیا نرالہ انداز ہے پوری کتاب میں جملوں کی سیٹنگ (Setting) پھر اس جملے کی حلاوت، اس کی مٹھاس، اس کی شیرینی اور کہیں کہیں اشعار کے الفاظ کو نثر کا جامہ پہنا کر اس میں نمکینیت پیدا کرنا۔ پڑھتے جایئے اور سبحان اللہ کہتے جایئے! سبحان اللہ

کتاب مقدس کے اخیر میں ایک عاشق رسول کا واقعہ انوکھے انداز میں لکھا ہوا ہے۔ جس میں زبان کی حلاوت بھی ہے، عشق رسول کی ترجمانی بھی ہے۔ یہ واقعہ بھی برکت کے لئے انہیں کی زبان میں پڑھیئے اور تمام مسلمان بالخصوص تمام حجاج کرام کو "شہنشاہ کونین" کے پڑھنے کی تلقین کیجئے۔

"ابھی مغرب کی نماز میں چند منٹ کی دیر تھی، اللہ کے بندے مسجد نبوی کی طرف جوق در جوق بڑھ رہے تھے، میں بھی ایک بڑے دروازہ سے مسجد میں داخل ہو گیا، چند قدم آگے بڑھا تو سامنے دوری اور بلندی پر گنبد خضراء نظر آ رہا تھا، میں رک گیا، ایک نوجوان سادہ سے کپڑے میں وہاں کھڑا تھا، بڑے انہماک، بڑی عقیدت و محبت کے ساتھ اس کی نگاہ گنبد کی بلندیوں پر تھی اور دل میں حب نبوی کا سرمایہ تھا، اس کی آنکھوں سے آنسو بے تابانہ نکلے چلے جا رہے تھے، میں اس نوجوان کے پیچھے کھڑا ہو گیا، تا کہ آنے والی بھیڑ کے دھکوں سے وہ محفوظ رہے، اس کی یکسوئی میں خلل نہ آ جائے، وہ گرد و پیش سے بالکل بے نیاز سراپا عجز و نیاز زیر لب کچھ گنگنا بھی رہا تھا، اس کی کیفیت نے دل پر گہرا اثر ڈالا، ایسا لگا جیسے قدم بندھ گئے ہوں، یہ بندش اس ارادت و عقیدت کی تھی، جس کے گھیرے میں کروڑوں انسان ہیں اور جس کا سرا گنبد والے آقا تک جا پہونچا ہے۔ کیفیت گہری ہوتی گئی۔ کتنا بڑا دربار ہے یہ، کیسی بلندیاں ہیں اس کی، کتنی عظمت و شفقت ہے اس میں، الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ الصلوٰۃ والسلام علیک یا خیر خلق اللہ، ادھر کتنی عظمتیں ہیں، ادھر کتنی پستیاں ہیں، ایک طرف روشن آفتاب، دوسری طرف ذرہ بے نور، پھر بھی نسبتوں نے ذروں کو چمک دمک اور زندگی کی رمق بخش دی ہے ——— ذرا کان لگایا تو بڑی دلگیر آواز میں بڑے ادب و احترام کے ساتھ وہ نوجوان ہدیہ عقیدت پیش کر رہا تھا، اس کے الفاظ دل میں اترتے جا رہے تھے، اس کی آواز ہر نقش ماسوا سے مجھے بے پروا کر رہی تھی۔

تیری معراج کہ تو لوح و قلم تک پہونچا میری معراج کہ میں تیرے قدم تک پہونچا

زیرِ مطالعہ کتاب کے تناظر میں قارئین کرام سے یہ کہنا چاہوں گا کہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں سے کرائیں بلکہ حجاج کرام اپنے ساتھ رکھیں تو بڑا فائدہ ہوگا۔ کیوں کہ یہ کتاب مرد مومن کے اندر خانہ کعبہ کی عبادت اور جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شوق پیدا کرتی ہے بلکہ ہر مسلمان زبانِ حال سے یہ کہتا رہتا ہے ؎

اے بادِ صبا پیغام مرا طیبہ کے دھنی سے کہہ دینا میں چپکے چپکے روتا ہوں جب لوگ مدینہ جاتے ہیں

☆☆☆

نام کتاب: آبشارِ نوا (غزلیاتِ شفیع)
شاعر: محمد شفیع الرحمان شفیع، پٹنہ
مرتب: ڈاکٹر عبدالرافع، جے. این. یو، نئی دہلی
صفحات: ۵۹۲ ؛ قیمت: -/Rs.600
طابع وناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
سالِ اشاعت ۲۰۱۵ء

تبصرہ نگار: ڈاکٹر مسعود عالم، پٹنہ

محمد شفیع الرحمٰن شفیع میرے قریبی ہم درس دوستوں میں ہیں۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے مستعفی ہوکر محمڈن اینگلو عربک سینیئر سکنڈری اسکول آگئے تو رہائش کے اعتبار سے بھی قریب ہوگئے۔ اب وہ سبکدوشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

ان کی علمی لیاقت کا میں قائل ہوں اور شہر کے دانش وروں اور علما میں ان کی شخصیت معروف ہے۔ کئی درسی کتابوں کے مرتب ومصنف ہیں۔ ان کی حمد خمس لسانیہ، نعت خمس لسانیہ (اس مجموعہ میں نہیں) اور اس مجموعہ میں شامل غزل پنچلری (پانچ زبانوں میں) سے پانچ زبانوں پر ان کے عبور سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ قربت کی وجہ سے ان کے بارے میں میں مزید لکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔

آبشارِ نوا صرف غزلوں کا دیوان ہے جس میں مولانا رومیؔ، شیخ سعدیؔ، حافظؔ اور امیر خسروؔ کی فارسی غزلوں کے ساتھ اردو غزلوں میں مفہوم بھی شفیع صاحب کے کمال کی شہادت ہے۔ ان شاء اللہ، معاذ اللہ، استغفر اللہ، جزاک اللہ جیسی ردیفوں اور نادر قوافی کا استعمال بھی قدرتِ کلام کے ثبوت ہیں۔

میں کچھ اشعار پیش کرنا بہتر سمجھتا ہوں تاکہ قارئین خود ان کے مقام کا فیصلہ کر سکیں۔

غزل ہے گنگا جل پیارے غزل ہے آبِ زمزم بھی غزل سورج کی کرنیں بھی، غزل گوہر بہ شبنم بھی
غزل آنکھوں کا کاجل بھی، غزل ہونٹوں کی سرخی بھی غزل رخسار پر غازہ، غزل ہے زلفِ برہم بھی
غزل جشنِ بہاراں ہے، غزل شامِ غریباں ہے غزل عیدین کی خوشیاں، غزل نوحہ ہے، ماتم بھی

حرف سے حرف مل کر بنا لفظ جب، لفظ سے لفظ مل کر ندا بن گیا
وزن آواز نے شعر کی شکل دی، شعر سے شعر مل کر نوا بن گیا

لفظاب تلخ تر تو ہوتے شفیع اپنے شربت مگر ہے شیریں اپنی سخنوری کا
گلاب الفاظ ہو جائیں تو خوش بو ہو معانی میں معطر بزمِ یاراں ہر طرف ہو زندگانی میں
خوش بو ہے لفظ لفظ میں میرے بسی شفیع اشعار پھول پھول ہیں دل کے دیار میں
شاعری فرشِ سلیماں ، پائینچہ بھاری نہ کر آتے آتے آہی جائے پختہ کاری ایک دن
دامن پہ مرے داغ نہیں ، چھینٹے ہیں خوں کے بسمل تھے کئی مرغِ سحر صحنِ چمن میں
مجھ سے دشمنی ، کیچ ، غیبت و حسد ، نفرت یادآپ رکھتے ہیں، اس لیے تو پیارے ہیں
پرواز تری عرشِ بریں تک ہے جب شفیع کیوں زندگی کو دیکھ رہا ہے حباب میں
ہے اسی میں حسن جسے بقا، ہے جسے فنا، اسے بھول جا اسی ذوالجلال سے لو لگا، جو ہو بے وفا، اسے بھول جا
لگاتا آگ پانی میں ہے جادوگر ، معاذ اللہ! یہ واعظ شہر کو کر دے گا خاکستر، معاذ اللہ!
یہ پل پل خرافات ، استغفر اللہ! کرو کام کی بات، استغفر اللہ!
ہوگی ،ہوگی، ہوگی بارش ، ان شاء اللہ! پوری ہوگی دل کی خواہش ، ان شاء اللہ!
یہ مٹی کیا؟ ہوا کیا ہے؟ فضا کیا ہے، خلا کیا ہے؟ مشاہد ان کے جو ہوتے سمجھ لیتے خدا کیا ہے
یہ کشش، یہ حسن، یہ رنگ وبو، ابھی تازہ تازہ گلاب ہے ہے بہار اس پہ ابھی فد، ابھی عزو شانِ شباب ہے
سلوک کی اساس ، ہر قدم پہ انضباط ہے انا سے واسطہ پڑے تو سرف انحطاط ہے
وفا عشق میں غیر مشروط ہے جفا سے ریاضت یہ مربوط ہے

◂◂ ● ▸▸

''ثالث'' پر تبصرے

● سلمان عبدالصمد

''ثالث'' کا ثانی!

ادبی رسائل نکالنا اور پھر نکالتے رہنا، کل بھی مشکل تھا اور آج بھی ہے۔ حالات گواہ ہیں کہ جذباتی سطح پر بہت سے رسالے نکلے اور چند دنوں میں ہی ادبی منظرنامہ سے غائب ہوگئے۔ کبھی طباعت واشاعت کے مشکل مرحلے میں مدیروں کے لیے جمے رہنا مشکل ہوگیا تو کبھی انتخابِ مواد کی نازک راہوں میں تعلقات کی سخت گیری نے معیار کا دم نکال دیا، یا پھر کچھ ایسے رسائل بھی منصۂ شہود پر آئے، جن کے صفحات پر معیار کی صلواتیں اس کثرت سے پڑھی گئیں کہ قارئین اس سے ٹوٹتے گئے اور اہل ادب دور ہوتے گئے۔ اس لیے رسائل نکالنا اور اعتدال سے رشتہ کی استواری کے ساتھ آگے بڑھنا محال نہ سہی، مشکل ترین کام ضرور ہے۔ گویا اس طرح دیکھیں تو ایک رسالہ کو متعدد سخت مرحلوں سے گزرنا ہوتا ہے، اس کے بعد ہی رسالوں کی بھیڑ میں اسے انفرادیت نصیب ہوتی ہے اور اس کا ادبی سفر تادیر قائم رہتا ہے اور اردو اخبارات ورسائل کی طباعت واشاعت کے لیے سرمایہ کا معاملہ بیش تر دور میں پریشان کن رہا ہے اور فی زمانہ تو جہاں ایک طرف سرمایہ کی قلت کا معاملہ درپیش ہے تو وہیں قارئین پیدا کرنے کا مسئلہ بھی توجہ طلب ہے۔ چنانچہ توسیع پسند نظریہ سے دیکھنے کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ آج اردو اخبارات خصوصاً اردو رسائل وجرائد کا مستقل نکالنا پہلے سے کہیں زیادہ آج مشکل ہوگیا ہے۔

مذکورہ تمہیدی جملوں کی روشنی میں پیش نظر 'کتابی سلسلہ، ثالث' کا جائزہ لینے سے ایک امید افزا فضا قائم ہوتی ہے کیوں کہ اس میں تسلسل کا رنگ وآہنگ ہے، معیار ومواد کا سنگم بھی اور ادارت کی مہارت بھی۔ اسی طرح اس کے بیش تر اداریوں میں فکر کی جولانی، حالات سے باخبری اور غیر ضروری طوالت سے گریز بدرجہ اتم موجود ہے۔ ظاہر ہے ان نفرادی رویوں کے ساتھ اگر 'ثالث' کا سفر اور دراز ہوا تو ادبی دنیا میں اس کا 'ثانی' بہ مشکل تمام ہی ملے گا۔ آج بھی دنیا بھر سے نکلنے والے بے شمار رسالوں سے اس کا معیار بہتر ہے۔ یہاں پر فقط چند رسالوں کی ادارتی تحریروں پر سرسری نظر ڈالی جاتی ہے۔ بہار اردو اکادمی پٹنہ سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''زبان وادب'' کا ''حرف آغاز'' نامی اداریہ 'انفارمیٹو' بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں زبان وادب کے مسائل کے ساتھ اکادمی کی سرگرمیوں کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں یا پھر رسالہ میں کسی شخصیت کا گوشہ ہو تو اداریہ میں بھی اس کا اثر نظر آتا ہے۔ پٹنہ سے شائع ہونے والے ''آمد'' میں مفکرانہ اسلوب کے ساتھ فکری بکھراؤ کا احساس ہوتا ہے۔ دربھنگہ سے شائع ہونے والے ''جہان اردو'' کے

''جہانِ فکر'' نامی اداریے اسم بامسمّٰی ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اس میں تفکراتِ ادب سے زیادہ احوالِ جہاں یعنی سیاسی وسماجی اور لسانی موضوعات کو پیش کیا جاتا ہے۔ اسی سرزمین سے نکلنے والے ''تمثیل نو'' کی بات کریں تو اندازہ ہوگا کہ یہ کوئی ماہنامہ یا سہ ماہی نہیں بلکہ ایک 'سالنامہ' ہے۔ اس کا اداریہ انتہائی طویل ہوتا ہے، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ رسالہ تو سال بھر میں ایک مرتبہ شائع ہوتا ہے، مگر مدیر ہر ماہ اداریہ لکھتے ہیں، اس لیے پورے سال کا ادبی منظرنامہ (وفیات، ادبی سرگرمیاں وغیرہ) اداریہ میں موجود ہوتا ہے، حالانکہ مکمل ادبی صورتحال پیش کرنے کے لیے اداریہ کے علاوہ مختلف کالمس رسالہ کے آخر میں رکھنا چاہئے۔ رہی بات 'دربھنگہ ٹائمز' کے اداریہ ''کہنے کی بات'' کی تو اس میں فکری تنوع کے ساتھ بکھراؤ نظر آتا ہے۔ چوں کہ مدیر محترم اداریہ میں ہی اپنے مشمولات اور فاضل مضمون نگاروں کا 'ذکر خیر' کرتے ہیں، اس لیے اداریہ کبھی اپنے رسالہ کا تبصرہ بھی بن جاتا ہے۔ اگر بات ہو رسالہ 'صدف' کے چند شماروں کے اداریے 'عرض داشت' کی تو یہاں یک موضوعی پن کا احساس ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اداریہ مکمل طور پر بکھراؤ سے پاک نہیں ہوسکتا، تاہم یک موضوعی بنانے کی ہر ممکن کوشش ہونی چاہیے، تاکہ فکری تنوع اور ادبی مباحثہ کا کوئی گوشہ نکلے۔ رسالہ 'صدف' سے آئندہ یہ امید کی جاسکتی ہے۔ اس رسالہ میں مدیر انتظامی شہاب الدین 'گزارش' کے تحت جن عزائم ومقاصد کا ذکر کرتے ہیں، اسے مدیر چاہتے تو اداریہ کا حصہ بنا سکتے ہیں، لیکن اس سے اجتناب اداریہ کو حددرجہ بکھراؤ سے بچا رہا ہے، جو کہ مستحسن ہے۔ جہاں تک 'ثالث' کا تعلق ہے تو اس میں کم لفظوں کے سہارے جہاں بحث ومباحثہ کے لیے راہ ہوتی ہوئی نظر آتی ہے، وہیں فکری تنوّع احساس ہوتا ہے۔ فکشن نمبر میں دوصفحہ پر مشتمل اداریہ کی اولین سطریں:

''.....مرزا غالب کے اس قول سے جزوی طور پر اتفاق کیا جاسکتا ہے۔ داستان بے شک منجملہ فنون سخن ہے لیکن یہ صرف دل بہلانے کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ زندگی کا آئینہ ہے۔ ایک ایسا آئینہ جس میں ہمیں نہ صرف ایک عہد کی جیتی جاگتی تصویریں دکھائی دیتی ہیں، بلکہ انسانی نفسیات، احساسات اور جذبات کے جیتے جاگتے مرقعے بھی دکھائی دیتے ہیں''

ڈاکٹر اقبال حسن آزاد چاہتے تو اس فکشن نمبر کے اداریہ کو طول دے سکتے تھے۔ قابل ذکر لکھنے والوں کے مضامین کا تجزیہ کرسکتے تھے۔ دیگر معلومات بہم پہنچا سکتے تھے لیکن انھوں نے انتہائی کم لفظوں میں اداریہ لکھا اور ایسا لکھا کہ بحث ومباحثہ کی راہ بھی ہموار ہوسکتی ہے۔ داستان طرازی کے ضمن میں مرزا غالب کے قول سے مدیر کا معمولی تعرّض زمانہ کے پیچ وخم کے تناظر میں بحث کا موضوع پیش کرتا ہے۔ الغرض فکری تنوّع اور جدت طرازی سے بکھراؤ کے باوجود اداریہ میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ اداریہ نہ اتنا مختصر ہو کہ کوئی مقولہ بن جائے اور نہ اس قدر پیچیدہ اور موضوعات میں تنوع ہو کہ ملاوجہی کی ''سب رس'' ہوجائے۔

''ثالث'' کے فکشن نمبر سے ہی اوپر مثال دی گئی ہے، اس لیے ہم ذیل میں بھی اسی نمبر کے مشمولات پر اپنی نظر مرتکز رکھیں گے، مبادا یہ چند سطری تبصرہ کوئی تقابلی مضمون بن کر طوالت کا متقاضی نہ ہوجائے۔ اس نمبر میں محمد شفیع الرحمٰن شفیع کی حمد اور شمسی قریشی کی نعت کے علاوہ حسین الحق، محمد حامد سراج، نعیم بیگ، شاہین کاظمی،

طلعت زہرہ، فرحین جمال، ثمینہ سید، ڈاکٹر افشاں ملک، نسترن احسن فتیحی، رومی ملک، سلیم سرفراز، مہ جبیں آصف، صفدر امام قادری، امین صدرالدین بھایانی، ڈاکٹر شاہد جمیل، فارحہ ارشد، ہما فلک، جاوید انور، فیصل سعید، قمر سبزواری اور سبین علی کے اکیس افسانے، مائکرو فکشن کے تحت نیلم احمد بشیر، سلمیٰ جیلانی، مہ جبیں آصف، سبین علی اور اقبال حسن آزاد کے مختصر افسانے صفدر امام قادری، ڈاکٹر اقبال واجد، احمد علی جوہر، عبیدالرحمٰن، ڈاکٹر ریاض توحیدی، اکرم پرویز، عمر فرحت، اعظم ایوبی، رضی شہاب، جاوید مغل، ڈاکٹر خورشید نسرین کے گیارہ مضامین، م۔ص۔ایمن کا ناولٹ 'دلبر داشتہ' اور اقبال حسن خاں کے ناول 'راج سنگھ لاہوریا' کا ایک باب، ابن آس محمد کی دس سولفظی کہانیاں، گوشہ پیغام آفاقی، دیگر کتابوں اور ثالث پر تبصرے اور مکتوبات وغیرہ ہیں۔

یوں تو بالاستیعاب اس شمارہ میں شامل تمام افسانے اور مضامین کا مطالعہ میں نے نہیں کیا، البتہ چند مضامین اور افسانے کے مطالعہ سے اردو کے موجودہ ادبی منظرنامہ سے آگہی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی افسانوی روایت کے عموم میں صفدر امام قادری (اردو داستان گوئی: فن روایت اور ارتقا)، ڈاکٹر ریاض توحیدی (علامتی افسانہ: تخلیقی مضمرات)، اکرم پرویز (فکشن میں تشکیلی حقائق: اسطور، التباس یا اسلوب)، رضی شہاب (افسانہ اور تصور زباں ومکاں) اور 'ثالث' پر غلام نبی کمار کے مضامین قابل التفات ہیں۔ ان عمومی مضامین کی شمولیت میں مدیرانہ صلاحیتوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ادارتی کالموں میں مدیروں کی فکر ونظر کا اندازہ ہوتا ہے اور رسالے کے آخری صفحات تک ان کی ادارتی صلاحیتیں سامنے آتی ہیں۔ 'ثالث' کے مدیر نے جہاں اداریہ میں فکری ونظری مسائل سے رشتہ استوار رکھا، وہیں پورے رسالہ میں مدیرانہ بصیرتوں کو بروئے کار لایا۔ اس لیے انھوں نہ صرف فکشن نگاروں کے انفرادی رویوں پر مضامین شامل کیے بلکہ عمومی موضوعات کو پیش نظر رکھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہی نمبرات دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں، جن میں عمومیت ہو۔ موازنہ اور تقابل کی آنچ ہو۔ عمومی اور تقابلی رنگ اسی وقت سامنے آئے گا، جب ہم نہ صرف حال کی بھول بھلیوں رہیں، بلکہ ماضی کے کھنڈرات میں بھی جھانک کر دیکھیں، اس لیے نمبرات میں اس کا خاص رکھنا ضروری ہے، جیسا کہ اس میں رکھا گیا ہے۔

کتابی سلسلہ 'ثالث' کے فکشن نمبر (شمارہ 10-9) کا یہ رویہ بھی قابل التفات ہے کہ اس میں دو افسانے مع تجزیہ شائع کیے گئے ہیں۔ فکشن کی تفہیم کے لیے اس روایت کو منظم طور پر فروغ دینا میری ناقص رائے میں انتہائی مستحسن ہے۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ افسانہ کی قرأت کے بعد تفہیم میں دقتیں پیش آتی ہیں تو کبھی افسانہ کچھ ہوتا ہے اور تجزیہ کچھ اور۔ ایسی صورت میں اگر افسانہ اور اس کا تجزیہ ایک ساتھ ہو تو ایک بیدار مغز قاری نہ صرف کوئی افسانہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، بلکہ تفہیمی تناظر میں بروقت کوئی دوسری رائے بھی قائم کرسکتا ہے۔ اس لیے افسانہ کے ساتھ ساتھ اس کے تجزیہ کو بھی شامل اشاعت کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں 'ثالث' نے جو یہ کیا، بہت اچھا کیا۔ یوں تو اس میں شامل نہ غضنفر کا افسانہ ''مسنگ مین'' نیا ہے اور نہ ہی مشتاق احمد نوری کا ''لمبی ریس کا گھوڑا''، لیکن تجزیہ کے ساتھ شائع ہونے سے ان میں جدت کا احساس پیدا ہوا۔ اسی طرح حالیہ دنوں منظر عام پر آنے

والے فکشن نمبر سے 'ثالث' کا یہ نمبر اس لیے بھی ممتاز ہے کہ اس میں ہندی افسانہ کے تراجم بھی پیش کیے گئے، جو کہ بہتر پہل ہے۔ کیوں کہ عمومی طور پر ہم نہ صرف غیر ملکی ادب سے ناآشنا ہیں، بلکہ اردو کے ساتھ پروان چڑھنے والی ہندی زبان کے ادب سے بھی بیزار ہیں، ایسے میں ان پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت ہے، جن کی طرف موجودہ عہد میں 'ثالث' نے پیش قدمی کی ہے۔ لب لباب یہ ہے کہ 'ثالث' اپنے اداریوں کے فکری نکات اور نامانوس تبصراتی رویوں سے اجتناب کی وجہ سے رسالوں کی بھیڑ میں نمایاں نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی حسنِ انتخاب، معیاری مواد اور قابل قدر رویوں کو فروغ دینے کے لیے تنظیمی طور پر آگے بڑھ رہا ہے اور سچ مچ اپنی ٹیگ لائن ''زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان'' کا علمبردار بھی ہے، تاہم ایسے مضامین ومواد سے دوری بنائے رکھنا اس قابل قدر رسالہ کے لیے مستحسن ہوگا، جو اشاعت سے قبل ہی سوشل میڈیا کے کندھوں پر سوار ہوکر پوری دنیا کا سیر کرآتے ہیں۔

☆☆☆

● رحمان حفیظ

''ثالث'' کا فکشن نمبر

مجھے بھارتی ادبی پرچے ''ثالث'' مونگیر کا حالیہ شمارہ (۹-۱۰) ابھی ابھی موصول ہوا جو ''فکشن نمبر'' ہے۔ یہ نہایت دیدہ زیب اور ضخیم پرچہ ہے جو اعلیٰ مواد سے بھرپور بھی ہے۔ مجلس ادارت میں اقبال حسن آزاد، ثالث آفاق صالح اور اعجاز رحمانی شامل ہیں۔ عملی ادارت کی بیشتر ذمہ داری شاید ہمارے دوست اور عمدہ ادیب اقبال حسن آزاد ہی ادا کررہے ہیں۔ ۴۴۸ صفحات پر مشتمل یہ اشاعت تنقیدی مضامین، افسانوں، ناولٹ، مائیکرو فکشن اور ناول کے کچھ ابواب پر مشتمل ہے تاہم شمارے میں حال ہی میں وفات پانے والے ممتاز لکھاری پیغام آفاقی پر ایک خصوصی گوشہ بھی شامل گیا ہے جس کے باعث یہ پرچہ ایک اہم ادبی دستاویز کی شکل اختیار کرگیا ہے۔ میں نے یہ بات بھی نوٹ کی کہ اس میں چھپنے والی تخلیقات کی بڑی تعداد ایسے مصنفین کی ہے جو فیس بک پر بھی ادب وعلمی سرگرمیوں میں شریک رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سوشل میڈیا پر ادیبوں کے بڑی تعداد میں موجود رہنے کے باعث اب یہی باہمی رابطے کا بہترین ذریعہ بن گیا ہے چنانچہ اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا جارہا ہے۔ ایک اور اہم بات یہ کہ سوشل میڈیا کے باعث پاکستانی اور بھارتی دانشوروں اور لکھاریوں کے درمیان رابطے ماضی کے مقابلے میں بہت بڑھ گئے چنانچہ ''ثالث'' میں چھپی ہوئی تخلیقات میں سے ایک بہت بڑی تعداد پاکستانی لکھاریوں کی ہے جو کہ ایک اچھا شگون ہے۔ فکشن نمبر ہونے کے باعث اس بار غزلیں نظمیں شائع نہیں کی گئیں۔ مضامین زیادہ تر نمایاں یا کلاسیک تخلیق کاروں کے بارے میں ہیں۔ مشہور ونادر افسانے ''بجوکا'' کے خالق سریندر پرکاش پر لکھے گئے عمر فرحت کے مضمون کے علاوہ مائکرو فکشن کی ابتدا پر خورشید نسرین کا مضمون اور رضی شہاب کا مضمون ''افسانہ اور زمان ومکاں'' خاصے کی تحریریں ہیں۔ افسانوں کے باب میں عمدہ افسانہ نگاروں کی منتخب تحریریں اور معاصر ہندی افسانوں

کے ترجمے مجھے بہت پسند آئے۔ ماضی کے کچھ انتخاب بھی اشاعت کا حصہ بنائے گئے ہیں۔اقبال حسن خان کے ناول ”راج سنگھ لاہوریا“ کا ایک باب بھی اس خاص شمارے کا خاصہ ہے۔اس کے علاوہ قارئین کی آرا کو بھی نمایاں طور پر جگہ دی گئی ہے۔پیغام آفاقی کا گوشہ بہت عمدہ ہے اور نہایت توجہ اور محنت سے ترتیب دیا گیا ہے۔

پرچے میں مائیکرو فکشن، فلیش فکشن کو بھی خصوصی اہمیت دی گئی ہے اور نئی نسل کے تخلیق کاروں کی بڑی تعداد کی نمائندگی نظر آتی ہے۔مختصر فکشن کی یہ قسم سوشل میڈیا پر تیزی سے مقبول ہو رہی ہے جس کا ادراک کرتے ہوئے ثالث نے اس کے لئے بڑی تعداد میں صفحات مختص کئے ہیں۔یوں پرچہ بہت ہی متوازن اور عصری معیار کا آئینہ دار ہے اور اسے کسی بھی دوسرے اہم پرچے سے کمتر قرار نہیں دیا جا سکتا۔اس پر مجلس ادارت مبارکباد کی مستحق ہے۔

☆☆☆

منظوم تبصرہ

شفیع الرحمن شفیع

ساطیر ، قصے ، حکایات کہنہ
تھکا ماندہ جسم و خرد کل فسردہ

کبھی الف لیلہ ، کلیلہ و دمنہ
فقط کام کا ذہن کو پڑتا دورہ

کبھی داستانِ شجاعت ، مروت
مشاغل سے فرصت میں تفریح لازم

طلسماتِ حسن اور عشق و رفاقت
مگر مختصر وقت دل کا ہے حاکم

طبابت ، عبادت ، ریاضت ، سخاوت
ضرورت تو ایجاد کی ہوتی ماں ہے

بِنا جس کی تاریخ و طرزِ حکومت
جہانوں میں فکشن بڑا خانداں ہے

ہے انسان ماہر ، کرے روز بدعت
فسانہ ہوا مختصر پھر ملخص

خدا نے عطا کی ہے صنعت کی قوت
یہاں تک کہ سو لفظ کے ساتھ مختص

حقیقت کو فرسودہ کہنے لگے جب
لگا سابقہ مائکرو کا بھی اس پر

سبھی وِرد فکشن کا پڑھنے لگے تب
دماغ و نگارش کا پہلو سراسر

فراغت کے اوقات جب ہو گئے کم
بہار آگے آگے ادب کے چمن میں

تو ناول تخیل کا بر جستہ عالم
ہے شمع فروزاں سدا انجمن میں

نئے کار و بار اب نئی زندگی ہے
زر و مال کی ہر طرف بندگی ہے

◀◀ ● ▶▶

مکتوبات

● ”ثالث“ کا فکشن نمبر پیش نظر ہے۔بلاشبہہ آپ اسے فکشن نمبر بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔فکشن کے مسائل پر پانچ مضامین،تصنیفات و مصنفین پر چھ مضامین،اکیس افسانے ،دو افسانوں کا انتخاب ،دو تراجم ،افسانہ نگار/ناول نگار پیغام آفاقی پر تقریباً چالیس صفحات پر مشتمل گوشہ اور پھر افسانے سے متعلق نئی بد عتیں (مائیکرو فکشن اور سولفظی کہانیاں).....یقیناً یہ فکشن پر ایک بھرپور شمارہ ہے جس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اردو داستان گوئی کے فن، روایت اور ارتقا پر صفدر امام قادری نے ایک بھرپور تنقیدی مقالہ اپنی تمام تر روایتی سنجیدگی ،تعمق اور صنف کے تئیں ایک مثبت نقطۂ نظر رکھتے ہوئے سپرد قلم کیا ہے۔اس مقالے میں داستانوں کے قاری، محققین اور ناقدین تینوں کے لئے دلچسپی اور توجہ کا وافر سامان موجود ہے۔صفدر نے اس مضمون کو حتی الامکان متفق علیہ بنانے کی کوشش کی ہے اس لئے اختلاف کی گنجائش بہت کم ہے۔ صرف توصیفی طور پر داستانوں کے بنیادی وصف مافوق الفطرت عناصر کے بارے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خواہ یہ بات کلیم الدین احمد کہیں یا صفدر امام قادری کہ:”داستانوں میں فوق فطرت عنصر اس عہد کی قوت تخیل اور ذوق تفریح کی ترجمانی ہے“،ادھورا سچ ہے۔جو کہا جا رہا ہے اس سے انکار نہیں ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ یہ فوق فطری عنصر اس عہد کے اجتماعی ذہنی سانچے کی نشان دہی بھی کرتا ہے جس میں فوق فطری عناصر کو سماج میں اگر ”قوت نافذہ“ کی نہیں بھی تو ”عنصر نافذہ“ کی حیثیت ضرور حاصل تھی۔مذہب خواہ سامی ہو یا آریائی فوق فطری عناصر سے الگ ہٹ کر تو چلتا ہی نہیں ہے۔ایسے میں داستانوں میں داستان گو نے اگر ان عناصر کے ذریعہ اپنی بات آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے تو گویا اس نے اپنے عہد

کی اجتماعی ذہنی رو کے ساتھ چلنے کی کوشش کی ہے۔ دوسری بات جنسی امور کی ہے ۔ یہ معاملہ بھی اگر خالص ہندوستانی پس منظر میں دیکھا جائے تو احساس ہوگا کہ ہماری اپنی وطنی اساطیر میں شیو پاربتی، رادھا کرشن اور پھر موہنجوڈارو، ہڑپا اور مختلف منادر میں جو کھلا جنسی اظہار ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جنسی طور پر کھلا پن جس طرح آج ٹیبو بن گیا ہے، کل معاملہ بالکل ایسا ہی نہیں تھا۔

''علامتی افسانہ..... تخلیقی مضمرات'' میں من جملہ باتیں صائب ہیں گو مضمون کا ہدف علامت کو صرف علم بلاغت کی ایک صنعت کے طور پر سمجھنا اور سمجھانا ہے (اور ظاہر ہے اردو ادب کے پس منظر میں اس رخ کی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں) لیکن علامت کے ضمن میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہونا چاہئے کہ فرانسیسی ادب میں علامت جس طرح تحریک بنی اور انگریزی ادب میں جس طرح اسے تخلیقی بدل کے طور پر قبول کیا گیا اس تحریک اور رجحان نے بھی جدیدیت کے عہد میں لکھنے والوں کو کافی مہمیز کیا۔ دوسری بات یہ کہ اقتباسات کے انتخاب کے وقت علامت، استعارہ، تشبیہ اور کنایہ کی مختلف حدود کو بھی پیش نظر رہنا چاہئے تھا۔ بعض اقتباسات یا ان افسانوں میں صرف رمز و کنایہ کا پہلو موضوع بحث فن پارے کی انفرادیت کا سبب ہے۔ مزید براں اس گفتگو میں انور سجاد، خالدہ حسین، رشید امجد اور نیّر مسعود کا ذکر بہر حال ضروری تھا۔

ایک اور اچھا مضمون ''فکشن میں تشکیلی حقائق، اسطور، التباس یا اسلوب'' ہے۔ زبان بہت سلجھی ہوئی ہے اور بیان بہت نپا تلا ہے۔ اکرم پرویز صحیح کہتے ہیں کہ: ''ترقی پسندوں نے متن کو خارجی مظہر کا نمائندہ قرار دیا اور قرآت کے تفاعل میں اسے بنیادی ٹول کی طرح برتا..... اُن کی نظر میں متن فنکار کے ذاتی واردات کا نشان تھا جسے سماجی تناظر میں پڑھا جا سکتا تھا۔ یقیناً یہ ترقی پسندی کے تصور متن کا صحیح تعارف ہے مگر ضرورت تھی کہ یہیں پر جدیدیت کے تصور متن کے متعلق بھی گفتگو کی جاتی، جو نہ ہو سکی۔ حالاں کہ آگے بڑھ کر اکرم پرویز یہ بتاتے ہیں اور صحیح کہتے ہیں کہ: ''(۱) فن خارجی مظہر کی معکوسی کیفیت سے عبارت نہیں بلکہ ایک نئی حقیقت کو دریافت کرنے کا وسیلہ ہے۔ (۲) فنکار متن کی تعمیر میں ایک نئی حقیقت کی تشکیل کرتا ہے جو خارجی مظاہر کی متقاضی نہیں ہوتی بلکہ متن کے مقتضیات کے مطابق روبہ عمل ہوتی ہے۔ (۳) حقیقت بذاتہ ایک تجریدی شے ہے جسے کلی طور پر گرفت

میں لینا تقریباً ناممکن ہے۔'' مذکورہ بالا تین اقتباسات میں تصور متن کے سلسلے میں جو نکات بیان کئے گئے ہیں، یہ صحیح ہیں اور دراصل جدیدت کا تصور متن یہی ہے۔ مگر نجانے کیوں اکرم پرویز اس تصور کو جدیدیت سے منسلک نہ کر کے مجموعی انداز میں یوں بیان کرتے ہیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ حالانکہ صفحہ ۶۲ پر حق بالآخر ظاہر ہو گیا اور صاحب مضمون کے قلم سے یہ جملہ سرزد ہو ہی گیا کہ: ''حقیقت پسندی کے روایتی تصور نے متن کی حتمی قرآت کی جو روایت ڈالی تھی، جدید نظریات نے اس روایت کو توڑ پھوڑ دیا'' اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس پس منظر میں ساجد رشید ترقی پسند نہیں قرار دئے جا سکتے۔

رضی شہاب کا مضمون ''افسانہ اور تصور زماں و مکاں'' بھی متوجہ کرتا ہے۔ وقت سے تعلق بہت سارے تصورات و نکات کو یکجا کر دیا گیا ہے مگر ساری گفتگو کا ماحصل یہی ہے کہ ہر شے وقت کی اسیر ہے۔ مگر یہ وقت ہے کیا؟ سیدھے سادے لفظوں میں جو حال ہے وہی وقت ہے۔ نحویوں نے اسے تین صیغوں (۱) ماضی (۲) حال (۳) مستقبل میں بانٹا اور پھر ماضی قریب، ماضی بعید، ماضی شکیہ اور ماضی تمنائی..... متعدد رخ پیدا کئے گئے مگر بات تو بس اتنی سی ہے کہ جو منجمد ہے وہ ماضی ہے اور جو متوقع حال ہے وہ مستقبل ہے۔ منجمد حال جب فوسل میں انجماد پذیر ہوتا ہے تو کھوپڑی اور پہاڑ کی صورت میں دید کے قابل رہتا ہے اور جو یادوں میں محفوظ ہو جاتا ہے وہ محسوس کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ قابل دید معروض ہے اور قابل احساس موضوع۔ رہا مستقبل تو وہ حال تمنائی ہے یا حال تخیلاتی۔ فاروقی صاحب نے جب افسانے کو وقت کا محکوم بتایا جو وقت کے چوکھٹے میں قید ہے تو ظاہر ہے کہ ان کے پیش نظر افسانے کی واقعاتی نوعیت رہی ہوگی، مزید برآں فاروقی صاحب کی جس وقت کی یہ تحریر ہے اس وقت گفتگو کا غالب حوالہ اور تفکرات کا غالب پس منظر علی گڈھ تحریک، پریم چند تحریک اور ترقی پسند ادب رہا کرتا تھا۔ ایسے میں اگر واقعاتی نوعیت کے پیش نظر افسانے کو وقت کے چوکھٹے میں قید کیا گیا تو کون سی غلط بات کہی گئی؟

اور ادب کے ذکر میں صرف ڈراما اور ناول نہیں آتا، اقبال کا جاوید نامہ اور اس قبیل کی دوسری مغربی نظمیں بھی تو ہیں جن میں بیانیہ وقت کے چوکھٹے سے باہر نکل کر اپنا اظہار کرتا ہے، اس حقیقت کو کیوں فراموش کیا جاتا ہے؟ افسانے کے وقت کے چوکھٹے میں قید ہونے کا معاملہ تو ایسا مستحکم ہے کہ قرۃ العین حیدر ''روشنی کی رفتار'' میں

''ایک ناوقوع پذیر شدہ'' واقع کو بھی وقت کے چوکھٹے میں قید کر کے دکھانے پر مجبور ہوتی ہیں، چاہے یہ اگلے زمانوں کا کوئی وقت ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس حقیقت کو بالآخر رضی شہاب تسلیم بھی کر لیتے ہیں کہ: ''انسانی تجربے کی ابتدا وقت اور جگہ کے بغیر وجود پذیر نہیں ہو سکتی۔'' یہی بات تو فاروقی صاحب بھی کہہ رہے ہیں:

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

رہی بات کمزوری اور طاقت کی تو محمد حسین آزاد اور حالی سے کلیم الدین احمد اور شمس الرحمٰن فاروقی تک، کون ناقد ہے جس کی ہر بات صحیح تسلیم کی گئی ہو۔

''ہم عصر اردو ناول: تخلیقی اشتغال'' میں تمہیدی و اصولی گفتگو اور اقتباسات تو کچھ ادب اور مابعد جدیدیت وغیرہ کے بارے میں اطلاعات فراہم کرتے ہیں مگر جلد ہی معاصر اردو ناول کا نظام ذکر پر حاوی ہو جاتا ہے اور گفتگو ناول میں تخلیقی مشغولیت سے زیادہ عصری مسائل، معروضیت اور موضوعاتی تذکرے کی اسیر ہو جاتی ہے۔ میں اس سے کچھ مختلف توقع کر رہا تھا۔

افسانے کئی پڑھے مگر تشفی نہیں ہوئی۔ آپ نے اچھا کیا، انتخاب، تراجم اور گوشۂ پیغام آفاقی کے ذریعہ نئے لکھنے والوں کے لئے کچھ اچھے نمونے پیش کر دیے۔

پروفیسر حسین الحق (گیا)

بن مانگ مل گئے میری آنکھوں کو رت جگے
میں جب سے اس چاند کا شیدائی بن گیا

- آپ کے نام میں جو ''حسن'' ہے یہ شاید اسی کا اثر ہے جو آپ نے مذکرۃ الصدر پرچہ بھجوا دیا ہے۔ اس کے لیے میں اپ کا شکر گزار ہوں۔ لیکن بدل اشتراک کے لیے رقم بھجوانے کے لیے دگنی سے بھی کہیں زیادہ رقم بھجوانی پڑتی ہے جس کا تجربہ مجھے شمارہ ۸ کے لیے رقم کی ترسیل پر ہوا تھا۔ وہ تو یہاں ایک صاحب جن کے عزیز ہندوستان میں رہتے ہیں ان کو پاکستانی روپئے دے کر ان کی معرفت وہاں سے بذریعہ منی آرڈر یا کوئی اور ذریعہ استعمال کر کے درمیانی اشخاص نے آپ تک رقم (اور ان کے کتنے اخراجات اٹھے جن کا مجھے اب احساس ہو رہا ہے۔ جبکہ میں تو اس کام کے مکمل ہونے پر ہی خوش تھا) پہنچائی تھی اور وہ بھی معلوم نہیں کہ مطلوبہ رقم صحیح تھی یا کہیں کم تر تھی۔

اب بھی اس کوشش میں رہوں گا اور پرچہ پر دی گئی ہدایات پر عمل کرنے سے یہ مشکلات درپیش نہ ہوں اگر کچھ تاخیر ہو جائے تو ناراض نہیں ہونا۔ میں اسی کوشش میں رہوں گا۔ وباللہ التوفیق۔ امید ہے اپ بخیریت ہوں گے۔

محمد عبدالمالک (جھنگ پاکستان)

- ''ثالث'' مل گیا تھا۔ میں نے فوراً موبائل پر تم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی، ناکام رہا۔ بعد میں بھی میری کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں۔ پتہ نہیں کیا بات ہے۔ تم نے اس نمبر کو یادگار بنا دیا ہے۔ اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے یہ ہمیشہ مشعل راہ ثابت ہوگا۔ تمہاری محنت اور لگن کی داد نہ دینا بڑی بے انصافی ہوگی۔ ایسا لگتا ہے جیسے تم نے اس کی اشاعت اور پیش کش کو ایک مشن بنایا ہے۔ خدا تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے۔ عبدالصمد (پٹنہ)
- تخلیق کار اپنی تخلیقات میں تو کمال دکھاتا ہی ہے اپنی دیگر سرگرمیوں میں بھی اپنے تخلیقی رنگ و آہنگ کا احساس دلا دیتا ہے۔ خواہ وہ کوئی تنظیم چلائے، خواہ کوئی جلسہ منعقد کرے، خواہ کوئی رسالہ نکالے، ہر جگہ اس کی تخلیقیت کا ثبوت مل جاتا ہے۔ ''ثالث'' اس کا زندہ ثبوت ہے۔ آپ نے افسانے تو اچھے لکھے ہی ہیں، یہ رسالہ بھی آپ نے خوبصورت نکالا ہے۔ ایک خوبصورتی اس کی یہ بھی ہے کہ جن غیر معروف اور نئے تخلیق کاروں سے کہیں اور ملاقات نہیں ہو پاتی آپ کے رسالے میں ان سے تعارف ہو جاتا ہے۔ اگر ''ثالث'' اس طرف توجہ نہیں کرتا تو ہم بہت سے اہم لکھنے والوں کی تحریروں سے محروم رہ جاتے۔ اس کے لیے آپ مبارک باد کے بھی مستحق ہیں۔ آپ ہندوستان سے باہر کے ادیبوں سے بھی ملوا دیتے ہیں یہ بھی آپ کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

تازہ شمارے میں میرے دوست مرحوم پیغام آفاقی پر گوشہ نکال کر آپ نے ایک بڑا کام کیا ہے اس کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ رسالہ ابھی پورا پڑھا نہیں ہے۔ پڑھنے کے بعد تفصیلی خط لکھوں گا۔ اسے تازہ شمارے کی رسید سمجھئے۔

مثنوی کربِ جاں پر جلد ہی ایک تبصرہ بھیجوانے والا ہوں۔ امید ہے آپ اچھے ہوں گے۔ غضنفر (نئی دہلی)

- سارا دن ابر برسا ہے۔ باریک بارش جو کچے گھروں کی درزوں میں بیٹھ جاتی ہے اور

ہاتھوں کی اوک میں رکھی دعا رو دیتی ہے کہ دیواریں اور در سلامت رہ جائیں۔ جب میں ڈاک خانہ جا رہا تھا تو میری بستی کی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر چادر اوڑھے لوگ آسماں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں برسوں سے چشمہ ڈاک خانے میں رہتا ہوں۔ روز کا جانا، رہنا ہی تو کہلاتا ہے۔ آج پوسٹ مین نے خبر دی کہ سرحد کے اس پار سے آپ کی ایک کتاب آئی ہے۔ ہم نے بھی اوک میں رکھی دعا میں دیکھا تو ''ثالث'' کا انتظار تھا۔

ظہر کی نماز و پڑا کی مسجد میں ادا کی۔ نماز میں دھیان اللہ کی طرف تھا لیکن سچ یہ ہے کہ ثالث بھی اس میں شامل تھا۔ گھر پہنچ کر لحاف میں لپٹ کے ورق گردانی کرتے ہوئے اپنے آپ سے ہم جدا ہوئے اور ثالث ہو گئے۔ مطالعہ جاری ہے۔ اداریہ اور سبین علی کا افسانہ ''سولہ کا پہاڑہ'' پڑھا ہے۔ سچ جانئے کہ مجھے بھی سولہ کا پہاڑہ بھول گیا ہے۔ بچپن میں نفیس بک ڈپو سے نانا جان جو ''پہاڑہ'' لایا کرتے تھے اور ہم جھوم جھوم کے رٹا لگاتے تھے۔ سبین بی بی سچ کہا..... بچپن میں جو مار پڑتی ہے وہ شخصیت میں ایسی دراڑیں ڈال جاتی ہے کہ انسان کی شخصیت کبھی مسخ کبھی ادھوری رہ جاتی ہے۔ عمدہ افسانہ لکھا آپ نے۔ مبارک باد۔ لکھتی رہا کیجئے کہ لکھنا ہی ہماری سانس چلتے رہنے کا عمل ہے۔ اقبال حسن آزاد صاحب آپ کے لئے درازئی عمر اور صحت سلامتی کی دعا کہ خاردار تاروں کی باڑ کے اس پار سے آپ الفاظ کے پھول اور خوشبو بھیجتے ہیں۔ کاش حکمرانوں کو بھی کبھی ادارک ہو کہ سرحدوں کے آر پار بسنے والے عام سے لوگ ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے ملاقات کی خواہش دل میں لئے ایک روز زمین اوڑھ لیتے ہیں۔ لیکن یہ حکمرانوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ محمد حامد سراج (چشمہ بیراج، پاکستان)

● جناب کس کمال کا فکشن نمبر شائع کیا ہے۔ دوستوں کے خوب صورت افسانوں نے بہت مزا دیا۔ آپ نے پیغام آفاقی صاحب کے گوشے کی شکل میں ان کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے لیکن کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ کام ان کی زندگی میں سرانجام پاتا۔ افسوس ہم یہ مردہ پرستی ترک نہیں کر سکتے - اس پرچے کو پڑھتے ہوئے دل بہت تڑپا کہ کاش اس میں ہماری بھی کوئی تحریر ہوتی بہت مبارکباد سلامت رہیں۔
ممتاز رفیق (پاکستان)

● رسالہ بہت خوب ہے۔ سب سے پہلی چیز جو متاثر کرتی ہے وہ کاغذ کا معیار، رسالے کی طباعت، املا کی غلطیوں سے مبرا کتابت، فونٹ کا سائز اور سرورق ہے۔ مشمولات دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ شوقین لوگوں کے لئے معیار اور مقدار دونوں ہی اہم ہیں۔ خوشی ہوئی کہ کافی تعداد میں معیاری کہانیاں ہیں۔ ابھی معدودے چند کہانیوں کا مطالعہ ہی کر پائی ہوں۔ شب و روز کے صرف چوبیس گھنٹے اور مشاغل پچاسوں۔ بھلا وقت کی تقسیم کیونکر ہو۔ پانچ سات افسانے پڑھے جن میں ''سولہ کا پہاڑہ''، ''ہوم لیس'' اور ''میں طاہرہ'' نے ذہن و دل کو جھنجھوڑ ڈالا۔ کہانیاں کیا ہیں، سوالنامہ ہیں جو قاری سے روبرو ہو کر جواب مانگتی ہیں۔ لیکن جواب تو قاری کے پاس بھی نہیں ہے کہ بچوں کی تربیت میں کیا چیز اہم ہے؟ کیا والدین کی جانفشانی منفی نتائج ہی پیدا کرتی ہے؟ کیا ہمارے معاشرے میں انسانوں سے زیادہ جانور کے تئیں ہمدردی قابل ستائش ہے؟ بچیوں کی معصومیت کو مجروح کرنا لذت کوشی ہے یا گوشت خوری؟؟ بہرکیف! خط طویل ہو گیا۔ ایک بار پھر کہہ دوں کہ رسالہ لاجواب ہے۔ یہ کمنٹ داخلی خوبیوں سے زیادہ خارجی خوبیوں پر محیط ہے کیونکہ باطن کا سفر ابھی ادھورا ہے۔ وصیہ عرفانہ (سمستی پور)

● ثالث کے ایک شمارے کو پڑھ کر میں اپنے تاثرات کو خط کی صورت میں پہلے بھی ارسال کر چکا ہوں مگر افسوس وہ خط فائلوں کے دفتر میں کہیں کھو گیا۔ امید ہے وہ گمشدہ تحریر کبھی نہ کبھی آپ کو ضرور مل جائے گی۔ اس خط کے بارے میں جہاں تک یاد ہے کہ ثالث کے سرورق، کاغذ وغیرہ کی تعریف میں نہ تھی بلکہ ادب میں موجود بے ایمانوں اور ایمانداروں کی ثالثی فرمانے والے ''ثالث'' کا ذکر تھا۔ بات پرانی ہو چکی ہے مگر مجھے جہاں تک یاد آ رہا ہے کہ اس خط میں صرف ''ثالث'' کے عنوان پر ہی بات ہوئی تھی۔

ثالث کا شمارہ ۱۰۔۹ کا فکشن نمبر بھی مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں بھی اپنی حقیر فقیر رائے بلا جھجک آپ کے حوالے کر دوں۔ بس اس دعا کے ساتھ کہ یہ خط ثالث کے مکتوبات میں شامل ہو جائے اور میری رائے ثالث کے لئے مفید ثابت ہو۔

اس ضخیم ثالث کو پڑھنے کے لئے میں نے زادِ راہ کے طور پر اپنے ایک طویل سفر میں ساتھ رکھا کیوں کہ مجھے بھی کچھ لکھنے کے لئے بہت کچھ پڑھنا پڑتا ہے اور مجھے کچھ

مدیران کی علمی صلاحیتوں کا اعتراف ہے کہ وہ اپنے رسالے کے اوراق کو خالی اور سادہ تو رکھ سکتے ہیں مگر اونٹ پٹانگ چیزوں سے محفوظ رکھیں گے کیوں کہ انہیں اپنے باذوق قارئین کا بہت لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ ایسے چند ہی مدیر ہیں ان چند لائق اور ایماندار مدیران میں میں آپ ذکر بھی بہت احترام کے ساتھ کرتا ہوں۔

ثالث کا اداریہ آپ کی محققانہ مشقت کا غماز ہے اور اس پر یہ وعدہ کہ فکشن نمبر ۲ بھی زیرغور ہے آپ محنت پسندی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے میں بھی دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کے عزم کو قائم رکھے۔

پتہ نہیں کیوں کسی بھی معیاری رسالے کے اداریہ کے بعد افسانوں کی جانب ہی رجوع کرتا ہوں جب کہ فکشن میرا میدان بھی نہیں ہے۔ ''ثالث'' کے اس عظیم فکشن نمبر کے وہ افسانے جو میں مکمل طور پر پڑھنے میں کامیاب ہوا، اس میں سب سے پہلا اربوں کڑوڑوں افراد کے اس جم غفیر میں ایک فنکار کا اپنے بارے میں اتنے خاص طریقے سے خود کو محسوس کرتے ہوئے جو تصویری خاکہ وجود میں آیا وہ محمد حامد سراج کا افسانہ ''موچی جوتے پالش کر رہا تھا'' لگا۔ سبین علی کا افسانہ سولہ کا پہاڑہ تمام سخت احتیاطی تدابیر کے باجود ہونے والے اس نفسیاتی کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے جس کا ہمیں وہم و گمان نہیں ہوسکتا۔ اس افسانے میں باپ کی غیر موجودگی میں بگڑنے والی نسل کا بیان ہے اور اس المیے کو تلاش کرنے کے لئے کوسوں سفر کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اپنے ناک کے نیچے ہی محسوس کرتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔

وراثت کا منتقل ہونا روز ازل سے طے ہے اور اسی وراثت کا حصہ بھوک، پیاس، بے ردائی اور لامکانی بھی ہے۔ ''نوحہ گر'' کے فیصل سعید صاحب نے بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ کچی دیواروں سے بنے گھر میں غریب جسم پر کے پیٹ والے انسانوں کی روزمرہ زندگی، درپیش مسائل کا ذکر کیا ہے۔ گمراہ کن لوگوں کے حدود کا یقین کس بھی شعبۂ حیات میں ممکن نہیں ہے اور اگر خدانخواستہ غلطی سے بھی ان گمراہ لوگوں کے ٹولیوں میں کوئی ایماندار شخص مل بھی جائے تو اسے اسے سسٹم کا حصہ نہیں ماننا چاہئے جہاں اس دور میں دولت ہی سب کچھ ہو ایسے عالم میں کسی ایک شخص کا صرف برائے نام بھی ایماندار رہنا اپنے آپ میں بڑی بات ہے اور کلی طور پر ایماندار ہونا تو اس دور

میں کرامت سے کم نہیں۔ ''ایک جنگ اور'' میں ایک ایماندار شخص کو ہونے والی ذہنی پریشانیوں کے ذکر کے ساتھ ڈاکٹر شاہد جمیل نے پرعزم رہنے کا بھی حوصلہ دیا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی اصل وجوہات پر بہت ہی نصیبی اشاروں میں سلیم سرفراز نے بات کی ہے۔ مرشد آباد کی سڑکیں ہوں یا دلی کی شاہ راہ، سب پر چلنے والی گاڑیاں ماضی کے کرب ناک مناظر سے دور بھاگتی ہوئی صاف دیکھی جاسکتی ہیں۔ افسانے کا عنوان ''دھوپ سنوارے'' جیسے افسانے میں چھپے کرب کا ساتھ نہیں دے رہا ہے میری سمجھ میں عنوان تھوڑا کنجلک ہوگیا ہے۔ لیکن افسانہ بہت عمدہ ہے۔

شاہین کاظمی کا افسانہ ''پتی ورتا'' ایک سلگتا ہوا خاموش احتجاج ہے جو اپنے پتی پرمیشور سے محبت کا بدلہ محبت سے چاہتی ہے مگر شوہر کا صرف اپنے کاروباری دنیا میں مگن ہوجانا اور اس مصروفیت کے بعد پیدا ہونے والی بیوی کی نفسیاتی کیفیات کی سچی ترجمانی ہے۔

کچھ لوگوں کو دنیا کے مالداروں کے برابر کھڑے ہونے کی حرص و ہوس کس درجہ گرا دیتی اور ترقی کی اس بلندی تک پہنچنے کے لئے عزت و آبرو کو کیسے زینے کے طور پر استعمال کرواتی ہے دولت کے لئے کچھ بھی کر گذرنے کے لئے تیار انسان کی کہانی ''لمبی ریس کا گھوڑا'' عمدہ افسانہ ہے اس افسانے کو بھی ''مسنگ مین'' کی طرح منتخب فرماتے ہوئے آپ نے بھی افسانے کا حق دیا ہے۔ ''مسنگ مین'' یقیناً ایک نسل سے دوسری نسل کے بیچ آتے نظریاتی اور اخلاقی فرق کو بھرپور اجاگر کیا ہے۔ ''مسنگ مین'' وہ افسانہ ہے جس میں قدروں کا لحاظ اور قدروں کی پامالی کا دردناک ذکر ملتا ہے اس افسانے میں بزرگوں کی رہنمائی نئی نسل کے لئے کتنی پریشان کن ہے صاف دیکھا جاسکتا ہے اور اپنے فیصلے کو منوانے کی ضد بھی۔

''والد'' کم و بیش ہر باپ کی کہانی ہے۔ اس کہانی میں جہاں ایک باپ کی جود جہد کا ذکر ملتا ہے وہیں ایک فرمابردار بیٹے نے بھی اپنے فرض کو خوب نبھایا ہے۔ کہانی نے اختتام پر بھی دم نہیں توڑا ہے بلکہ مجھے جیسے قاری کو یہ سوچنے پر بھی مجبور کیا ہے کہ کیا وہ بیٹا اپنے باپ کو اپنی بیوی کی خوشی کے لئے چھوڑ سکتا ہے جس کی نظر میں جواں سال باپ نے دن رات محنت مزدوری کر کے اسے اس لائق بنایا کہ وہ آخری دنوں میں آرام سے اپنے بیٹے کے سامنے زندگی کی آخری سانس لے۔ عموماً کہانیاں باپ کی قربانیوں کا ذکر تو کرتی ہے مگر کہانی کا دوسرا کردار یعنی بیٹا نہایت ہی منفی طور پر پیش کیا جاتا ہے مگر اس کہانی نے دونوں کرداروں کے ساتھ انصاف کیا

ہے۔ بلکہ باپ بیٹے کی کہانی میں اس خاص پہلو کو بہت ہی خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ صحیح وقت بتانے والی گھڑی کو شاعر و افسانہ نگار ڈاکٹر اقبال حسن آزاد نے بمقابلہ پانچ منٹ آگے چلنے والی گھڑیوں کے علامتی طور پر استعمال کرتے ہوئے یہ سمجھانے کی کوشس میں کامیاب ہوئے ہیں کہ سماج کے اس طبقے کو بھی زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے اپنے بہتر مستقبل کو تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جو صرف تیز رفتار دنیا کو دیکھ کر خوف زدہ ہے۔
ابن آس محمد سولفظی کہانیاں بھی بہت پسند آئیں۔ اور سب سے آخر میں حاصلِ ثالث اقبال حسن خان کا ناول راج سنگھ لاہوریا بہت پسند آ رہا ہے۔ ہر قسط کے بعد کا تجسس برقرار ہے بلکہ یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ناول کی ہر سطر ذوق مطالعہ کو مہمیز کرتی ہے۔ اس ناول کو پہلی قسط سے پڑھ رہا ہوں اور دل ہی دل میں آپ کے انتخاب کی داد بھی دیتا ہوں۔
مندرجہ بالا افسانوں کو میں نے پڑھا اور جن افسانوں کو میں نے پڑھا انہیں پر اپنی رائے بھی دی اور ایسا بھی نہیں کہ جن افسانوں کو میں پڑھ نہ سکا وہ اچھے نہیں ہیں بلکہ یہ میری وقت کی قلت ہے۔ جو میں دیگر افسانوں کو نہ پڑھ سکا۔ کیوں کہ میں ثالث سے جڑا ہی صرف اسکے ادبی معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ مجھے ڈاکٹر اقبال حسن آزاد صاحب کی مدیرانہ صلاحیتوں پر پورا بھروسہ ہے کہ انھوں نے بہت ہی ایمانداری کے ساتھ فکشن نمبر کو مرتب کیا ہے۔
میں اس فکشن نمبر کی فہرست میں شامل صفدر امام قادری، محمد شفیع الرحمٰن، شمسی قریشی، ڈاکٹر اقبال واجد، احمد علی جوہر، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر ریاض توحیدی، اکرم پرویز، عمر فرحت، اعظیم ایوبی، رضی شہاب، جاوید مغل، ڈاکٹر خورشید نسرین، حسین الحق، قمر سبزاوری، ہما فلک، جاوید انور، نعیم بیگ، فارحہ ارشد، امین صدر الدین بھایانی وغیرہ جیسے بڑے قلم کاروں کے فنکارانہ صلاحیتوں کا معترف ہوں۔ معذرت خواہ ہوں کہ مندرجہ بالا افسانوں کے علاوہ میں دیگر افسانوں سے محروم رہا۔

مصداق اعظمی (اعظم گڑھ)

- ثالث شمارہ نمبر ۸ موصول ہوا۔ بے انتہا خوشی ہوئی۔ سبھی مشمولات قابلِ ستائش ہیں۔ آپ کے کام کرنے کی لگن پر حیرت ہوئی ہے۔ خدارا ثالث کو قائم رکھے۔

شرجیل احمد خان (بھاگلپور)

- ’’’ثالث‘‘ کا فکشن نمبر مواد، ہیئت اور ترتیب و تدوین کے لحاظ سے سے فنکاری اور ہنرمندی کی مثال ہے۔ اداریہ میں فکشن کی مختلف شکلوں......داستان، ناول، مختصر افسانہ، منی افسانہ، مائیکرو فکشن وغیرہ کی توضیح مختصر لیکن دلکش اور روشن ہے۔
صفدر امام قادری نے ’’اردو داستان گوئی کا فن: روایت اور ارتقاء‘‘ میں داستان گوئی کے فن، اس کی روایت کا ذکر اور ارتقائی سفر کو بڑی خوبصورت، کامیابی اور عرق ریزی سے ضبط تحریر میں لایا ہے۔ اس تعلق سے سرشار کے حوالے سے ان کا تجزیہ دلچسپ، انوکھا اور غور طلب ہے۔
’’سرشار پرانے اور نئے عہد کی آویزش کے واقف کار تھے اس لئے، ان کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ طوالت کے باوجود داستانی روایت کو دوبارہ زندہ کرسکیں۔ فسانۂ آزاد میں اردو کی داستان آخری بار اپنی شکل دکھا کر رخصت ہوتی ہے۔‘‘
شوکت حیات: تخلیقی التہاب کا افسانہ نگار‘‘ کے ذریعے ڈاکٹر اقبال واجد نے شوکت حیات کی افسانوی کائنات کو سمجھنے کی بہترین کوشش کی ہے۔ اس مضمون میں اقبال واجد نے شوکت حیات کے کامیاب افسانوں کا عرق ریزی سے احاطہ کرتے ہوئے ان کی افسانہ نگاری کے تہہ دار پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔
افسانوی حصے میں تنوع اور فنی خوبیاں نمایاں ہیں۔ ’’انّو‘‘ صفدر امام قادری کا ایک بہترین افسانہ ہے۔ شروعات میں یہ افسانہ پت جھڑ کی آمد کی خبر دیتا ہے اور یہ پت جھڑ زندگی کا ایک ایسا نوحہ ہے جو ’’پیلا، سوکھا اور تنہا پتّا‘‘ کی مانند انّو کی زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ افسانے کا اسلوب صفدر امام قادری کی فنّی مہارت کا گواہ ہے۔ اس کی پیچیدگی اور جزیات گہری معنویت کی امین ہے اور اصل رشتوں کے حصار میں گھری انسان کی روح خود احتسابی تو کرسکتی ہے لیکن بے چینی اور بھٹکنے کا عذاب بہر حال اس کا مقدر ہے۔ یہ لازوال محبت کی ایسی کہانی ہیچو زندگی میں کسی نہ کسی روپ میں جاری اور رواں ہے۔ نسترن احسن فتیحی کا افسانہ ’’کال بیلیا‘‘ تخلیقی نہج پر بیان و اسلوب کے اعتبار سے اور فضا آفرینی کے لحاظ سے شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ ’’سفر نامہ حیرت آباد‘‘ (حسین الحق) اور ’’دی لاسٹ کس‘‘ (ھما فلک) بھی دیرپا تاثر چھوڑتے ہیں۔

عشرت ظہیر (گیا)